رئیس احمد جعفری

قیمت:- بیس روپے ۲۰/

ناشر:- چمن بکڈپو- اُردو بازار- دہلی ۱۱۰۰۰۶

مطبوعہ:- لاہوتی پرنٹ ایڈس- دہلی

سنہ طباعت:- سنہ ۱۹۷۸ء

پیرایۂ آغاز

قلم کا مسافر، اپنی منزل تک پہنچ گیا!

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید

"اقبال اپنے آئینہ میں" یہ بڑا نازک اور محنت طلب موضوع تھا؟ میں نے محنت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کے ہزاروں اشعار پڑھے، انہیں بار بار سمجھنے کی کوشش کی۔ انتخاب کیا اور پھر اس انتخاب کا انتخاب کیا

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گل چیں بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

میں نہیں کہہ سکتا، اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ تو قارئیں ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک بات ضرور عرض کروں گا۔ میں نے ایک نیا موضوع تلاش کیا اور اس موضوع پر ایک انسان جتنی محنت کر سکتا ہے، اس سے میں نے گریز نہیں کیا۔ کاش میری یہ محنت اہلِ نظر کی نگاہ میں کسی قابل ٹھہرے۔

رئیس احمد جعفری

گوہرِ یگانہ

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دَور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصوّر میں فقط بزمِ شبانہ

•

لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

•

فہرست

افتتاحیہ

اقبال کی تلاش

کلامِ اقبال سے

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمّازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن
اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک
اس کے نغموں میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

شاعری ہر زبان کی دل آویز ہوتی ہے اور شگفتہ بھی۔ دلکشی میں اپنا جواب
نہیں رکھتی۔ ہر شاعر اپنا ایک مخصوص اسلوب رکھتا ہے لیکن اردو شاعروں
کے اسالیب، اپنے تنوع، اور تجدد کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں،
شاعر ہو یا نثار، ادیب ہو یا انشاپرداز، سب کے نطق و کلام کا ایک
مخصوص مرکز ہوتا ہے۔ اسی میں وہ ترقی کرتے ہیں۔ یہیں سے وہ فروغ حاصل
کرتے ہیں اور یہی ان کے عروج و ارتقا کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

اردو شاعروں کی فہرست بہت طویل ہے شبِ فراق سے زیادہ دراز،
اور زلفِ دراز سے زیادہ طویل، شاعروں کی اس کثرت نے اردو زبان کو بہت
فائدہ پہنچایا۔ اس میں وسعت پیدا کی لچک پیدا کی، گہرائی پیدا کی، تنوع پیدا
کیا۔ اسی باعث اردو زبان کو نئے نئے محاورے ملے، نئی نئی دل آویز اور دلکش
ترکیبیں عالم وجود میں آئیں، نئے نئے خیالات پروان چڑھے، زبان کو حسن بیان
ملا، حسن بیان کو زبان ملی۔ نطق و کلام میں زور اور جوش پیدا ہوا، نئے نئے اسلوب
ابھرے، نئے نئے انداز بیان نمایاں ہوئے، سبک خوشنما اور خوبصورت الفاظ
تخلیق ہوئے، اداے مطالب کی دل آویز صورتیں دماغ کی دنیا سے صفحۂ قرطاس

پر منتقل ہوئیں، اگر اردو شاعری میں یہ تنوع نہ ہوتا اور اردو شاعروں کی یہ کثرت نہ ہوتی تو ان تمام خوبیوں اور نعمتوں سے اردو زبان محروم رہ جاتی۔

اردو زبان کے شاعروں پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو جو چیز سب سے پہلے نمایاں ہو کر نظر کے سامنے آتی ہے وہ ہے شاعروں کی یک رنگی اور یک ہمی، اور یہ بات صرف اردو زبان ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، ہر زبان کے شاعروں، اور ادیبوں میں یہی بات نظر آتی ہے، جو شخص اپنے مزاج اور طبیعت سے جس رنگ کو قریب پاتا ہے، اسے اختیار کر لیتا ہے، اس رنگ سے ہٹتا ہے، تو بہک جاتا ہے، لڑکھڑاتا ہے، ٹھوکر کھاتا ہے، اور گر پڑتا ہے، اس کا سماں اس وقت بندھتا ہے، جب وہ اپنے رنگ میں نکھرتا، اور اپنے طور پر میٹھے اور سریلے بول بولتا ہے، جہاں اپنے مرزد طور سے ہٹا، طلسم ٹوٹا، بات بگڑی، رنگ اڑا۔

میر کی انفرادیت

میر کو اہلِ نظر "خدائے سخن" کہتے ہیں، بات بھی یہی ہے، وہ درد، وہ سوز و گداز، وہ لذتِ حرماں، وہ نوائے جگر خراش، وہ سرودِ غم، وہ اشکِ مسلسل، وہ غمِ بے کراں، وہ یاس و تڑپ، جو میر کے اشعار میں ملتی ہے، کہیں اور کہاں مل سکتی ہے؟ — ہر کہ سوز دل خیزد بر دل ریزد، یہ بات جتنی میر کے شعر پر صادق آتی ہے، مشکل سے کسی اور پر صادق آ سکتی ہے، جو کیفیاتِ عشق کی یوں تصویر کھینچ سکتا ہے ؎

جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

جو سیدھے سادے سبک الفاظ اور روزمرہ کے محاورے میں'
ایک شعر کے اندر پورا دفترِ عشق یوں بیان کرسکتا ہے ۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

یا جو حسن و عشق کی آویزش کا مرقع' اس سادگی اور معصومیت کے
ساتھ کھینچ سکتا ہے'

یاں ہوئے خاک سے برابر ہم
واں وہی نازِ خودنمائی ہے

یا وہ عشق کا ماتم دل میں پیوست ہو جانے والے ان الفاظ میں کرسکتا
ہے کہ ا۔

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے' نے موت پائی ہے

یا جو زبانِ شعر سے یوں باتیں کرسکتا ہے :۔

دلِ پرخوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے
جی ڈہا جائے ہے سحر سے آج!
رات گذرے گی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

اور جو خود اپنے بارے میں کہتا ہے اور بالکل بجا کہتا ہے:
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
ماننا پڑے گا، وہ اقلیمِ حرماں اور کشورِ یاس کا تاجدار ہے۔

میرؔ کی شاعری کے داخلی اور خارجی پہلو

میرؔ کی زندگی، رنج والم کے بہت سے داخلی اور خارجی پہلو رکھتی ہے۔
میرؔ ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ دس برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، سوتیلے بڑے بھائی نے نہ صرف یہ کہ گھر میں ٹکنے نہ دیا، بلکہ اپنے ماموں اور میرؔ کے سوتیلے ماموں سراج الدین خان آرزو کا گھر بھی بے چارے کے لئے جہنم بنا دیا۔ آخر وہاں سے بھی نکلے، اور کم عمری ہی سے تلاشِ معاش

میں سرگرداں ہو گئے، ابھی بارہ برس کے تھے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ درانی ایک قیامت بن کر دلی پر لوٹتا، اور دلی کے خرمنِ امن و عافیت پر بجلی کی طرح گرا، دلی کا قتلِ عام میر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، یہ جوئے خون ان کے سر سے گذری۔ اس قلزمِ خون میں انھوں نے شناوری کی۔

نادر شاہ کے حملہ سے خاندانِ مغلیہ کا زوال شروع ہوتا ہے، ادبار و زوال، انحطاط و سقوط، تباہی و بربادی، ہلاکت و خوں ریزی، انتشار، اور طوائف الملوکی کے جو لرزہ خیز، بھیانک اور خوفناک مناظر میر نے دیکھ لئے۔ وہ اتنی مختصر مدت میں چشمِ فلک نے بھی کم دیکھے ہوں گے۔ میر نے عماد الملک، اور صفدر جنگ کی آویزشیں دیکھیں، نجیب الدولہ اور نجف خاں کا اُتار چڑھاؤ دیکھا، ان لوگوں کے ہاتھوں شاہانِ مغلیہ کو کٹھ پتلی کی طرح ناچتے دیکھا، نہ صرف ناچتے دیکھا، بلکہ ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے، اور انھیں اندھا ہوتے دیکھا، خاندانِ شاہی کے افراد کو فاقہ مست، اور آشفتہ روزگار دیکھا اور بے اختیار پکار اُٹھے:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

پھر فرماتے ہیں:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

ابدالی کے بار بار حملوں نے دلی کو جس طرح لوٹ لیا تھا مرہٹوں

کی مسلسل ترک و تاز' اور تاخت و تاراج نے جس طرح دلّی والوں کو زندگی
سے مایوس اور خودکشی پر آمادہ کردیا تھا باہمی آویزشوں اور خانہ جنگیوں نے
جس طرح دلّی کو خراب اور کھنڈر بنادیا تھا' یہ سب کچھ میرؔ نے اپنی آنکھوں
سے دیکھا تھا، ایک وہ زمانہ تھا کہ دلّی کی تعریف میرؔ نے ان الفاظ میں کی تھی:

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی ، تصویر نظر آئی

پھر جب یہ اوراق مصوّر بکھرے۔ فضائے آسمانی میں ان کی دھجیاں
اڑیں اور پاؤں تلے یہ روندے گئے، تو میرؔ پکار اٹھے:

دلّی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلّے، سنسان گھر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں، بادِ خزاں کے ہاتھوں
اکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
بلبل کا باغباں سے اب کیا نشان پوچھوں
بیرونِ در چمن کے' اک مشت پر پڑے ہیں

مشاہداتِ میرؔ

میرؔ نے' اپنی آنکھوں سے بکسر کی لڑائی دیکھی، (۱۷۶۴ء) اس لڑائی
نے انگریزوں کے حق میں فیصلہ کردیا۔ شجاع الدولہ کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ بنگال
اور بہار پر انگریزوں کی حکومت، اور اس پر تسلط' اور بادشاہ دلّی پر اقتدار قائم ہوگیا۔

پھر میر نے غلام قادر روہیلہ کے وہ ننگِ انسانیت، اور شرمناک، اور حد درجہ گھناؤنے مظالم بھی دیکھے جو اس نے (۱۷۸۸ء) خاندانِ شاہی، اور شاہ عالم دعالمیان شاہ عالم پر روا رکھے۔ ان مظالم کی تفصیل لکھتے ہوئے قلم کا جگر شق ہوتا ہے، میر نے یہ سب کچھ دیکھا، آہ کی اور کلیجہ مسوس کر رہ گئے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سَو مرتبہ لوٹا گیا!

پھر میر نے یہ بھی دیکھا کہ روہیلہ کے بعد مرہٹے، دلی پر قابض ہو گئے۔ بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا، اور وہ سارے ملک پر حکومت کرنے لگے۔ لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ، قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، ہندو تک ان کے ہدفِ ستم بننے سے نہ بچ سکے، ان کی عورتیں بھی بے آبرو کی گئیں، اور ان کا مال بھی لوٹا گیا، مسلمانوں کی طرح، ان کی عورتیں بھی، کوئیں میں پھاندنے، اور ان کے مرد بھی خودکشی کرنے پر مجبور ہو ہو گئے، میر نے یہ نظارہ دیکھا اور کہا:

اے بتو اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گویا جنسِ ناروا ہیں ہم

پھر فرمایا:

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں

یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کے

اب خرابہ ہوا جہان آباد!
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

یہ سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد، اپنے دلِ حزیں کو تسلی دیتے ہیں:

تو ہے بیچارہ گدا میر ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحبِ افسر کتنے

آخر اس جھوٹی تسلی سے بھی کام نہیں چلتا بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں:

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

اور اس صورتِ حال کا علاج تجویز کرتے ہوئے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہیں:

موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف
یاقوت سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں
تا کے یہ دشت گردی کب تک یہ خستگی
اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل بھی ہر کہیں

سنگِ حوادث نے میرؔ کے قلبِ نازک کو چور چور کر دیا تھا، ان کی بات آہ بن گئی تھی، ان کے الفاظ خود بخود نالے کی صورت اختیار کر لیتے تھے اور ویسے بھی دل چوٹ کھایا ہوا تھا عشقِ ناکام نے، حوصلوں، اور امیدوں، آرزوؤں اور تمناؤں کو ختم کر دیا تھا، عاشق ہوئے ہیں لیکن عشق وہ تھا جو کامران نہ تھا، حرماں نصیب تھا، دل اور زیادہ پس گیا، طبیعت اور زیادہ بجھ گئی، آنسو کے موتی آنکھ کی سیپی سے نکلنے کے لئے بے چین ہونے لگے، اپنی رودادِ محبت کی طرف خود اشارہ کرتے ہیں:

کبھو کف بہ لب مست رہنے لگا
کبھو سنگ در دست رہنے لگا
وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا
تصوّر مری جان کے ساتھ تھا
اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ
وہی ایک صورت ہزاروں جگہ!
گُلِ تازہ شرمندہ رو اس سے ہو
خجل مشکِ ناب اس کے گیسو سے ہو
سراپا میں جس جا نظر کیجئے
وہیں عمر اپنی بسر کیجئے
کہیں نقشِ دیوار دیکھا اسے
کہیں گرم رفتار دیکھا اسے

کبھو صورت دلکش اپنی دکھاتے
کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپاتے
کبھو گرم کینہ، کبھو مہرباں
کبھو دوست نکلے، کبھو خصمِ جاں

اور آخر کار

نہ دیکھا کبھو میرؔ پھر وہ جمال
وہ محبت تھی گویا کہ خواب و خیال

یہی وجہ تھی کہ میرؔ کچھ سے کچھ ہو گئے، یعنی آدمی سے عاشق بن گئے

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ کھڑا تھا
نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

پوچھا جو میں نے دردِ محبت سے میرؔ کو
رکھ ہاتھ اُن نے دل پہ ٹک اک اپنے رو دیا

میرؔ اور "عشق"

میرؔ کے والد صوفی باصفا، اور درویش بوریہ نشین تھے۔ صوفی کی خانقاہ، اور زاویہ میں جس چیز کی حکومت ہے وہ "عشق" ہے۔ "عشق مجازی" سے "عشقِ حقیقی" تک پہنچنا، اس دبستان کا سب سے پہلا سبق ہے۔ میرؔ ایک صوفی کے گھر میں پیدا ہوئے، ایک درویش کی گود میں پروان

چڑھے، اپنی معصوم آنکھوں سے، عشق کی کافر جوانی کے بہت سے واقعات وحادثات انھوں نے دیکھ ڈالے۔ بچپن کا نقش بڑا گہرا ہوتا ہے۔ یہ نقش کچھ اس طرح دل کی انگشتری پر نگینہ بن کر بیٹھا کہ جیتے جی، اور مرتے مرتے اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میرؔ کے اشعار میں، عشق کی عظمت اور بزرگی، اجلال واحترام، اور رکھ رکھاؤ کے بہت سے نمونے ملتے ہیں:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق، عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
کون مقصد کو، عشق بن پہنچا
آرزو عشق، مدعا ہے عشق

ظاہر باطن، اوّل آخر، پائیں بالا عشق ہے سب
نور وظلمت معنی وصورت سب کچھ آپ ہوا ہے عشق

درد ہی خود ہے، خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق
یہ نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے
سچے ہیں شاعراں، خدا ہے عشق

ان مشاہدات اور کیفیات، یعنی داخلی اور خارجی محرکات نے، جہاں میر کو ذاتی طور پر، رنج و حرماں، اور غم و یاس کا پیکر بنا دیا تھا، وہاں ان کے اشعار میں بھی سوز و درد، کسک اور تڑپ کی کیفیت پیدا کر دی تھی، اور ان سب چیزوں نے مل کر میر کو خدائے سخن، اور ان کے کلام کو مجموعۂ سوز و گداز بنا دیا تھا، اس میں ایسا انکسار، اور ایسی سچائی پیدا کر دی تھی کہ میر خود کہتے ہیں:

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

میر اور دیگر اصنافِ سخن

لیکن یہی میر، جب اپنی حد سے آگے قدم بڑھاتے ہیں، اور دوسرے اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے، اپنی عظمت اور منزلت پر خود خاک ڈال رہے ہیں، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے، میر کی خوش نوائی پر انشاؔ کا پھکڑ پن اور سوداؔ کی منہ زوری، اور جراتؔ کی طرحداری غالب آگئی ہے۔

بھلا آپ یاد کر سکتے ہیں۔ ملک الشعرا، اور خدائے سخن کا یہ بھی شعر ہو سکتا ہے؟

میر کیا خوب ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

یا پھر یہ شعر میر کا ہو سکتا ہے؟

کیا پہناوا خوش آتا ہے ان لڑکے چسپاں پوشوں کا
مونڈھے چسپے ہیں، چولی پھنسی ہے، ٹیڑھی ٹیڑھی کلائیں ہیں

لیکن یہ انہی کے شعر ہیں، مگر ان کے رنگ سے بالکل مختلف، متضاد، متنافر!

غالب کا رنگِ سخن

غالب کی عظمت کے خود اقبال ثنا گستر ہیں، اس کی عظمت پر ایک مستقل نظم کہہ چکے ہیں، خود اقبال کی تعریف شروع شروع میں اس طرح کی جاتی تھی کہ اردو زبان میں ایک دوسرا غالب پیدا ہو گیا، اور وہ اس انتساب سے بجا طور پر فخر محسوس کرتے تھے، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہندوستان کی دو کتابوں کو "الہامی" مانتے تھے، ایک وید مقدس، دوسری مجموعۂ کلام غالب، اور بلاشبہ غالب اس طرح کے خراجِ تحسین کے سزاوار بھی تھے۔ ان کی رفعتِ شان، علوالمرتبت، اور سادگی و پرکاری، انہی سے شروع ہوئی اور انہی پر ختم ہو گئی، وہ بیک وقت شاعر بھی تھے، اور فلسفی بھی اور سپاہی زادے بھی، اپنی اور اپنی سپہگری پر انہیں ناز تھا، اپنی فلسفیانہ منزلت کے وہ خود معترف تھے۔ اپنی شاعری کے آگے وہ مانے ہوئے اساتذہ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو" میں غالب کے فضائل و مناقب، خصائص اور کمالات، بیان کرنے کے بعد یورپ کے چند شعرا سے ان کا مقابلہ کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

غالب اور مغربی شعراٗ

"براؤننگ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ روح کا تجزیہ
کرتا ہے۔ مرزا غالب، تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا رموز روحانی
کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ ان کا کلام مثل مولانا روم وغیرہ
کے سراپا اسرار و تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہٖ الیٰ آخرہ کوئی
فلسفہ ہے، مگر حقائق و رموز کا ان کے کلام میں جا بجا پر تو موجود
ہے، ان کو صوفی براؤننگ کہنا بجا ہے۔ ہر چند کے براؤننگ
کے کھرے پن اور اکھڑ پن سے ان کا کلام پاک ہے۔

حزن و یاس میں ان کا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے
خوب ہو سکتا ہے مگر بالحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر ان کا مدِ مقابل
یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف شاعر گوئٹے ہے،
غالب میں تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے، یعنی فلسفی کی عقل و
ادراک، صوفی کی نگاہِ دور بیں چابک دست مصور کا نازک ہاتھ
ان کی صنعت بے کاری، اور بے کاری صنعت ہے۔ جس حق ہے،
اور حق حسن ہے، وہ ایک صوفی، صاف دل تھے، اور ان کا یہ قول
بالکل صحیح ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ان کا تصوف، کوئی شغل دلچسپی نہیں اور نہ ان کی شاعری محض
خیالی شاعری ہے، بلکہ وہ واقعات وواردات سے لبریز ہے، اور
اس وجہ سے اس کا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جا سکتا ہے!

میر اور غالب کی مماثلت

سکسینہ صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے علاوہ بھی مرزا غالب کچھ خصوصیات رکھتے تھے، بلکہ ان میں اور میر میں ایک طرح کی مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ میر کی طرح غالب بھی تصوف کی لذت سے آشنا تھے۔ غم و حرماں سے لگاؤ رکھتے تھے، میر نے بہت سی عالم آشوبیاں اپنی طویل عمر میں دیکھیں، غالب بھی اس سے محروم نہ رہے، انھوں نے اپنی آنکھوں سے دلی کا شہر آشوب دیکھا، ۱۸۵۷ء کا غدر ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا، اور ایک پل کے لئے اس ساری مدت میں وہ دلی سے باہر نہیں نکلے۔ تلنگوں کی سفاکیاں اور انگریزوں کی درندگیاں، انھوں نے بچشم خود ملاحظہ کی تھیں، عورتوں کی بے آبروئی، بچوں کا وحشیانہ قتل، بے گناہوں کی پھانسی کے جگر خراش مناظر ان کی نظروں کے سامنے گذرے تھے۔ جس بادشاہ کو وہ ظل اللہ کہتے تھے، وہ ان کے سامنے گرفتار ہوا، "عدالت" سے سزایاب ہوا اور رنگون جلا وطن کر دیا گیا، بہت سے دوست، جن سے جسم و جان کی طرح ربط و تعلق تھا، جلا وطن ہوئے، پھانسی چڑھے، یا ایسے روپوش ہوئے کہ پھر ان کا پتہ نہ ملا۔ وہ تہذیب و تمدن، وہ معاشرت، جس میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی، پروان چڑھے تھے، ان کے دیکھتے

دیکھتے دیکھتے مٹ گئی، تباہ ہو گئی۔ میر اور غالب کے زمانے کی تباہیوں میں فرق یہ ہے کہ میر کے زمانے میں ایک بادشاہ گیا، دوسرا آیا، یہ قتل ہوا، وہ سریرآرائے مملکت ہوا، اس کی آنکھیں نکال لی گئیں، وہ دھوکے سے قتل کر دیا گیا، لیکن تہذیب وہی رہی، معاشرت وہی رہی، اقدارِ حیات میں کوئی فرق نہیں آیا، غالب کے زمانے میں یہ ہوا کہ ایک بساط الٹ گئی، دوسری بچھ گئی، اب تک انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا، ہوتا تھا، وہ سب نسیاً منسیاً ہو گیا۔ حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا، نقشِ باطل کی طرح کھرچ دیا گیا۔ حکومت ہی نہیں بدلی، حکمران بھی بدل گئے، اقدارِ حیات بھی بدل گئے، تہذیب، معاشرت بھی بدل گئی۔ احوال و کیفیات بھی بدل گئے۔ حق تھا کہ غالب کے کلام میں ان حوادث کی جھلکیاں ملتیں، لیکن ان کے خطوط و رقعات میں، ان کی لکھی ہوئی تاریخ غدر "دستنبو" میں تو کافی واقعات و اشارات مل جاتے ہیں، لیکن ان کے کلام میں ان عالم آشوب واقعات کی جھلک، رمزیت، اور اشاریت کی صورت میں بھی بہت کم ملتی ہے۔ ہاں، جو ان کا خاص موضوع ہے، فلسفہ اور اسرارِ حیات، وہ ہر جگہ بکھرا پڑا ہے۔ الم دوستی، اور اذیت پرستی کی مثالیں بھی ملتی ہیں، اور خوب ملتی ہیں، کہتے ہیں:

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا

دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالب کچھ اپنے بخت سے کہنا نہیں ہمیں
خرمن جلے اگر نہ غم ہائے کشت کو

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اپنی محبوبہ کا مرثیہ کہتے ہیں:

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

اپنے بھتیجے کا مرثیہ کہتے ہیں:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

غالب کے کلام میں ابتذال کی مثالیں

غرض کلامِ غالب کے داخلی اور خارجی مؤثرات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گو ان کی زندگی اضطراب و اضطرار کے عالم میں گزری، نہ دل کی حسرتیں پوری ہوئیں، نہ سکون و عافیت کی دولت ہاتھ آئی۔ بڑے بڑے دلدوز، اور جگر خراش حادثات دیکھے، بیتے، محسوس کئے، لیکن جو رنگ اپنا قائم کر چکے تھے اس سے سرِ مو نہ ہٹے۔ اور اگر کبھی ہٹے بھی، تو پہچان لئے گئے کہ بہک رہے ہیں، غلط جا رہے ہیں، مثلاً فرماتے ہیں:

نہ بھول دَ صِبّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یا فرماتے ہیں:

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

یا ارشاد ہوتا ہے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

بے شک یہ اشعار غالب کے ہیں، لیکن غالب کا رنگ کہاں؟ رنگ سے ہٹے اور بے رنگ ہوئے۔

حسرت موہانی کا رنگِ سخن

حسرت موہانی، سید الاحرار، اور رئیس المتغزلین تھے، ان کی ساری زندگی برطانوی سامراج کے خلاف لڑتے گزری، زندگی کا بڑا حصّہ قید و بند میں گذرا، کلام کا بہت بڑا حصّہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں لکھا گیا، اور مرتب ہوا۔

ہے مشق سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

لیکن اس طرح کے ہلکے پھلکے اشارے، جو خارجی عناصر پر دلالت کرتے ہوں، کلام حسرت میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان کا اصل رنگ تغزل ہے ـــــ معاملہ بندی، محاکات، حکایتِ غمِ دل۔

حالانکہ حسرت کا زمانہ میر اور غالب سے زیادہ پرآشوب تھا!

میر کے زمانے میں، تاخت و تاراج کا سلسلہ اندرونِ ہند میں جاری تھا۔ کبھی کبھی کوئی غیر ملکی حکمران، دولت سمیٹنے کے خیال سے کچھ عرصہ کے لئے آجاتا تھا، پھر واپس چلا جاتا تھا، غالب کے زمانے میں جو تباہیاں آئیں، ان کا تعلق

بھی زیادہ تر صرف دلی اور چند دوسرے غدر سے متاثر شہروں تک محدود رہا،
ان کی کوئی آفاقی حیثیت نہیں تھی، لیکن حسرت موہانی کے دور میں، عالم اسلام
کے حصے بخرے ہو رہے تھے، طرابلس پر اطالیہ قابض تھا۔ شام و لبنان فرانس
کے تصرف میں تھے۔ عراق مصر اور متعدد دوسرے مقامات، برطانیہ کے قبضے میں
آ چکے تھے۔ عزلِ خلافت ہو چکا تھا، اور خلیفۃ المسلمین ایک غیر مسلم ملک میں
پناہ گزیں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے، ترکوں اور یونانیوں کی آویزش،
اور اتحادی حکومتوں کی شہ نے سمرنا کو لاشوں کا شہر بنا دیا تھا۔ غرض ساری دنیا کے
اسلام میں ایک عجیب طرح کی افراتفری، اور تباہی و بربادی کی صورت نظر
آ رہی تھی، خود ہندوستان میں گولیاں چل رہی تھیں، مارشل لا نافذ ہو رہا تھا،
آزادی کی تحریک زور و قوت اور تشدد سے کام لے کر دبائی جا رہی تھی۔ حسرت
نہ صرف یہ کہ ان واقعات سے ناواقف نہیں تھے، بلکہ ایک سرفروش مجاہد کی
طرح ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر، پامردی اور دلیری کے ساتھ میدانِ جنگ
میں ڈٹے ہوئے تھے، انھوں نے برطانوی سنگینوں کا مقابلہ کیا۔ بندوق کے
سامنے سینہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔ تلواروں کی چمک ان کی نظروں کو خیرہ نہ
کر سکی، جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری، اور وہاں کے ننگِ انسانیت مظالم،
ان کے عزم و ثبات میں لغزش پیدا نہ کر سکے۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن ان کی شاعری
— جو اردو ادب کی گراں مایہ متاع، اور نہایت قیمتی پونجی ہے — ان اثرات و
نقوش سے خالی رہی۔ کہیں کہیں اگر کچھ اشارے ملتے بھی ہیں تو غیر موثر!
حسرت کا اصل رنگ تغزل ہے۔ واقعی وہ رئیس المتغزلین ہیں، جو شخص

یہ کہہ سکتا ہو:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا، تمنّا بے قرار آئی

نہ بھولے گا وہ وقتِ رخصت کسی کا
مجھے مڑ کے وہ اک نظر دیکھ لینا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا، قطروں کو دریا کر دیا

رعنائی و زیبائی و محبوبی و خوبی
کیا بات ہے جو اس قدرِ دل جو میں نہیں ہے

تم جفا کار تھے کرم نہ کیا
میں وفا دار تھا خفا نہ ہوا!

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار
ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

دل میں کیا کیا تھے عرضِ حال کے شوق
اس نے پوچھا تو کچھ بتا نہ سکے

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

قصۂ درد کہوں ، شوق کا افسانہ کہوں
دل ہو قابو میں تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں

مجھ سے بھی خفا ہو، مری آہوں سے بھی برہم
تم بھی ہو عجب چیز کہ لڑتے ہو ہوا سے

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن

خوبیٔ یار کا جواب کہاں؟

حسرت کا بے رنگ رنگ

لیکن یہی حسرت جب یہ کہتے ہیں:

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب
اس غم سے ہم کو نیند نہ آئی تمام شب
بیباک ملتے ہی جو ہوئے ہم تو شرم سے
آنکھ اس پری نے پھر نہ ملائی تمام شب

یا فرماتے ہیں:

اندھیرے میں وہ آ لپٹے تھے پہلے کس کے دھوکے میں
کہ آخر جب مجھے دیکھا، تو شرما کر کہا تم ہو

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

یقین آتا ہے کہ واقعی یہ حسرت بول رہے ہیں!
غرض شعراء کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا،

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہر شاعر کا جُداگانہ رنگ جُداگانہ صنفِ سخن

ناسخ کا رنگ اور ہے، آتش کا دوسرا، غالب کا اندازِ غزل سرائی کچھ اور ہے، مومن کا اسلوبِ سخن کچھ اور، داغ کچھ ہیں، امیر کچھ، جو ریاض ہیں وہ جلال نہیں، جو جلال ہیں وہ ریاض نہیں، اصغر، جگر اور حسرت کی شاعری پر لوگ سر دُھنتے ہیں، لیکن اصغر کا رنگ جگر سے، جگر کا اصغر سے اور حسرت کا ان دونوں سے مختلف ہے۔ ان سب کی شاعری کی بنیاد اسی مخصوص "رنگ" اور "طرز" پر ہے، جو یہ اپنے لئے مخصوص کر چکے، انیس نے اردو زبان کو ایک بالکل نئی چیز دی — مرثیہ — انیس سے پہلے یہ بات ضرب المثل بن گئی تھی کہ "بگڑا شاعر، مرثیہ گو" یعنی جو شاعر کسی صنفِ سخن میں کمال نہیں حاصل کر سکتا وہ مرثیہ گو بن جاتا ہے، لیکن انیس نے اس زمین کو آسمان کر دیا، مگر وہی انیس دوسرے اصنافِ سخن میں وہ بات حاصل نہ کر سکے۔ ذوق نے جتنے شاندار قصیدے کہہ ڈالے، غالب ان کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے، لیکن غالب نے زمینِ سخن پر جو بوٹے گل کھلائے، وہ ذوق کی رسائی سے دور ہیں؟ جو شکوہ الفاظ مومن کے ہاں موجود ہے، وہ غالب کے ہاں نہیں، جو سوز اور تڑپ درد کے کلام میں ہے، وہ سودا کے ہاں کہاں؟ سودا نے جیسے قصیدے کہہ ڈالے، جیسی ہجویں کہہ لیں جیسے محاورے پیدا کئے، اور ترکیبیں ایجاد کیں وہ بات ان کے کسی دوسرے معاصر کو نہ حاصل ہو سکی۔ نظیر اکبر آبادی اردو زبان میں "نیچرل" شاعری کے بانی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا جواب

آج تک نہ ہو سکا۔ لیکن یہی نظیرؔ، اگر میرؔ اور مرزاؔ کا رنگ اڑانے کی کوشش کرتے۔ تو کون ان کی سنتا؟ شبلیؔ نے جیسی ولولہ انگیز، پرجوش اور وجد آفرین، قومی نظمیں کہیں، حالیؔ کو اگر ان سے بھڑا دیا جائے تو پچھڑ جائیں گے۔ لیکن حالیؔ نے صرف مسدس، مدّوجزرِ اسلام میں جو جذبہ بھر دیا ہے، وہ شبلیؔ کی تمام نظموں پر بھاری ہے، وہ بجائے خود ایک بہت بڑا، قیمتی، اور گراں مرتبت سرمایہ ہے۔

شاعر کی انفرادیت

غرض ہر شاعر اپنی انفرادیت پر زندہ ہے، ایک مخصوص رنگ کا تابع ہے، ایک خاص اسلوب ہے جس پر اس کی عظمت وجلال کا ایوان قائم ہے، اس رنگ اور اسلوب سے بغاوت کر کے وہ اپنا وقار قائم نہیں رکھ سکتا۔

اقبالؔ کی خصوصیت

لیکن اقبالؔ ہر جہتی شاعر ہے۔ وہ غزل گو بھی ہے اور قصیدہ خواں بھی، مناظرِ قدرت، اور مظاہرِ فطرت کا پرستار بھی، اور کشورِ دل کی تباہی اور بربادی کا سوگوار اور ماتم دار بھی، وہ نعت بھی کہتا ہے، اور منقبت بھی، اور حمد بھی، وہ زندگی کے مسائل سے بھی بحث کرتا ہے، اور فلسفہ کی گتھیاں بھی سلجھاتا ہے، وہ شاعر بھی ہے اور فلسفی بھی، وہ زمین پر رہتا ہے، اور

پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتا ہے

آسمان کی خبریں لاتا ہے، وہ طنز و تعریض بھی کرتا ہے، اور مزاح و ظرافت سے بھی کام لیتا ہے، وہ نئی نئی ترکیبیں بھی وضع کرتا ہے تشبیہ اور استعارے سے بھی کام لیتا ہے۔ نئے نئے الفاظ بھی تراشتا ہے۔ وہ سیاست کی باتیں بھی کرتا ہے، شخصیتوں کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ تاریخ کا سمندر بھی کھنگالتا ہے، روایاتِ سلف کا تذکرہ بھی کرتا ہے، عقیدۂ قومیت اور وطنیت کی دھجیاں بھی فضائے آسمانی میں اڑاتا ہے اور ان تمام مختلف اور متنوع حیثیتوں میں وہ فرد نظر آتا ہے۔ اس کی انفرادیت کہیں مجروح نہیں ہوتی۔ اس کا آب و رنگ کبھی نہیں اُڑتا۔ اس کا دبدبہ اور طنطنہ ہر جگہ قائم رہتا ہے۔ اس کے شکوہِ معنیٰ، اور طلسم الفاظ سے کون ہے جو متاثر نہ ہو؟

اقبالؔ کو جس رنگ میں دیکھیے وہ یکتا اور بے ہمتا نظر آئے گا۔ اس کی غزل سرائی میں آمد ہے، آورد نہیں، وہ روتا ہے تو دوسروں کو ہنسی نہیں آتی، رونا آجاتا ہے، وہ سینہ کوبی کرتا ہے، تو دوسرے بھی اپنے جیب و دامن کو پھاڑنے لگتے ہیں، وہ قدرت کے مناظر، اور فطرت کے مظاہر کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ دل کا ماتمدار بھی ہے، اور اس کا نقیب بھی۔ ہر خطرہ ہر مصیبت، اور ہر آفت میں وہ اپنے دل کو رہنمائی کے لئے آگے بڑھاتا ہے۔ اس کا دل وہ آفت کا پرکالہ ہے، جو خطرات سے کھیلتا، طوفانوں سے معانقہ کرتا، اور آفتوں کا خیرِ مقدم کرتا ہے، وہ جب دوسروں کو طوفانوں سے ڈرتے

اور خطروں سے جھجکتے دیکھتا ہے تو طنز کا تیر چلاتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

ترا بحر پر سکوں ہے، یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابیٔ کنارہ

وہ پر سکون سمندر سے نفرت کرتا ہے، اسے وہ سمندر چاہیے جس میں طوفان مچل رہا ہو، جس کی موجیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں، جہاں نہنگانِ اجل بڑھ بڑھ کر شکار کرنے کے لئے حملہ آور ہوتے ہوں، جس کا ساحل، ساحلِ اُمید نہ ہو، بلکہ ایسا شکستہ ساحل ہو، جس پر اترنا، جہاں پناہ پانا آسان نہ ہو، اس کی نظر میں زندگی اس وقت تک زندگی ہے، جب تک وہ خطرات سے دوچار ہو رہی ہو، طوفانوں سے نبرد آزما ہو رہی ہو، ہلاکتوں سے ٹکرا رہی ہو، اگر یہ نہیں تو پھر زندگی، زندگی نہیں، موت ہے، بلکہ موت سے بھی بدتر۔

اس کا ترانۂ حمد، اور زمزمۂ نعت و منقبت، بے کیف الفاظ کا مجموعہ نہیں، وہ ایسا ترانہ اور ایسا زمزمہ ہے، جس سے روح وجد میں آجاتی ہے، خیالات و افکار کی دنیا تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ سوچے سمجھے نظریات، عقیدۂ باطل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس ترانہ کی دُھن اور اس زمزمہ کی لَے کچھ ایسی ہے کہ جو سنتا ہے جھومنے لگتا ہے۔ سر دُھننے لگتا ہے، ہوش میں نہیں رہتا، مدہوش ہو جاتا ہے، اس کے ترانہ اور زمزمہ کی ترکیب و ترتیب صرف الفاظ کی رہینِ منت نہیں ہے، صرف خوشنما ترکیبوں اور خوبصورت جملوں کی تخلیق نہیں ہے، اس میں کچھ اور بھی ہے، کوئی ایسی چیز، جو تیر کی طرح دل میں جا کر

ترانہ ہو جاتی ہے، جو دل کی دنیا زیر و زبر کردیتی ہے، جس میں نغمگی بھی ہے، ترنم بھی، زیر و بم بھی، لیکن ان سب چیزوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی ہے اور وہ ہے جنون ـــ
ہاں جنون، وہ جنون، جس کے لئے اقبال نے بڑی پیاری اور دل آویز اصطلاحیں گھڑی ہیں، یہ جنون، ان کے غریب خانہ میں، مختلف بہروپ بھر کے مختلف رنگ اختیار کرکے مختلف لباس پہن کر آتا ہے، لیکن رہتا جنون ہی میں ہے، یہ کبھی بے اثر نہیں رہتا، اس کا اثر صرف دلوں پر نہیں ہوتا، سنگ دلوں پر بھی ہوتا ہے، یہ پتھر کو موم، فولاد کو پانی، آگ کو گلزار کردیتا ہے۔ وہ الفاظ سے نہیں کھیلتا، واردات بیان کرتا ہے، اور یہی کیفیت، نو بہ نو، لباس سے آراستہ ہو کر اس کے کلام میں بجلی کی طرح چمکتی اور آتشِ خرمن سوز کی طرح اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے نیا نہیں ہے، اس دنیا میں ہر چیز نئی ہو سکتی ہے، لیکن سچائی کی ندرت اور جدت کہاں سے لائے گا، سچائی تو اتنی ہی پرانی ہے، جتنی یہ دنیا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ، ہاں تو وہ جو کچھ کہتا ہے وہ نیا نہیں ہے، لیکن اس کا انداز نیا ہے، اسلوب نیا ہے، طرز نیا ہے، اصل قیمت انداز و اسلوب اور طرز ہی کی ہوتی ہے، اور یہ چیز جس افراط سے اقبال کے نگار خانہ میں ملتی ہے کہیں اور نہیں ملتی، ـــ مل ہی نہیں سکتی!

کلامِ اقبال کا امتیازی پہلو

وہ جب زندگی کے مسائل سے بحث کرتا، اور فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتا ہے، تو اس کی حیثیت کچھ عجیب سی ہو جاتی ہے، زندگی کے مسائل سے وہ

لوگ بھی بحث کرتے ہیں، جن کا پیشہ قیادت اور رہنمائی ہے، جو اقتصادیات و معاشیات کے عالم ہیں، جو سیاستِ بین الاقوام کے امام ہیں، لیکن ان کے ایک ایک بول، اور ہر ہر لفظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ زندگی سے خائف ہیں، اس سے ڈرتے ہیں، جھجکتے ہیں، اس کی خاطر اسے خوش کرنے کے لئے اسے حاصل کرنے کو، یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ان کے قدم جب بھی اُٹھتے ہیں، تو یہ کچھ جھکے جھکے سے، ہراساں ہراساں سے، سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں، یہی حال ان لوگوں کا ہے، جو فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتے ہیں وہ ڈور کی گرہیں کھول لیتے ہیں، لیکن ڈور کا سرا انہیں ملتا، وہ فلسفۂ حیات و مابعد الطبیعات سے بحث کرتے ہیں، لیکن کچھ اور الجھنیں پیدا کر دیتے ہیں۔ کچھ نئے مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو فلسفہ کے سامنے سر افگندہ ہو چکے ہیں، جو فلسفہ سے مرعوب ہیں، جو فلسفہ کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں، جتنا ایک سپاہی سپہ سالار کا، اور جو فلسفہ سے اتنے ہی ترساں و لرزاں ہیں جتنا ایک اچھوت برہمن سے اور جو فلسفہ کو اتنا ہی ناگریز سمجھتے ہیں جتنا ایک مے خوار، بادۂ گلرنگ کو، لیکن اقبالؔ کی شان مختلف ہے، وہ زندگی کے مسائل سے اس طرح بحث کرتا ہے، جس طرح ایک فاتح اور کشور کشا، اپنے باج گذاروں اور مفتوحوں سے مخاطب ہوتا ہے، وہ فلسفہ کے سامنے سر افگندہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ فلسفی نہیں ہے، وہ فلسفہ ساز ہے، فلسفہ گر ہے، اس کی جولان گاہِ افکار میں فلسفہ تخلیق ہوتا ہے، اور وہاں سے ڈھل کر اس طرح نکلتا ہے جیسے ٹکسال سے سکہ،

اس کی کارگاہِ فکر میں فلسفہ کے نظریئے اس طرح تراشے جاتے ہیں، جس طرح جوہری کی کارگاہ سے ہیرا ترش تراش کر، نئے آب و رنگ اور شانِ جمال کے ساتھ گاہکوں کے ہاتھ میں جانے کے لئے دکان پر پہنچتا ہے۔ وہ زندگی پر بھی حکومت کرتا ہے اور فلسفہ پر بھی۔ وہ زندگی کے لئے قالب کا سانچا بناتا ہے۔ وہ فلسفہ کو جلا دیتا اور نکھارتا ہے، دونوں اس کے محکوم ہیں، تابع ہیں، دست نگر ہیں۔ وہی زندگی جو دوسروں کے ہاں روکھی پھیکی نظر آتی ہے، اقبالؔ کے تصرّف میں آکر اس کی قیمت بھی بدل جاتی ہے اور قسمت بھی، اب یہی زندگی، رعنائی کا پیکر اور برنائی کی تمثیل بن جاتی ہے، وہی فلسفہ، جو دوسرے فلاسفہ کے ہاں "فیل مست بے زنجیر" نظر آتا ہے اقبالؔ کے دربار میں اس کی حیثیت مورِ ناتواں سے زیادہ نہیں۔ وہ فلسفہ کے طالب علموں کو نہیں مخاطب کرتا، نہ فلسفہ کے مریدوں کی طرف روئے سخن کرتا ہے وہ وقت کے فلاسفہ کو ٹوکتا، اور اپنی حکمت سے فلسفہ کو نیا آب و رنگ عطا کرتا ہے۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ بصارت بھی رکھتا ہے، اور بصیرت بھی، فراست کا حامل بھی ہے اور ذکاوت کا بھی، وہ نزدیک بیں بھی ہے، اور دُور اندیش بھی۔

عصرِ اقبالؔ ۸۱۴

اقبالؔ نے جو زمانہ پایا وہ متقدمین اور متأخرین شعراء کو نہیں ملا،

جس زمانہ سے اقبالؔ نبرد آزما رہا، اس کے مزاج شناس نہ اس کے پیش رو تھے، نہ ہم عصر، میں نے ابھی کہا تھا، اقبالؔ نے جو زمانہ پایا، وہ متقدمین اور متاخرین شعرا کو نہیں ملا، یہ بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے، لیکن متاخرین تو اسی زمانے میں پیدا ہوئے، رہے، اور مرے، انہیں اس زمانے سے محروم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے، اس کے جواب میں میں عرض کروں گا کہ متاخرین بیشک اس زمانے میں پیدا ہوئے، رہے، مرے، لیکن مرتے وقت تک وہ اتنے ہی معصوم رہے، جتنے پیدائش کے وقت تھے، انھوں نے یہ سوچنے کی کبھی کوشش نہ کی کہ زمانہ کدھر جا رہا ہے؟ اس کا تقاضا کیا ہے؟ اس کا مطالبہ کیا ہے؟ ضرورت اس کے سامنے سرافگندہ ہونے کی ہے یا نبرد آزما ہونے کی؟ اس سے لڑنا چاہیے یا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیئے؟ اس کا مقابلہ کرنا چاہیے، یا اس کی اطاعت قبول کر لینی چاہیے؟ بے شک یہ لوگ اقبالؔ کے دَور میں تھے، لیکن اقبالؔ سے اور اس کے زمانے سے بہت دُور، اتنی ہی دُور، جتنی دُور یہ زمین آسمان سے ہے، حد یہ ہے کہ حسرتؔ موہانی، جو سیاست کی دنیا میں بجا طور پر "سیّدالاحرار" کے خطاب سے سرفراز تھے اور جن کی ساری زندگی ایک مجاہدِ بے ریا کی زندگی ہے، شاعری کی دنیا میں "عاشقانہ اور فاسقانہ" ہی پر سَر دُھنتے رہے۔

عصرِ خویش سے اعلانِ جنگ

وہ اقبالؔ ہی تھا، جو اگرچہ نہتا تھا، لیکن جس نے عصرِ خویش سے اعلانِ

جنگ کیا، اور آخر وقت تک لڑتا رہا۔ نہ اس کے تیور میں فرق آیا، نہ ہمت میں، نہ عزم و حوصلہ میں، نہ جوشِ پیکار، اور شوقِ رزم میں، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس زمانہ کو، اس کے اقتضا اور مطالبہ کو اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا ــــ اس کا دل آزاد تھا، دماغ آزاد تھا، طبیعت آزاد تھی، مزاج آزاد تھا، وہ زندگی بھر غلامی کے حالات کے خلاف صف آرا رہا، نہ وہ ذہنی غلامی کو جائز سمجھتا تھا، نہ جسمانی غلامی کو، اس نے جو کچھ دیکھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جو کچھ سوچا، اپنے دماغ سے سوچا، جو کچھ کہا، اپنی زبان سے کہا، افکار و خیالات اور نظریات و تصورات کی دریوزہ گری اس نے کبھی نہیں کی۔

اقبال اور فرنگ

اس نے یورپ کی دانش گاہوں میں تعلیم حاصل کی، وہ انگلستان اور جرمنی میں برسوں رہا اور اپنے انگریز و جرمن استادوں کا ثناخواں اور مدّاح بھی رہا۔ اس نے مغربی ادب و لٹریچر کا مطالعہ کیا اس نے مغربی علوم و فنون کھنگالے، اس نے مغربی اقدارِ حیات اور اطوارِ زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا پرکھا، جانچا، لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر مرعوبیت اور سپردگی کی کیفیت نہیں طاری ہوئی، بلکہ اس کی خودشناسی اور خودنگری، خودی اور خوداعتمادی، اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ اپنے معنوی استاد نطشے کے بارے میں کہتا ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟

وہ آرنلڈ کی شاگردی پر فخر کرتا رہا، آرنلڈ سے اس نے بہت کچھ سیکھا اور پایا، آرنلڈ کے ادب واحترام میں اس نے کبھی کوئی کوتاہی روا نہ رکھی، لیکن آرنلڈ کی قوم سے، وہ زندگی کی آخری سانس تک جنگ کرتا رہا۔ اس کے اقدارِ حیات، اور اطوارِ زندگی کو ہیچ اور حقیر سمجھتا رہا، وہ للکارتا رہا ہے:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اور پھر متنبہ کرتا ہے:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مرعوبیت، اور سپردگی، یہ وہ الفاظ تھے، جو اقبال کی لغت میں تھے ہی نہیں،

استعمار اور سامراج کا دور

اقبال نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں، وہ استعمار اور سامراج کا دور تھا، اس کے ہم عصر شعراء استعمار، اور سامراج کے معنی بھی نہیں جانتے تھے، اور وہ سامراج کے کرشمے دیکھ رہا تھا، وہ دیکھ رہا تھا، دنیا کس طرح پلٹا کھا رہی ہے؟ حالات کس طرح بدل رہے ہیں؟ واقعات یکے بعد دیگرے کیونکر رُخ پلٹ رہے ہیں، حکومتیں کس طرح مٹ رہی ہیں، مسلمان کس طرح مٹائے جا رہے ہیں؟ فرنگی اقتدار کس طرح ساری دنیائے اسلام پر مسلط ہو رہا ہے؟ اور مسلمانوں پر کیسی شکست خوردہ ذہنیت طاری ہے، ان حالات کو دیکھ کر

وہ دل شکستہ نہیں ہوا، ہر واقعہ، ہر حادثہ، اس کے سمندِ عزم پر مہمیز کا کام دیتا رہا، کبھی وہ تاریخِ سلف کا ذکر کر کے اپنی قوم کا خون گرماتا، کبھی دل دوز، اور مایوس کن حالات کو اس رنگ اور اس طور سے پیش کرتا کہ مایوسی کے بجائے، لوگوں کے سینے میں عزم و ہمت، استقامت اور ثابت قدمی کی موجیں لہریں لینے لگتیں، اس کی آہ بھی ولولہ سے بھرپور ہوتی، اس کے نالے میں بھی بجلیاں کوندتیں، اس کے آنسو موتی نہیں شعلہ بن کر گرتے اور خاشاکِ غیر اللہ کو خاکستر کر دیتے۔

یورپ کا سفر سب ہی کرتے ہیں، اقبالؔ نے بھی کیا، جہاز جب سسلی (جزیرہ صقلیہ) کی طرف سے گذرا، تو اقبالؔ کے سامنے، تاریخ کے وہ اوراق آ گئے، جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا تھا۔ وہ یہاں حکومت کرتے تھے۔ یہ اسلامی ملک تھا، یہاں شاندار مسجدیں تھیں، درگاہیں تھیں، خانقاہیں تھیں، اور اب —— کچھ نہیں۔

اقبالؔ کا حساس دل یہ دیکھ کر تڑپ گیا، اور بے ساختہ وہ کہہ اٹھا:

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

پھر کس جوش کے ساتھ کہتا ہے:

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو!
زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے

ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظّارہ تھا

کبھی وہ وطنیت کے فتنہ کی طرف اپنی قوم کو متوجہ کرتا ہے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پھر الکساتا ہے:

نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

پھر سمجھاتا ہے:

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

کبھی مسلمان نوجوانوں کو یاد دلاتا ہے:

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

ہلالِ عید پر نظر پڑتی ہے تو اسے تاریخ کی گذری ہوئی کہانیاں بیتے ہوئے دن یاد آجاتے ہیں اور وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

طرابلس کے مسلمانوں پر، اطالیہ کے درندوں نے جو مظالم توڑے تھے انھیں دیکھ کر اقبالؔ کا خون کھول جاتا ہے، غلام ہے، بے بس ہے، کچھ نہیں کر سکتا، حضور رسالت مآبؐ میں پہنچتا ہے اور یہ داستانِ درد سنا کر ادب کے ساتھ عرض کرتا ہے:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حجاز میں شفاخانہ کھلتا ہے، کچھ لوگ اس کے پاس بھی چندے کے لئے پہنچتے ہیں، وہ جواب دیتا ہے:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

کارزارِ طرابلس میں، غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی ایک عرب لڑکی، فاطمہ بنتِ عبداللہ، اطالوی درندوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرتی ہے، یہ خبر جب اقبالؔ کے کانوں تک پہنچتی ہے تو فوراً اس کی زبان پر نالۂ منظوم جاری ہو جاتا ہے وہ اس کا مرثیہ کہتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

اور اپنے دل کو، ایک نئی امید سے معمور کرتا ہے:

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

تحریکِ خلافت ہندوستان میں ایک طوفان کی طرح نمودار ہوتی ہے۔

تحریکِ خلافت، علی برادران، اور اقبالؔ

دریاؤں سے دل جس کے دہل جائیں وہ طوفان

اس تحریک کے روحِ رواں، علی برادران تھے، وہ گرفتار ہوتے ہیں،
اقبالؔ اگرچہ اس وقت تک عملی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے، لیکن
مجاہدینِ ملت کی گرفتاری پر خاموش نہ رہ سکے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

عزلِ خلافت کے بعد، جب اتحادی حکومتوں نے ترکیہ کے حصے بخرے
کرنا شروع کئے، کچھ خود لے لیا، کچھ دوسروں کو عطا کر دیا، تو ہندوستان سے ایک
"ڈیلی گیشن" یورپ کے دورہ پر روانہ ہوا، تاکہ لائڈ جارج اور اتحادی حکومتوں
کے سربراہوں کی خدمت میں مسلمانانِ ہندوستان کے جذبات و تاثر پیش کرے
اقبالؔ کی غیرتِ ملی اسے برداشت نہ کر سکی:

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی!

لندن کی گول میز کانفرنس کے دوران شرکت میں مولانا محمد علی کا انتقال ہو گیا، تو اختلافِ مسلک اور اختلافِ فکر و نظر کے باوجود اقبالؔ تڑپ گئے، انھوں نے محمد علی کی خدمت میں بہ صورتِ مرثیہ ایسا شاندار خراجِ تحسین پیش کیا جس کی مثال ان کی شاعری میں نہیں ملتی:

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست
گرچہ آں نور نگاہ خاور از خاور گزشت

دیوبند کے مولا حسین احمد مدنی نے جو تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے سخت مخالف تھے اور کانگرس کے جاں نثاروں میں تھے، یہ نعرہ لگایا کہ:

"قومیں اوطان سے بنتی ہیں"

ایک عالمِ دین کی زبان سے یہ الفاظ سن کر اقبالؔ کو ایک دھچکا سا لگا، اس موقعہ پر انھوں نے جو چند شعر کہے وہ اپنی جگہ پر معرکہ آرا، اور نا قابلِ فراموش ہی ہیں، لیکن آخری شعر، ان کی شاعری بلکہ روحِ اسلام کا عطر ہے:

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبالؔ خود کیا تھا؛ اقبالؔ کا "انا"

غرضکہ اقبالؔ کی زندگی، اور اقبالؔ کی شاعری میں پوری مطابقت اور ہم آہنگی

ہے، جو کچھ دل میں آتا ہے کہتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں چونکہ وہ خلوص اور سچائی پر مبنی ہوتا ہے، لہٰذا، بے خوف اور بے جھجک ہو کر کہتے ہیں، اگرچہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں،

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

ضروری ہے کہ ایسی گوناگوں صفات رکھنے والی شخصیت کو پرکھا جائے، دیکھا جائے وہ خود کیا ہے؟ اپنے بارے میں کیا کہتا ہے؟ اس کا "انا" کس طرح کا ہے؟

ہر ادیب اور شاعر اپنے کلام اور تحریر سے اپنی شخصیت کو جدا نہیں کر سکتا وہ لاکھ ان دونوں میں حدِ فاصل قائم کرنا چاہے لیکن ممکن نہیں کہ بین السطور سے اس کی شخصیت اور اس کی ذات نہ جھلک رہی ہو۔ ابوالکلام کے قد و قامت سے کہیں زیادہ بڑا ان کا "انا" ہے، لیکن دل آویز اور خوبصورت، ابوالکلام کا "انا" جس خوبی، جس جامعیت، اور جس تکمیل کے ساتھ "غبارِ خاطر" میں جھلک رہا ہے، ان کی کسی تحریر اور کسی کتاب میں نہیں جھلکتا، اگر ابوالکلام کے منظر اور پسِ منظر، ان کی ذات اور شخصیت، ان کے عہد کے سیاسی افراد، اور سیاسی تحریکوں سے واقفیت ہو، تو صرف اس مختصر سی کتاب کو پیشِ نظر رکھ کر ابوالکلام کی مکمل اور مفصل سوانح عمری تیار ہو سکتی ہے۔ شاعروں کے ہاں "تعلّی" کی اصطلاح ہے اور چونکہ شعر میں ہر حرام حلال، اور شاعر کے لئے ہر ناجائز جائز ہے لہٰذا شاعروں کا "انا" تعلّی کے پردہ میں چھپ جاتا ہے۔ اسے بے نقاب کرنا بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے، لیکن بجائے خود ہے نہایت دلچسپ،

اقبال کی صورت برعکس ہے، اقبال کے ہاں تعلّی ملتی ہے لیکن تعلّی سے

ہٹ کر بھی، اپنی نظموں غزلوں اور شعروں میں وہ پوری رعنائی اور شان و جلال و جاہ
کے ساتھ جلوہ آرا نظر آتے ہیں۔

میں نے اقبال کا کلام سامنے رکھ کر اقبال کو ڈھونڈنے، اور تلاش کرنے
کی کوشش کی ہے آئیے اس کوشش میں آپ بھی میرا ساتھ دیں، ممکن ہے کہ گوہر
مقصود ہاتھ آجائے۔

رئیس احمد جعفری
۸۹ ٹیگور پارک لاہور
۲۱ر فروری ۱۹۵۶ء

اقبال اپنے آئینہ میں

(۱)

فسانۂ ستمِ انقلاب

ہر شاعر حساس ہوتا ہے۔ پھولوں کی رعنائی میں اسے زندگی مچلتی۔ انگڑائی لیتی اور امنڈتی نظر آتی ہے۔ مرجھائی ہوئی کلیاں دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے لیکن اقبال کا احساس کچھ الگ اور منفرد قسم کا تھا۔ ان کی حسّاسیت انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتی تھی۔

ایک شاعر کے لئے کنارِ آب دتہ شاخسار کا نظارہ بڑا دلفریب ہوتا ہے۔ پانی کی روانی اس کی طبیعت میں روانی پیدا کر دیتی ہے، دریا کی لہریں، اس کے دل میں تلاطم برپا کر دیتی ہیں، وہ اس منظر میں کھو جاتا ہے۔ دل کا بربط بجنے لگتا ہے۔ اور اس کی زبان ترانہ سنجی شروع کر دیتی ہے اگر پہلو میں یارِ طنّاز موجود ہوتا ہے، تو وہ اس کے کاکل و رخسار، ناز و ادا، غمزۂ عشوہ، اور ساقی و ساغر میں کھو جاتا ہے۔ پیتا ہے، پلاتا ہے، جھومتا ہے گاتا ہے کہتا ہے سنتا ہے، دیتا ہے، پاتا ہے، خدا کو فراموش کر دیتا ہے، خدائی کی پرواہ نہیں کرتا اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

تم جسے یاد کرو پھر اسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ ساری دنیا کو، غرق مے ناب کر دیتا ہے۔ ایک نئے عالم، نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ منظر کی نشاط افروزی اسے دنیا و ما فیہا سے بے خبر کر دیتی ہے، پھر وہ کسی کی نہیں سنتا۔ کچھ نہیں سوچتا۔

اور اگر پہلو خالی ہو، محبوب، خود نہ ہو، صرف اس کی یاد ہو، تو منظر کی نشاط افروزیاں اسے مبتلائے الم کر دیتی ہیں۔ وہ خون کے آنسو روتا ہے، جدائی اور فراق کا صدمہ نغمہ کو نالہ بنا دیتا ہے، پھر وہ ہنستا نہیں روتا ہے۔ گاتا نہیں کراہتا ہے۔ پاتا نہیں کھوتا ہے۔ اس کی زبان رب کی ترانہ سنجی کرتی ہے، لیکن لَے بدل جاتی ہے۔ ساز سوز کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور وہ دلِ داغ داغ کی کہانی اشک و آہ کے نمک مرچ کے ساتھ بیان کرنے لگتا ہے۔

لیکن اقبالؔ، جب دریائے راوی کے کنارے پہنچتا ہے، تو گو وہ شاعر ہے لیکن نہ اسے محبوب کی یاد ستاتی ہے، نہ گل و بلبل کی طرف وہ نظر کرتا ہے، نہ جامِ ارغواں، اور مے کہنہ سے وہ کوئی دلچسپی لیتا ہے، نہ حسن جواں، اور غمزۂ جاں ستاں اس کا دامن دل اپنی طرف کھینچتا ہے نہ ہجر و فراق اور وصال و حضور کی کیفیت اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، نہ اس کے بربطِ دل سے ہوس انگیز نغمے نکلتے ہیں۔ نہ اس کے سازِ دل سے نفس و ہوا کی لَے بلند ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی کو یاد کرتا ہے نہ کوئی اسے یاد آتا ہے، اسے ایسا محسوس

ہوتا ہے، یہ دریا ایک کتاب ہے، یہ موجیں اس کتاب کے اوراقِ پریشاں ہیں، ان اوراق میں عظمتِ ماضی کی داستان، اپنی پوری رعنائی اور زیبائی کے ساتھ زمانے کے قلم نے اس طرح لکھ دی ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی۔

وہ محسوس کرتا ہے، یہی وہ مقام ہے، جہاں سے اس کی قوم کا کاروانِ عظمت گزرا تھا۔ اور پھر چشمِ حقیقت بیں کھلتی ہے اور سامنے ہی اسے وہ آثار و نقوش نظر آتے ہیں، جو اس عظمتِ پارینہ کے آئینہ دار ہیں۔

یہ جہانگیر کا مزار ہے — یہاں وہ شہریار خوابِ ابد میں مصروف ہے، جس کی زندگی، ایک ہلچل تھی، ایک طوفان تھی، وہ دودمانِ مغلیہ کا گوہرِ شب چراغ تھا۔ وہ رند مزاج تھا، مے آشام تھا، حسن پرست تھا، لاابالی تھا، شراب، اور نورجہان کے علاوہ، ساری دنیا کو ہیچ سمجھتا تھا۔ لیکن یہی جہانگیر، جب گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کے میدان میں پہنچتا تھا، تو اس کی شمشیر خارا شگاف دشمن کے سر پر بجلی بن کر گرتی تھی اور اس کے خرمنِ حیات کو خاکستر کر کے رکھ دیتی تھی۔ اس کے عدل و انصاف کی داستانیں زبان زدِ خاص و عام ہیں اور وہ تاریخ کی جیتی جاگتی حقیقت ہیں۔ عدلِ جہانگیری، صرف ایک افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ واقعہ ہے، ناقابلِ فراموش سچائی، فقیدالمثال واقعہ، یہ وہی جہانگیر ہے جس نے نورجہاں کو، باہمہ الفت و محبت، تعزیر کے شکنجہ میں کس دیا تھا، کہ عدل و انصاف کا تقاضہ یہی تھا، علامہ شبلی نے اس نیم تاریخی واقعہ کو ایک معرکہ آرا نظم لکھ کر غیر فانی بنا دیا ہے۔

اور جہانگیر کے مزار کے پاس ہی، نورجہاں بیگم کا سوگوار مزار ہے۔

نے چراغے نے گلے

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

جس کی زندگی عیشِ لازوال کا نمونہ تھی، جس کے حرم میں کنیزانِ سمن برکا ہجوم رہتا تھا، اور جس کے سامنے خود شہنشاہ جہانگیر، سرِ تسلیم خم کئے رہتا تھا، وہ آج بے کسی کے عالم میں، گوشۂ قبر میں آرام فرما ہے اور اس کی بے کسی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

کہ سبز پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

اقبالؔ، کنارِ راوی پہنچ کر، اسی خیال میں کھو جاتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام

لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام

ذرا زبان کی حلاوت، بیان کی برجستگی، اور حسنِ ادا کا نمونہ دیکھئے:

عدم کو قافلۂ روزِ تیز گام چلا

شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

اور اب اس کی چشمِ عبرت دیکھتی ہے کہ:

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی

منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی!

فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل!
کوئی زبانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل
مقام کیا ہے سرودِ خموش ہے گویا
شجر، یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا

"سرودِ خموش" اور "انجمنِ بے خروش" کی ندرتِ ترکیب کیا اردو زبان میں قابلِ قدر اضافہ نہیں ؟

کلی

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگین اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زرّیں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں
زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

•

(۲)

دردِ دل

گورستان کی طرف ہم میں سے اکثر کا گذر ہوتا رہتا ہے، قبروں کو دیکھ کر دل پر سوز و گداز اور رنج دائم کی ایک کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا ہے یہی انجام ایک دن ہمارا بھی ہونا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے دنیا کی نیرنگیوں، رعنائیوں اور دلچسپیوں سے طبیعت نفور ہو جاتی ہے۔ کوئی گذرا ہوا دوست ساتھی، عزیز یاد آجاتا ہے تو دل میں تلاطم سا پیدا ہو جاتا ہے، لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ منظر آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہوا اور تاثر ختم ہوا۔

لیکن شاعر — اقبال — جب گورستان کی طرف سے گزرتا ہے، تو اس کے تاثرات کچھ دوسرے قسم کے ہوتے ہیں، وہ ہماری طرح نہیں سوچتا، وہ جانتا ہے اور خوب جانتا ہے۔

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است

لیکن ایسے مواقع پر، یہ خیال اس کے دل میں نہیں آتا۔ وہ کچھ اور سوچتا ہے، اور اس کے سوچنے کا طرز، ہم سے آپ سب بالکل جدا ہوتا ہے۔

اس کا جی چاہتا ہے کہ آسودگانِ خاک سے باتیں کرے۔ اپنی کہے ان کی سنے، اپنی کم کہے، ان کی زیادہ سنے، اپنی کہنے کا اشتیاق اس لئے نہیں کہ اس کی ایک ایک بات سے واقف ہیں۔ ان کے سننے کا اشتیاق اس لئے زیادہ ہے کہ وہ دنیا اب تک نئی ہے، لیکن بہرحال وہاں جانا ہے، اور انسان کی یہ فطری خواہش ہے کہ جہاں وہ جانا چاہتا ہے، جہاں وہ جانے پر مجبور ہے وہاں کے بارے میں سوچے، پوچھے۔ معلومات حاصل کرے۔

چنانچہ اقبالؔ ایک نئے انداز اور اسلوب سے اپنے سوالات کی ابتدا کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں سے جو زیرِ زمین ـــ ہنگامہ سا اور شورشوں سے دُور، چین اور آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ کچھ جھجکتے ہوئے سوالات کرتے ہیں۔ کرید کرید کر، وہاں کے ـــ نئی دنیا، منزلِ عدم کے حالات دریافت کرتے ہیں۔

اے مئے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم!

اور قبل اس کے کہ وہ کچھ جواب دیں اقبالؔ سوال کرتا ہے:

وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی؟
اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا

واں بھی جل مرتا ہے سوزِ شمع پر پروانہ کیا
اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا

پھر اپنی حالت بتاتے ہیں:

یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل

اب اصل سوال کرتے ہیں:

اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اُس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟

کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقان بھی ہے، خرمن بھی ہے
قافلے والے بھی ہیں، اندیشۂ رہزن بھی ہے

تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے
خشت و گل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا
امتیازِ ملّت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟

وہاں بھی آخر وہی لوگ ہیں جو یہاں تھے، کیا وہاں جا کر ان کی طبیعت میں، مزاج میں، سرشت میں، خیالات میں انقلاب ہو گیا ہے؟ کیا وہاں جا کر وہ کچھ بدل گئے ہیں؟

واں بھی کیا فریادِ بلبل پر چمن روتا نہیں؟
اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں؟

مطلب یہ کہ، اس دنیا میں، ہم سب حرص و ہوا بن کر رہ گئے ہیں۔ کیا وہاں جانے کے بعد بھی ہمارے رنگ ڈھنگ میں۔ ہمارے اطوار میں۔ ہماری طرزِ حیات میں کوئی فرق نہیں آیا ہے؟

---

(۳)

مناظر

شاعر کی کائنات دل کے سوا کیا ہے؟ وہ جو کچھ کہتا ہے، دل سے کہتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے، دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ جو کچھ سُنتا ہے۔ دل کے کانوں سے سنتا ہے۔ جو کچھ محسوس کرتا ہے اسی سے محسوس کرتا ہے۔ عقل سے، اسے بیر ہے۔ دشمنی ہے۔ عقل چالاک ہے، دل سادہ لوح ہے، عقل مکّار ہے، دل فریب خوردہ ہے، عقل دور اندیش ہے، اور "وہ آفت کا ٹکڑا" دل وہ ایثار ہے، عقل سوچتی ہے، دل کرتا ہے، عقل فکر ہے، دل عمل ہے، عقل نشیب و فراز کے چکّر میں گرفتار رہتی ہے۔ لیکن دل اس طرح کے توہمات سے یکسر آزاد اور بے پروا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عقل، اور دل، یعنی عقل اور شاعر کی نہیں بنتی، دونوں میں ان بن رہتی ہے، دونوں کا راستہ الگ ہے۔ منزل جدا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تحقیر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ہیچ اور ناکارہ سمجھتے ہیں۔ عقل اس پر نازاں ہے کہ وہ جو فیصلہ کرتی ہے سوچ سمجھ کر کرتی ہے۔ دل کو اس پر

فخر ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کر گذرتا ہے "سوچنے کے" وسواس میں نہیں گرفتار ہوتا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق!
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال کے کلام میں عقل و دل کی آویزش اکثر مقامات پر ملیگی کہیں اس کا رنگ تیکھا ہے، کہیں سنجیدہ، کہیں طنز و تعریض، کہیں دلیل و حجت، لیکن ان دونوں میں ناقابلِ مفاہمت دشمنی اقبال نے پیدا کردی ہے۔ وہ عقل کی خوبیوں کے منکر نہیں لیکن ان کے سامنے اسے کچھ نہیں سمجھتے۔

عقل و دل کے عنوان سے انھوں نے ایک طویل نظم لکھی ہے، جس میں دونوں نے اپنے اپنے فضائل اور مناقب کے بارے میں مناظرہ کیا ہے۔ عقل نے اپنے فضائل گنائے ہیں اور دل نے اپنے مناقب کی فہرست پیش کی ہے۔ اقبال چونکہ دل کے ساتھ ہیں، بلکہ خود سراپا دل بھی ہیں اس لئے انھوں نے عقل کے اعتراضات کا جواب بڑی عقل سے دیا ہے۔ چند شعر سُنئیے۔ عقل دل کو چڑاتی ہے اور کہتی ہے:۔

بوند اک خون کی ہے تو لیکن
غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

دل جوش و خروش کے ساتھ جواب دیتا ہے:

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں

علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے
تو خدا جو، تو ناخدا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا
طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام ترا
عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

عقل کی ساری فسوں طرازی، تعلّی اور دلیل و برہان کا جواب اقبال نے صرف ایک مصرعہ میں دے دیا ہے:

عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

نمودِ صبح

مطلع خورشید میں مضمر ہے یوں مضمون صبح
جیسے خلوتگاہ مینا میں شراب خوشگوار
ہے تہ دامانِ بادِ اختلاط انگیز صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہمکنار
جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

(۴)

احساس گداز

شاعر کی طبیعت یکسر سوز و گداز ہوتی ہے، وہ ہر واقعہ سے عبرت اور حکمت کا درس لیتا ہے۔ وہ شمع سوزاں کو دیکھتا ہے۔ اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔ نت نئے تصورات پردۂ چشم کے سامنے نمایاں ہوتے ہیں۔ نئی نئی کیفیتوں سے وہ لذت آشنا ہوتا ہے۔ نئے نئے تأثرات اس کا رابدل اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

شمع کا سوز و گداز، اس کی دردمندی اور جگر کاوی، دنیائے شاعری کی مسلمات میں داخل ہے۔ شاعر شمع کو دیکھتا ہے۔ پھر اپنے سراپا پر نظر ڈالتا ہے، دونوں میں اسے مشابہت نظر آتی ہے، مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ اب وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ باتیں شروع کر دیتا ہے، پہلے اس سے اپنا تعارف کراتا ہے۔

بزمِ جہاں میں مَیں بھی ہوں اے شمع دردمند

اور اس تعارف کے بعد محبت بڑھتی ہے اور وہ اپنے اور شمع کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتا ہے ؎

دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے
اور گل فروشِ اشک شفق گوں کیا مجھے

اس تعارف، اور امتیاز کے بعد، جب وہ شمع کا گریہ مسلسل، یا گداز متواتر دیکھتا ہے تو یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا

ہے شان آہ کی ترے دودِ سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں

اگر تیری جلوہ گاہ میں دل پوشیدہ ہے؛ تو پھر "من و تو" کا فرق قائم رکھنے کی کیا ضرورت ہے؛ لیکن نہیں یہ فرق تو قائم رہے گا۔

کعبہ میں، بتکدے میں ہے یکساں تری ضیا
میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

تیرا فیض عام ہے۔ تو کعبہ میں بھی جلتی ہے اور دیر میں بھی۔ بزمِ عیش میں بھی؛ اور شمع مزار کی حیثیت سے بھی، غریب کی جھونپڑی میں بھی اور امیر کے ایوان میں بھی۔ بیمار کے کلبہ احزاں میں بھی اور صحت مند کے گھر میں بھی، ہاں تیرا فیض عام ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ مگر میں — شاعر — جس مقام پر فائز ہوں، وہ کوئی معمولی مقام نہیں ہے تو جلتی ہے لیکن احساس دولت سے محروم ہے۔ میں جلتا ہوں لیکن احساس کی نعمت سے مالا مال ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تو ساکن ہے، میں متحرک، تو جذبات سے عاری ہے اور میں سراپا جذب کیف ہوں۔

میں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی

آگاہ اضطرابِ دلِ بے قرار بھی

اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار

اور یہ سب کچھ اس لئے کہ مجھے 'احساس گداز' سے بھی نوازا گیا ہے۔

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

اور اس احساس کا کرشمہ یہ ہے کہ میں پیکرِ اضطراب ہوں، اور تو شمعِ خاموش، میری جان پر بنتی ہے، اور تو صرف گھل رہی ہے، میں رونے کے ساتھ ہنسنے پر بھی مجبور ہوں، اور تو صرف روتی ہے۔ تیرے پاس دل ہے، آنکھ نہیں۔ میری بدقسمتی، اور میرے ساتھ قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ میں آنکھ بھی رکھتا ہوں اور دل بھی۔

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کن کی بہار دیکھ
اک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ

اور اب ایک آنکھ سے ہزار خوابِ پریشاں دیکھ رہا ہوں۔

لیکن نہیں — !

یہ جو کچھ ہے، میں اس سے غمگین اور رنجیدہ نہیں ہوں۔ جب اپنے وجود پر غور کرتا ہوں تو اپنی اہمیت محسوس کرنے لگتا ہوں۔

مضمون فراق کا ہوں، ثریا نشاں ہوں میں

آہنگ طبع ناظم کون ومکاں ہوں میں

باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود

گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے مضموں بلند ہے

اور یہی مضمون کی بلندی ہے، جس نے بعد میں وہ چیز پیدا کی ہے جسے "انا" کہتے ہیں۔

اور اب شاعر شمع کو درسِ حکمت دیتا ہے،

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہور جلوۂ ذوقِ شعور ہے

یہی ذوقِ شعور ہے جو انسان میں تڑپ اور سوز وگداز کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی سے اس کی رفعت اور بلندی قائم ہے، یہ نہ ہو تو انسان انسان نہ رہے، کچھ اور بن جائے، کوئی اور چیز پھر بتاتے ہیں؟

یہ سلسلہ زمان ومکاں کا کمند ہے
طوقِ گلوئے حسن وتماشا پسند ہے

لیکن یکایک شاعر محسوس کرتا ہے، میں سب کچھ ہوں لیکن منزل سے

دور ہوں۔ یہ بھی نہیں جانتا منزل ہے کہاں؟ گم کردہ راہی کا یہ احساس شاعر پر ایک نیا جذبہ طاری کرتا ہے، اور وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے سب فریب ہے، حقیقت نہیں۔ حقیقت کہاں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم

منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہوں میں
اے شمع، میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں

اور یہ فریبِ نگاہ، نئے نئے حوادث و آلام اور کیفیات اور احوال سے مجھے روشناس کرا رہا ہے۔

صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ
بامِ حرم بھی طائرِ بامِ حرم بھی آپ

میں ہی میں ہوں، اور خود ہی حلقۂ دامِ ستم بھی خود ہی بامِ حرم ہوں، اور خود ہی طائرِ بامِ حرم بھی ــ آخر یہ معمہ کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ میری حقیقت کیا ہے؟

میں حُسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں؟
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں؟

لیکن یہ کہتے کہتے، "عشقِ سراپا گداز" اپنا رنگ دکھاتا ہے اور شاعر ناز و نیاز کے گرداب سے نکل کر حقیقت کے میدان میں آجاتا ہے، اور نہ کہتے ہوئے بھی، سب کچھ کہہ جاتا ہے۔

ہاں آشنائے لب نہ ہو رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

(۵)

شاعر کا احساس

پھول میں اور شاعر کے دل میں کتنی مشابہت ہے؟

مزاج اور طبیعت، آغاز و انجام، بود و عدم کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

پھول کھلتا ہے، اپنی تازگی اور رعنائی کا جلوہ دکھاتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔

کیا دل کی بھی یہی کیفیت نہیں؟

وہ بھی کھلتا ہے، امیدوں اور حسرتوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے گہوارے میں نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ پھر بادِ خزاں چلتی ہے، امیدوں کا موسم گل ختم ہو جاتا ہے۔ حسرتوں کا دورِ خزاں شروع ہو جاتا ہے، آرزو کا چراغ اس بادِ تند کی تاب نہیں لاتا جھلملاتا ہے، اور دم توڑ دیتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی وہ ساری کائناتِ آرزو ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے ساتھ ہر چیز رخصت ہو جاتی ہے، بقولِ شاعر ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبادت ہے تیرے جینے سے

دل مرگیا، تو زندگی کہاں رہی؛ دل نہ رہا تو جوش اور ولولہ کی دنیا کہاں رہی؛ دونوں لازم و ملزم ہیں۔ دونوں کی ہستی ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ دونوں میں ربط ضبط ہے، جو گوشت اور ناخن میں!

اقبالؔ کی نظر ایک مرجھائے ہوئے پھول پر پڑتی ہے!
اس مرجھائے پھول کو دیکھ کر وہ عہدِ بہار یاد آجاتا ہے، جب یہ کلی سے کونپل بنا تھا پھر جب اس نے گلِ رعنا کی صورت اختیار کرلی تھی، جو دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں طراوت پیدا ہو جاتی تھی، چمن کی زینت اس سے تھی۔ باغ دبستان کی رونق یہ تھا۔ باغبان اسے دیکھ کر خوش ہوتا تھا، صبا کے نام سے یہ ناآشنا تھا، خزاں کی نہ اسے فکر تھی نہ جانتا تھا کہ وہ کیسی ہلاکت خیز اور مرگ آفریں چیز ہے۔ لیکن ابھی یہ زندگی کے لطف اور لذّت سے آشنا ہی نہ ہوا تھا کہ پیامِ مرگ آپہنچا۔ اس کی تازگی رخصت ہوگئی اور گل پژمردہ بن کر یہ پاؤں تلے روندا جانے لگا، شاعر نے اسے دیکھا اور بہ آہِ سرد کہا:

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں؟
کس طرح تجھ کو تمنّائے دلِ بلبل کہوں؟
تھی کبھی موجِ صبا گہوارۂ جنباں ترا
نام تھا صحنِ گلستاں میں گلِ خنداں ترا

تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

لیکن اب وہ دور ختم ہو گیا۔ تیرا ننھا سا وجود بارِ غم نہ اٹھا سکا، اور زندگی سے بیزار ہو کر عدم کے گوشہ میں جا چھپا۔ لیکن کچھ بھی ہو، مجھ میں اور تجھ میں جو ربط تھا وہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا

(۶)

خمارِ حسرت

شاعر، ماہِ نو سے مخاطب ہے! — اسے ماہِ نو میں ایک عجیب قسم کی کشش محسوس ہوتی ہے، وہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے اس کا نظارہ نہیں کرتا۔ ایک سائنس دان اور محقق کی حیثیت سے بھی اس کا مطالعہ نہیں کرتا۔ ایک مظاہر پرست کی حیثیت سے بھی اس پر نظر نہیں ڈالتا۔ اس کا نقطۂ نظر خالص شاعرانہ ہے، لیکن اس کی شاعری میں حکمت اس طرح کی سموئی ہوئی تھی، جس طرح حلقۂ چشم میں نگاہ۔ اس کی حکمت میں شاعری، اور شاعری میں حکمت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ چاند کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ جس طرح چاند کے ساتھ ساتھ بحرِ بے کراں، یعنی سمندر میں مد و جزر اور تلاطم کی کیفیت طاری ہوتی ہے اسی طرح اقبال کے دل میں اسے دیکھ کر ہلچل مچ جاتی ہے اور وہ کیفیات سے بے قابو ہو کر اپنے تاثرات زبان پر لے آتا ہے۔ ان تاثرات میں رنگینیٔ دل ہے، حلاوتِ بیان بھی اور فکرِ عمیق بھی۔

وہ چاند کو دیکھ کر، خالص شاعرانہ زبان اور بڑے دلکش انداز میں کہتا ہے:

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

چاند کو "عروسِ شام" کی بالی سے تشبیہہ دینا یا اس کی چمک دمک کے لحاظ سے اسے "سیمِ خام" کی مچھلی قرار دینا، اتنا اچھوتا اور نادر تخیل ہے جو صرف اقبال ہی کے ہاں مل سکتا ہے۔

لیکن تکلف برطرف ـــ وہ زیادہ عرصہ تک شاعرانہ باتیں نہیں کرتا، بلکہ حکیمانہ رنگ ان پر غالب آجاتا ہے۔

قافلہ تیرا رواں بے منتِ بانگِ درا
گوشِ انساں سُن نہیں سکتا تری آوازِ پا

گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو
ہے وطن تیرا کدھر کس دیس کو جاتا ہے تو

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد دل کی بات زبان پر لاتے ہیں:

ساتھ اے سیارۂ ثابت نما لے چل مجھے
خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بے کل مجھے

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

(۷)

اقبالؔ کہ ہے قمری شمشاد معانی

تعلّی ہو یا تفاخر، شاعر جب اپنے بارے میں کچھ کہنے پر آتا ہے تو بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ پرکھنے والے ایسے کلام کو دیکھ کر اچھی طرح پرکھ لیتے ہیں۔

ہے تہہ میں در دخیالِ ہمہ دانی

لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے باوجود شاعر اپنی شاعری سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتا، دونوں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ جدا نہیں کیے جا سکتے۔

جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی

شعر لفظ ہے اور معنیٰ خود شاعر!

کہیں پردہ میں، کہیں اعلانیہ، کہیں استعارہ کے طور پر، کہیں بطریقِ تکلم و تخاطب، اقبالؔ نے اپنے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے، اس اظہارِ خیال کے بین السطور سے، الفاظ سے معنیٰ سے، اندازِ اسلوب سے، اقبالؔ کی شخصیت اس طرح جھلکتی ہے جس طرح ماہِ نو میں، آفتاب عالمتاب کا عکس؛

اقبال کی شخصیت، اس کے خیالات، اس کا تصور، اس کی ذات، اس کا "انا"، اس کا عمل، اس کا مشاہدہ، اس کا فلسفہ، اس کا نظریۂ حیات، کوئی چیز ایسی نہیں، جو صاف اور واشگاف نہ نظر آتی ہو۔

"زہد اور رندی" میں اقبال نے ایک مولوی صاحب کی کہانی سنائی ہے:

کرتے تھے ادب جن کا اعالی و ادانی

یہ مولوی صاحب، اقبال سے ہمسائگی رشتہ رکھتے تھے، اور ویسے ہی تھے جیسے عام طور پر مولوی صاحبان ہوا کرتے ہیں، وہی اپنے آپ کو سب کچھ سمجھنا، دوسروں کو خاطر میں نہ لانا، اپنے کرامات اور خرق عادات پر ایمان رکھنا، اور دوسروں کے ملکات اور فضائل کا استخفاف کرنا، اپنے آپ کو دین اور شریعت کا اجارہ دار خیال کرنا اور دوسروں کو کافر یا وہابی قرار دینا، لیکن ان مولوی صاحب کی قوتِ فیصلہ اقبال کے بارے میں عاجز تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس شخص کو صوفی قرار دیں، رند مانیں، دائرۂ اسلام سے خارج کر دیں۔ یا فاجر و فاسق تسلیم کر لیں۔ آخر ایک روز ضبط نہ کر سکے، اقبال کے ایک ہم نشین سے اس کے بارے میں پوچھ ہی ڈالا۔

پابندیٔ احکام شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیم ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی!

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علی ہم نے سُنی اس کی زبانی

مولوی صاحب اقبال کے جتنے جرائم گنا رہے ہیں، اقبال انھیں حُسن اور ثواب سمجھتے ہیں۔ مولوی صاحب کی زبان پر یہ عیب بن کر آتے ہیں، اقبال کے کردار میں یہ خوبی بن کر سمائے ہوئے ہیں۔

اب مولوی صاحب کا لب و لہجہ بلند اور تلخ ہوتا ہے:

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی!

کچھ عار اسے حُسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

یہ ساری خود قرار دادِ جرم ــــ جو درحقیقت اقبال کا اپنا فخریہ ہے ــــ سنانے کے بعد کتنی بے بسی سے کہتے ہیں:

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

آخر جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس رند پارسا کے بارے میں رائے کیا
قائم کریں تو عاجز آکر ایک ایک شعر پر بات ختم کر دیتے ہیں،

مجموعۂ اضداد ہے اقبالؔ نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی!

رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوّف کی تو منصورؒ کا ثانی

اور مختصر یہ کہ فتویٰ لگ گیا،

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر یہ سب کچھ سُننے کے بعد، اقبالؔ نے
بڑا مختصر لیکن انتہائی جامع جواب دے دیا،

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنّا ہے کہ اقبالؔ کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اور بات یہیں ختم ہو گئی

بلبل

اور بلبل، مطربِ رنگیں نوائے گلستاں
جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں
عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے
باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
وادیٔ کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں

●

(۸)

دیدۂ بینائے قوم

قوموں اور ملتوں کی تعمیر و تشکیل میں شاعر کا بڑا حصّہ ہوتا ہے ، وہ اپنے سخن گرم سے ، دلوں کو گرماتا ہے ، جوش و خروش پیدا کرتا ہے۔ کٹ مرنے ، زر مقصد پر جان دینے کا ولولہ پیدا کرتا ہے، شاعر کا ایک مصرعہ وہ کام کرتا ہے، جو بڑے بڑے خطیبوں کی آتش نوائی اور واعظوں کی شعلہ مقالی سے بھی ممکن نہیں۔ اس کا ایک شعر صدہا کتابوں، اور ہر قسم کی دلیل و برہان پر بھاری ہوتا ہے۔

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھیئے، وہ شاعر ہی تھے، جنھوں نے اپنے اشعار میں انقلاب کو سمویا، اور انقلاب آگیا۔ وہ شاعر ہی تھے جنھوں نے غلامی کے خلاف قوم کو ابھارا اور وہ صف آرا ہو گئی، وہ شاعر ہی تھے، جنھوں نے دشمن کے خلاف افرادِ قوم کو للکارا اور صف بستہ ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچ گئے، وہ شاعر ہی تھے، جنھوں نے بزدلوں اور کم ہمتوں کو مخاطب کیا اور ان میں وہ جذبہ اور طنطنہ پیدا کر دیا جس نے بڑی سے بڑی قوت کو زیر دیں

سے اکھاڑ کر پھینک دیا، شاعر ایک بہت بڑی قوت ہے اور اس قوت سے ٹکرا کر کوئی سلامت نہیں رہ سکتا۔

شاعر کے الفاظ اقوام کی قسمت بدل دیتے ہیں، ملکوں کا نقشہ بدل دیتے ہیں۔ دنیا کے جغرافیہ میں تبدیلی کر دیتے ہیں۔ عہدِ جاہلیت کے شعرائے عرب، جب چاہتے تھے امن و سکون کے سمندر کو شعلہ جوالا بنا دیتے تھے۔ تلواریں میان سے باہر نکل آتی تھیں۔ خنجر خون چاہتے اور نیزے سینوں میں پیوست ہونے کے لئے بے قرار ہو جاتے تھے۔ یہ شعرا ہی تھے جنھوں نے عرب جیسی قوم کو، جس کے پاس نہ دولت تھی، نہ وسائل و ذرائع، روم اور ایران کی مسلح، دولت مند اور جہاں آرا اقوام کی غلامی سے محفوظ رکھا۔ یونان، روم، فرانس اور برطانیہ کی تاریخ بھی شعرا کے انقلاب انگیز کارناموں سے پُر ہے۔ فارسی شاعری میں بھی ہمیں یہی جوہر نظر آتا ہے۔ اس شاعری نے جو روپ بدلا، ایرانی قوم بھی اسی لباس میں جلوہ گر ہو گئی۔ فارسی شعرا نے جو روش اختیار کی، فارسی بولنے والی مخلوق ان کی ہمنوائی سے انکار نہ کر سکی۔ اس سے بڑھ کر اس شاعری کے اثر و نفوذ اور اقتدار کا کیا ثبوت ہوگا کہ جن باتوں کے زبان پر لانے سے آج بھی ایک آدمی کی گردن کٹ سکتی ہے اور اس پر کفر کے فتوے لگ سکتے ہیں، اسے گمراہ اور بے دین قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا معاشرتی بائیکاٹ کیا جا سکتا ہے اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت تک نہیں مل سکتی۔ وہی باتیں، بہت زیادہ تند و تلخ، ترش اور تیز انداز و اسلوب میں ان شاعروں نے کہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ ان کے

خلاف کوئی اقدام نہیں ہو، بلکہ ان کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان کی شہرت بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگوں نے ان سے اظہارِ عقیدت شروع کر دیا۔ انہیں زاہدِ والا مقام، اور صوفی والا مرتبت مان لیا۔ ان کے عرس ہونے لگے۔ ان کے کلام سے فال نکالی جانے لگی۔ انہیں مشائخ کے زمرہ میں شامل کر لیا گیا اور ان کی تعظیم و تکریم اکابر رجال کی طرح ہونے لگی۔ اردو شاعری میں بھی حالی کے مسدس نے وہ کام کیا ہے، جو اس عہد کے کسی مصنّف، کسی خطیب، کسی عالم اور کسی صوفی سے نہیں بن آیا۔

یہ بات خود شاعر کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنے لئے کونسا راستہ اختیار کرتا ہے۔ قوم کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیلتا ہے، یا راہِ راحت پر گامزن کرتا ہے۔ اس کے لئے اپنے الفاظ کے تانے بانے سے غلامی کی زنجیریں تیار کراتا ہے۔ یا شمشیرِ آبدار، قوم بہر حالی، اس کی سُنے گی اس کو مانے گی، اور اس سے عقیدت و ربط و تعلق کے اظہار میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرے گی۔

اب دیکھنا چاہیے، اقبال شاعر کو کیا سمجھتے اور اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

محفلِ نظمِ حکومت چہرہ کا زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اقبالؔ اس قسم کے شاعر تھے۔

تارکِ قرآن

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

●

(۹)

دل

جب سے آدم نے، جنت فردوس کو چھوڑ کر، اس دنیا میں قدم رکھا ہے۔ یہ دنیا آماجگاہ شر و فساد بنی ہوئی ہے۔ ہنگامہ اور شورش اس کی سرشت بن گیا ہے۔ یلغار، اور للکار، اس کی زندگی کا لباس ہے! ــــ اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان کے سینے میں، جو ایک ننھا سا، گوشت کا ٹکڑا دھڑکتا رہتا ہے جسے دل کہتے ہیں، وہ بڑا من چلا ہے۔ جہاں کوئی نہیں جا سکتا یہ چلا جاتا ہے۔ جو کام کوئی نہیں کر سکتا یہ کر ڈالتا ہے۔ جو کسی سے ممکن نہیں، وہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

مذہب نے بھی دل کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ احادیث صحیحہ میں وارد ہوا ہے کہ انسان کی سلامتی کا مدار اس کے دل پر ہے۔ اگر یہ توانا اور تندرست ہے تو وہ بھی توانا اور تندرست ہے اور اگر یہ ہدف فساد بن چکا ہے تو سارا جسم غارت گیا۔

صوفیہ کے ہاں تو "تزکیۂ قلب" کو بڑی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

ان کا ذکر و شغل سب اسی دل کے لئے ہوتا ہے۔ مرشد جب تک دل کی اصلاح نہیں کر لیتا اور اسے صالح نہیں بنا لیتا۔ اس وقت تک وہ مرید کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا۔ حلقۂ تصوف میں سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا جاتا ہے وہ دل، اور صرف دل ہے۔

غور کیجیے تو دنیا کی تعمیر و تخریب میں صرف دل ہی کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ تخریب دل کے "فساد" کا نام ہے اور تعمیر دل کی صالحیت کا، دنیا میں قتل و غارت، فتنہ فساد، کشت و خون، رزم و پیکار، اور خانہ جنگی کا جب سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اسی وقت جب دل اپنے محل سے نکل جاتا ہے اور جب امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے، فارغ البالی اور سکون کی نعمت میسر ہوتی ہے۔ تعمیر اور اصلاح کے کارنامے انجام دیئے جاتے ہیں۔ نوع انسان کی صلاح و فلاح کے واقعات وقوع کا جامہ پہنتے ہیں تو یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ مائل بہ فساد نہیں ہوتا، بلکہ اپنی سرشت اور مزاج کے اعتبار سے صالح ہوتا ہے۔

شاعروں نے تو اپنا زور بیان، دل پر صرف کر دیا ہے، کسی نے اسے ملاحیاں سنائی ہیں۔ کسی نے اس کے ترانے گائے ہیں۔ کسی نے اس کی ہجو کی ہے۔ کسی نے اس کی شان میں قصیدہ پڑھا ہے۔ کسی نے تو بہ کی طرح 'قابلِ شکست' قرار دیا ہے۔ کسی نے بت کی طرح اسے پوجا ہے، غالب نے اس کی جو تعریف کی ہے وہ اچھوتی ہی ہے اور مطابق واقعہ بھی۔

میں ہوں اور آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

اس شعر میں دل کی جتنی صفتیں بیان کی گئی ہیں وہ بجائے ایک دفتر معنیٰ ہیں "آفت کا ٹکڑا" "دلِ وحشی" "عافیت کا دشمن" اور "آوارگی کا آشنا" یہ سارے صفات واقعی دل کے ساتھ خاص ہیں اور ان کی تشریح کی جائے تو پورا ایک دفتر تیار ہو جائے۔

اقبالؔ خود اپنے متعلق کہہ چکے ہیں:

گہرا ہے میرے بحرِ خیالات کا پانی

اور واقعہ بھی یہی ہے ا —— وہ کسی چیز پر طائرانہ نگاہ نہیں ڈالتے۔ وہ کسی چیز کو سرسری طور پر دیکھتے ہوئے گذر جاتے ہیں، وہ صرف ایک عالم، ایک حکیم۔ ایک شاعر ہی نہیں ہیں، ان سب سے ماسوا بھی وہ بہت کچھ ہیں، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفکر بھی ہیں اور ان کے فکر میں عمق اور گہرائی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی بات پر لب کشائی کرتے ہیں تو ایک جہان معنیٰ لاکر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ وہ ایسی دور کی کوڑی لاتے ہیں، جہاں تک ہر شخص کی فکر پہنچ نہیں سکتی۔ وہ اپنی عقابی نگاہ سے کام لے کر۔ دل وجود کی ایسی گہرائیوں میں پہنچ جاتے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا، وہ ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے ہیں جن کی طرف عام لوگوں کا ذہن بھی نہیں منتقل ہوتا۔

کلامِ اقبالؔ کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اسے جس نقطۂ نظر سے دیکھیے، آپ کو کام کی چیزیں قدم قدم پر ملتی چلی جائیں گی، صرف ذوقِ تجسس اور سعی و تلاش کے جذبے کی ضرورت ہے۔ اقبالؔ کا کلام رنگارنگی کا مجموعہ ہے، اس میں اعلیٰ و ادنیٰ ہر ذوق کی رعایت ہے۔ ہر ذوق اپنی تسکین و تسلی کا مواد فراہم کر سکتا

ہے، اس بارگاہ سے ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا، جو اس کی تمنّا ہے، جو اس کی جستجو ہے۔
جس عنوان پر، جس موضوع پر، جس اصول پر آپ اقبال اور اقبال کے خیالات معلوم کرنا چاہیں، معلوم کر سکتے ہیں، بشرطیکہ اس کا تعلق، حیاتِ انسانی کے کسی پہلو سے ہو، درحقیقت اقبال کا موضوعِ کلام بھی یہی ہے۔ وہ صرف حیاتِ انسانی ہی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اور اس کی اصلاح و فلاح سے متعلق نئے نئے قابلِ قبول اور قابلِ عمل نکتے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

دل کے سے نازک اور پیچیدہ مسئلہ پر بھی اقبال نے اظہارِ خیال کیا ہے اور حق یہ ہے کہ چند اشعار میں، انھوں نے جو کچھ کہہ دیا ہے وہ چند دیوانوں پر بھاری ہے یہ مصرعہ انہی کا ہے:

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

اور اپنی شاعری میں انھوں نے مختلف زاویوں سے "کتابِ دل" کی تفسیریں لکھی ہیں، چند اشعار ملاحظہ فرمایئے، اور اقبال کے حقائق و معارف کا اندازہ کیجیے۔

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یا رب
جل گئی مزرعِ ہستی تو اگا دانۂ دل!

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا!
تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دل؟

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانۂ دل!

تو سمجھتا نہیں اے زاہد ناداں اس کو!
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکستر پروانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

ان چند اشعار میں اقبالؔ نے کیا کچھ نہیں کہہ دیا؟ کیا کچھ نہیں بیان کر دیا؟
لیکن ان کی پیدائش اور نشو و نما پر جو کچھ ڈیڑھ شعر میں کہا ہے، اگر صرف وہی
کہتے تو کتاب دل کی تفسیر کا حق ادا ہو جاتا۔

دل کی پیدائش کی حقیقت ایک مصرعہ میں بیان کی ہے،

جل گئی مزرعۂ ہستی تو اگا دانۂ دل!

اور حق یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر جامع اور مانع طور پر، یہ حقیقت نہیں بیان کی جا سکتی۔ آخر میں دل کی نشو و نما کا افسانہ ایک شعر میں بیان کیا ہے، اور قلم توڑ دیا ہے۔

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے، تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

کوئی بڑے سے بڑا "اہلِ زبان" شاعر بھی اس مفہوم کو اتنی خوبصورتی سے ادا نہیں کر سکتا۔

(۱۰)

کنجِ تنہائی

شاعر دنیا کے کسی خطہ کا ہو، شاعر ہوتا ہے۔ ہر شاعر اپنا ایک معیار رکھتا ہے۔ اس معیار پر اپنے معاصرین کو پرکھتا ہے، جو پورا اترتا ہے، اس سے ہم ذوقی کے رشتہ کی بنا پر ایک ربط و تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ربط و تعلق متعدد مقامات پر ایک کو دوسرے کا ہم سخن اور دمساز بنا دیتا ہے، اسی کو شاعرانہ اصطلاح میں "توارد" کہا جاتا ہے، لیکن زیادہ عالی ظرف لوگ اپنا راگ، جب کسی نغمے میں سنتے ہیں تو خیالات کو مستعار لینے سے بھی نہیں ہچکچاتے، اعتراف بھی کرتے ہیں اور اس کی لے میں اپنی لے ملا دیتے ہیں۔

اقبال علومِ مشرق و مغرب کے جامع تھے، ان کی نگاہ میں جس طرح مشرق کے یگانۂ روزگار شعراء کا کلام تھا، اسی طرح مغرب کے مایہ ناز شعراء کے نتائجِ فکر بھی ان کے سامنے تھے، ان میں سے اگر کوئی چیز انہیں اپنے خیالات سے ملتی جلتی نظر آتی تھی، تو وہ اس کے اخذ و استفادہ میں تامل نہیں کرتے تھے۔ ایمرسن کی ایک نظم کو، انھوں نے اپنایا ہے، اس کے دو اشعار خاص طور پر بڑے اثر انگیز ہیں،

جن میں اقبال کی خود اپنی شخصیت جھلکتی نظر آ رہی ہے:

بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند

پھر اس کی توجیہہ پیش کرتے ہیں:

طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنجِ عزلت کا ہوں میں
دیکھ اے غافل پیامی، بزمِ قدرت کا ہوں میں

بزمِ قدرت کی پیامبری کی صورت کیا ہے؟

ہم وطن شمشاد کا، قمری کا میں ہمراز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش برآواز ہوں

گوش برآواز ہونے کا سبب کیا ہے؟

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کے سنانے کے لئے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کے دکھانے کے لئے

اور اس جذبہ نے شاعر میں ایک خاص قسم کا استغنا پیدا کر دیا ہے:

عاشقِ عزلت ہے دل نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں

---

(۱۱)

طفلِ ناداں میں بھی ہوں

شاعری موصوف موزونئ طبع کا نام نہیں ہے، یہ ایک مستقل علم اور مستقل فن ہے، شاعر کے لئے، جہاں اور بہت معلومات ضروری ہیں، وہاں اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ ماہر نفسیات ہو۔ لوگوں کی نفسی کیفیت پر عبور رکھتا ہو۔

من انداز قدرت را می شناسم

وہ رمز آشنا ہو، جب تک اس میں یہ خصوصیت نہ ہوگی، نہ وہ اپنے تاثرات کی صحیح ترجمانی کر سکے گا، نہ دوسرے کے ذہن و دماغ کو تول کر اور ان کی فکر و نظر کا جائزہ لے کر وہ کوئی بات کر سکے گا جو شاعر موزونئ طبع کے باوجود، کسی خاص مقام پر فائز نہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ نہ اپنے بارے میں کچھ جانتے ہیں، نہ دوسروں کے بارے میں انہیں کوئی علم ہے، نہ اپنی ترجمانی کر سکتے ہیں، نہ کسی اور کے جذبات و احساسات کا مطالعہ کر کے اس کی ترجمانی کر سکتے ہیں، اور بدقسمتی سے شاعر کی حیثیت صرف ترجمان ہی کی

ہے، اگر وہ ترجمان ___ اپنا بھی، اور دوسروں کا بھی ___ نہیں ہے، تو سب کچھ ہے مگر شاعری نہیں۔ غالبؔ نے یہی بات کہی ہے،

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جب تک یہ بات نہ ہو کہ کہے کوئی، اور ترجمانی اپنی معلوم ہو، اس وقت تک شاعری، شاعری نہیں ہوتی وہ تک بندی ہوتی ہے۔

اقبالؔ کے کلام پر اگر اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے، تو نفسیاتی تأثرات و نشانات ان کے ہاں کافی ملیں گے۔ ایک نظم ہے، "طفلِ شیر خوار" اس میں بڑے نفسیاتی انداز میں بچّہ کی "طلب اور رسد" کی تحلیل ہے۔ اس کی ضد، اس کے رونے، اس کے جھنجلانے، اور اس کے مچل جانے کی تصویر کشی تو اتنے دلآویز اسلوب سے کی ہے کہ بس،

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

لیکن اس کی نفسیاتی تحلیل کرتے کرتے، وہ اپنے سراپا پر نظر ڈالتے ہیں، تو انہیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک طفلِ شیر خوار، اور ایک شاعر میں کتنی چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔ ذرا سی بات پر روٹھ جاتا، معمولی سی بات پر من جاتا، پھر ان کا ذہن رسا ایک قسم کی تسلی قائم کرتا ہے، اور وہ فرماتے ہیں،

آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
تو تلوّن آشنا میں بھی تلوّن آشنا

عارضی لذت کا شیدائی ہوں چلاتا ہوں میں
جلد آجاتا ہے غصہ جلد من جاتا ہوں میں
میری آنکھوں کو بھا لیتا ہے حسنِ ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی میری

آخر میں تو یہ مناسبت اور زیادہ چوکھی ہو جاتی ہے :

تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں طفلِ ناداں میں بھی ہوں

غور کیجئے، تو یہ اشعار ایک بہت بڑی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔!

---

(۱۲)

رازدار قضا و قدر

جو شاعر آزاد فضا میں جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ ان کی نغمہ سرائی کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے، جو غلام قوم میں پیدا ہوتے ہیں، جن کی سخن سنجی اور نطقِ کلام پر پابندیاں ہوتی ہیں، جن کی آنکھوں کے سامنے دار و رسن اور سجن و زنداں کے واقعات بار بار دہرائے جاتے ہیں، ان کی مصیبت بڑی دردناک ہوتی ہے۔ خاموش نہیں رہ سکتے، اگر خاموش رہیں تو سینہ پھٹ جائے، کھل کر دل کی بات زبان پر نہیں لا سکتے، اگر ایسی جرأت کریں تو زبان کاٹ لی جائے:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

بدقسمتی سے اقبال جس قوم میں پیدا ہوئے، وہ صرف غلام تھی، بلکہ غلامی پر قانع بھی تھی۔ انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتا تھا اور جہدِ حیات اور جہادِ حریت کے میدان میں گام فرسا کرتا تھا، راستہ خطرات سے گھرا ہوا تھا، لیکن وہ اپنے فرائض

انجام دیئے جارہے تھے، قوم میں حرارت پیدا کر رہے تھے، اسے سودائے حریّت سے آشنا کر رہے تھے، اس میں استقلال، اور آزادی کا جذبہ پیدا کررہے تھے، اسے جاں نثاری اور فداکاری کا سبق دے رہے تھے۔ اسے ایک نئی ___ آزاد ___ دنیا بسانے کا مشورہ دے رہے تھے، اگر یہ نہ کرتے تو اپنے فرض سے غافل رہتے، اور وہ اپنے فرض سے کسی قیمت پر بھی غافل نہیں رہ سکتے تھے۔

لیکن جب وہ اپنے آس پاس پر نظر ڈالتے تھے، اپنی دشواریوں، اور معذوریوں کو محسوس کرتے تھے، ان پابندیوں اور رکاوٹوں پر نگاہ ڈالتے تھے، جو حریّت طلب کرنے والوں پر عائد کردی گئی تھیں، تو وہ محسوس کرتے تھے، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، یہ کم ہے۔ ناکافی ہے، میری لے اور تیز ہونی چاہیئے، میرا نغمہ اور اونچا ہونا چاہیئے، میری حدی خوانی میں کچھ اور کیفیت ہونی چاہیئے، لیکن حالات سدِ راہ بن کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور وہ بہت سی باتیں دل کے نہاں خانے میں قید کردینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ایک طویل نظم میں انھوں نے اپنی اس طرح کی بے چارگی اور مجبوری پر نظر ڈالی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ، اپنی قوم کو جھنجوڑتے بھی گئے ہیں ذیل میں اس طویل نظم کے صرف چند ایسے اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں انھوں نے اپنی کیفیت بیان کی ہے:

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

پھر پیار سے دریافت کرتے ہیں:

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

پھر بتاتے ہیں میں خاموش رہوں تو بھی:

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

چمن والوں کو اس راز سے بھی آشنا کرتے ہیں:

اڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

اور تنگ آکر کہتے ہیں:

الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا۔
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

یہ کہہ کر اب اپنی داستانِ درد سناتے ہیں:

بیابانِ دہر میں ناآشنائے بزمِ عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو میں وہ محرومِ مسرت ہوں

مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں!
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں

اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے راز دانوں میں

اور بالآخر دنیا نے دیکھ لیا، اقبال نے یہ جو کچھ کہا تھا، محض ایک شاعرانہ تعلّی نہ تھی، ایک پیشین گوئی تھی، اور وہ پوری ہو کر رہی!

---

(۱۳)

استاد کی یاد

منت پذیری، اور احسان شناسی کا جذبہ اقبال میں بدرجۂ اتم تھا! انھوں نے فلسفہ پروفیسر آرنلڈ سے پڑھا تھا۔ آرنلڈ نے اس جوہرِ قابل کو پرکھ لیا تھا، محسوس کر لیا تھا، یہ ذرہ ایک دن آفتاب بن کر چمکے گا۔ انھوں نے بڑی محبت اور شفقت سے مقاماتِ علم طے کرائے۔ پھر آرنلڈ اپنے وطن چلے گئے، اور رفتہ رفتہ اقبال، اقبال بن گئے، لیکن بایں ہمہ اپنے اُستاد کو یاد کرتے رہتے، اس سے ملنے کی تمنا انہیں بے چین رکھتی تھی۔ وہ اس احسان کو کبھی فراموش نہ کر سکے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں آرنلڈ کا بہت بڑا حصہ ہے۔

آرنلڈ کی یاد میں "نالۂ فراق" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، یوں تو پوری نظم مرصع ہے لیکن ذیل کے اشعار میں چونکہ ذاتی تاثر اور شخصی رنگ جھلک رہا ہے اس لئے یہ خاص طور پر مطالعہ طلب ہیں:

تو کہاں ہے اے کلیم ذرۂ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم

اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

شوقِ ملاقات و حسرتِ دید میں اضافہ ہو رہا ہے، اس کا اظہار کرتے ہیں:

کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو؟

تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو، ہے سخن تصویر کا

خودی کی تربیت

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سِرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز

---

(۱۴)

لذّتِ درد

چاند کو دیکھ کر شاعر کے بحرِ خیالات میں مد و جزر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ اس سے پوچھتا ہے:

قصد کس محفل کا ہے، آتا ہے کس محفل سے تو؟
زرد رو شاید ہوا رنجِ رہ منزل سے تو؟

پھر جب بابِ سخن وا ہوتا ہے، تو اپنا، اور چاند کا تقابل کرتے ہیں:

آفرینش میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزہ پہ تیرا ہم قسمت ہوں میں

اس کے بعد مناسبت بھی پیدا کر لیتے ہیں:

آہ میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منّتِ خورشید سے

اب چونکہ شاعر، اور چاند، دونوں ایک دوسرے کے ہمدم اور رازداں بن گئے، اس لئے شاعر ذرا بے تکلف لہجہ میں کہتا ہے:

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو، تنہا ہوں میں
مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل

لیکن اس مناسبت کے باوجود، ایک بہت بڑا اور بنیادی فرق بھی ہے — میں دردِ دل کا لذت آشنا ہوں، تو اس سے محروم ہے۔

پھر بھی اے ماہِ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں رکھتا ہوں وہ پہلو اور ہے

خودی

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر ولیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر

---

(۱۵)

حسنِ ازل

شاعر کی آنکھ حسن گر ہوتی ہے، حسن شناس ہوتی ہے، حسن آفریں ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھتا ہے، اس سے متاثر ہوتا ہے، دوسروں کو متاثر کرتا ہے، جگنو پر ہماری آپ کی ہر روز نظر پڑتی ہے۔ اسے دیکھتے ہیں، طبیعت خوش ہوتی ہے، ایک کیف سا طاری ہوتا ہے پھر وہ اپنی روشنی کی ہلکی ہلکی سی چمک دکھاتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔ ہم بھی دوسری دلچسپیوں میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ نہ جگنو یاد رہتا ہے نہ اس کی دل پذیری۔

لیکن شاعر جب اسے دیکھتا ہے تو بے خود ہو جاتا ہے۔ قدرت کی اس کاری گری کو دیکھ کر عش عش کرنے لگتا ہے، بہت سی شاعرانہ باتیں، شاعرانہ اندازِ بیان میں کہنے کے بعد کہتا ہے

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے

یہ شعر سُنیئے :

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں چمک ہے

دین و ہنر

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

---

(۱۶)

منّت پذیری

داغؔ بھی اقبالؔ کے استاد تھے، آرنلڈ سے اقبالؔ نے زیادہ فیض حاصل کیا، داغؔ سے کم، لیکن فیض وہ چیز ہے جو ناپ تول کر نہیں لیا جاتا، یہ وہ نعمت ہے کہ کم ہو یا زیادہ جس سے ملے دل اس کے گیت گاتا ہے، اس کی تعریف کرتا ہے۔ اس کا ممنون ہوتا ہے، اور یہ منّت پذیری نطق و بیان کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

اقبالؔ کا رنگ اور تھا، داغؔ کا اور، دونوں میں بعد المشرقین تھا، ایک — اقبالؔ — فطرتِ انسانی کا راز داں تھا، قدرتِ الٰہی کا محرمِ اسرار تھا۔ قوموں کے عروج و زوال کا رمز آشنا تھا، دوسرا — داغؔ — رندی اور ہوسِ مشربی کا پیامبر تھا، عشق و محبت کا فسانہ خواں تھا، معاملہ بندی اور تغزل کا نغمہ سرا تھا، ان دونوں میں کوئی مناسبت بھی نہیں تھی، یکسانیت بھی نہیں تھی، لیکن اقبالؔ داغؔ کے شاگرد تھے۔ زبان کے اسرار و رموز، محاورات کی نزاکت، ترکیب اور بندش کا فن انھوں نے داغؔ سے سیکھا، شاگردی اور اُستادی کی مدت بہت مختصر

رہی، لیکن اپنا کام کر گئی، ایک ایسا نقش بٹھا گئی، جسے زمانہ کی گردش بھی محو نہ کر سکی۔

داغؔ کی وفات پر اقبالؔ نے ایک اثر انگیز نظم کہی ہے اور داغؔ کے فن کو سراہا ہے، اس کی شخصی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی زبان دانی۔ نکتہ سنجی، اور تخیل آفرینی کی داد دی ہے۔ ایک ہم عصر، ایک دوست، ایک شاگرد جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ سب اقبالؔ نے کہہ دیا ہے۔ آخر میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ عام سے زیادہ خاص ہے، یعنی اس میں ذاتی رنگ نمایاں ہے۔ چند شعر آپ بھی سن لیجیے۔

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلّی داغؔ کو روتا ہوں میں

اے جہان آباد، اے سرمایۂ بزمِ سخن
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
آہ خالی داغؔ سے کاشانۂ اردو ہوا

مسلم کی صداقت

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک
عدل اس کا تھا قوی، لوثِ مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک
تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق الادراک
خود گدازی نمِ کیفیتِ صہبایش بود
خالی از خویش شدن صورتِ مینایش بود

●

(۱۷)

سکوتِ شام

شام کا وقت ہے۔ دن کی سرگرمیاں ختم ہو رہی ہیں۔ شام کی نشاط افروزیوں کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے، لوگ مصروفیتوں سے فراغت کے بعد واپس جا رہے ہیں کوئی بیتا بانہ گھر کی طرف لپک رہا ہے، کسی کے قدم کلب کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ کسی کو سینما کی دلکشی اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ کسی کو تھیٹر کی جلوہ سامانیاں دعوت دے رہی ہیں کوئی بازارِ حسن کا طواف کر رہا ہے۔ کوئی مشنوہ فروشوں کے بالاخانوں کا رُخ کر رہا ہے۔

ہر کس بہ خیالِ خویش خبطے دارد

لیکن ہمارا شاعر، ان سب چیزوں سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر دریائے راوی کے کنارے پہنچتا ہے اور وہاں کا منظر دیکھ کر کھو جاتا ہے کچھ عجب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس پر

سکوتِ شام میں محو سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

شاعر دریا کے کنارے کھڑا ہے، موجیں اٹھ رہی ہیں۔ گرداب بن رہے ہیں۔ ننھی ننھی، چھوٹی چھوٹی، ہر قسم کی مچھلیاں، پانی کے فرش پر محوِ خرام ہیں۔ فضا کا سناٹا بڑھتا جاتا ہے۔ شور و غل کا راج ختم ہو چکا، سکوت اور سکون کی دنیا آباد ہو رہی ہے۔

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں!
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں!

لیکن یہ بے خودی، دعوتِ فکر و نظر بھی دے رہی ہے، شاعر دیکھتا ہے:

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہُوا ہے موج سے ملّاح جس کا گرم ستیز

کشتی بڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے:

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دُور گئی!

کشتی نظروں سے اوجھل ہو گئی، لیکن شاعر کے سامنے کتابِ معرفت کھل گئی:

جہازِ زندگی کا یونہی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی

اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ:

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

•

(۱۸)

کارواں کی منزلِ مقصود

اہل اللہ کا تصرف باطنی، وہم و وسوسہ نہیں، ایک حقیقت ہے۔ اقبال اگرچہ دانشِ افرنگ اور علومِ مغربی سے بہرہ ور تھے، لیکن اپنے مذہب کے والا و شیدا تھے، اپنی قوم پر جان دیتے تھے، اپنے اکابر کا احترام کرتے تھے اور ان سے اظہارِ عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔

سلطان الاولیا حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ سے اقبال کو بڑی عقیدت تھی۔ جب وہ دلی جاتے تھے، مزارِ پُرانوار پر ضرور حاضری دیتے تھے، خانقاہ کی دیواروں پر بہ خطِ جلی خواجہ حسن نظامی مغفورؒ نے اقبال کے بہت سے اشعار جو سلطان الاولیا کی تعریف میں ہیں، رقم کرا دیئے ہیں۔ آج بھی ہر زائر اس کا مطالعہ کر سکتا ہے، ابھی حال میں (۲ ستمبر ۱۹۵۶ء) جب راقم الحروف، دہلی اور لکھنؤ کے سفر پر ایک ضرورت سے صرف دو دن کے لئے روانہ ہوا تو سلطان الاولیا کی بارگاہ فلک نگاہ پر بھی حسب معمول حاضری دی۔ اس مرتبہ اقبال کے یہ اشعار دیکھ کر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔

بیرسٹری، اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لئے جب اقبال نے یورپ کا عزم سفر کیا تو سب سے پہلے وہ دلی آئے اور "التجائے مسافر" کے عنوان سے ایک معرکۃ آرا نظم انھوں نے نذر کے طور پر خانقاہ میں پیش کی۔ اس طویل نظم کو سب کا سب تو درج نہیں کیا جا سکتا، البتہ وہ اشعار جن میں اقبال کی روح اور نظرت و شخصیت جھلکتی ہے، ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مزار پر انوار پر پہنچ کر اقبال کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے:

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

محبت، آئین و حدود کی پابند نہیں ہوتی، وہ اپنا راستہ آپ پیدا کرتی ہے۔

مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

خالص مذہبی نقطۂ نظر سے، ممکن ہے بعض لوگوں کے لئے قابلِ اعتراض ہو۔ لیکن آئینِ محبت میں اس طرح کی باتیں جائز ہیں۔

اس کے بعد کتنے جوش، اور کتنے خلوص سے فرماتے ہیں:

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار توام!
دگر کشادہ جبینم، گلِ بہار توام!

اقبال بہت بڑے سفر پر ایک بہت بڑا مقصد لے کر جا رہے ہیں، دوستوں کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں:

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست

تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

ماں کی دعائیں اور عاشق زار بھائی کی دعائیں بھی ہمرکاب ہیں ——
وہی ماں جس کے لئے انھوں نے کہا تھا،

دفتر ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

اور وہی بھائی جس کے لئے انھوں نے کہا تھا:

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا

لیکن دعاؤں کے اس توشہ کو وہ ناکافی خیال کرتے تھے۔ ان دعاؤں میں، محبت تھی، تعلق خاطر تھا اور کوئی شبہ نہیں، یہ دونوں قیمتی چیزیں ہیں، لیکن وہ تقدس اور تصرّف نہ تھا، جو صرف کسی اہل اللہ کی دعا میں ہو سکتا ہے، چنانچہ سفر لندن پر روانہ ہونے سے پہلے وہ دلّی گئے اور خانقاہ سلطان الاولیاءؒ میں حاضری دی، اور مزارِ پُرانوار کے سامنے پہنچ کر، دل کی مراد الفاظ کی صورت میں زبان پر لے آئے۔

سب سے پہلے عزمِ سفر کا اظہار کرتے ہیں:

چمن کو چھوڑ کر نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو!

اور اس عزمِ سفر کا اظہار کرنے کے بعد یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ میرے سفر کا مقصد جاہ و منزلت نہیں، منصب اور عہدہ بھی نہیں ہے۔ دنیا، اور دنیا کی رنگینیاں بھی نہیں ہیں۔ میں اس لئے نہیں جا رہا ہوں کہ وہاں کی ایمان شکست

فضا میں کھو جاؤں، خدا کو فراموش کردوں، کوئی اعتراض کرے، تو معذرت کے طور پر کہہ دوں، کیفیت تو یہ تھی کہ:

ساقی یہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی!
مطرب یہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش تھا

اس حالت میں غرقِ مئے ناب ہونے کے سوا میں اور کر کیا سکتا تھا؟
وہ صاف الفاظ میں عرض کرتے ہیں، میرے سفر کا مقصد حصولِ علم ہے۔
وہی علم جس کے بارے میں خواجۂ کونینؐ نے فرمایا ہے:

اطلبوا العلم ولو کان بالصین

علم حاصل کرو، خواہ چین ہی کا سفر کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔
اسی ارشاد کی پیروی میں، یہ دُور دراز کا سفر اختیار کر رہا ہوں:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو!

اور اب التجائے دُعا کرتے ہیں:

فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ التجا قبول نہیں ہوئی؟

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

کیا اقبالؔ اپنی زندگی میں منزلِ کارواں نہیں بن گئے؟

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

اپنے اُستاد میر حسن کا ذکر کس عقیدت سے کرتے ہیں:

وہ شمع بارگہ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

بھائی کے ذکر میں لفظ لفظ سے محبت پھوٹی پڑتی ہے:

وہ میر یوسف ثانی، وہ شمع محفلِ عشق

ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

التجائے مسافر ختم ہوتی ہے:
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

درسِ خودی

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
برنگِ سحر ساحل آشنا رہ!
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

---

(۱۹)

تقلید

انقلاب نام ہے، تغیر کا، زندگی کا، جوش اور ولولہ کا، تقلید نام ہے جمود کا، موت کا، افسردگی فکر اور اضمحلالِ آرزو کا!

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیغمبر ہم رہِ اجداد رفتے

ہاں وہ تقلید قرار واجب اور ضروری ہے جو ضمیر سے ہم آہنگ ہو۔ دلیل اور برہان کی پابند ہو حقیقت اور معرفت کا جس سے نشان ملتا ہو۔

اقبالؔ اس تقلید کے مخالف تھے، جو انسان میں جمود اور تعطل پیدا کردے، جو اس کی عقل و خرد پر چھاپہ مارے اور اسے ختم کر دے، جو ضمیر کی آواز دبا دے، اور دانش و بینش کو بیکار کردے، یہ تقلید ان کے نزدیک مرگ آفریں تھی، اور مسلمان قوم اس لئے دنیا میں مبعوث نہیں کی گئی تھی، کہ کھائے پیئے اور مرجائے۔ اس لئے بھیجی گئی تھی کہ دنیا کی رہنمائی کرے، اسے غلط راستے سے ہٹائے اور صحیح راستے پر گامزن کردے، مسلمان موت

کا قائل ہے، موت مسلمان کو ہلاک نہیں کر سکتی'

اس لئے ان کا پیام یہ ہے:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

ہوشیار

گرم فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ
وائے وہ رہرو کہ منتظرِ راحلہ
تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ
دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد
سالکِ رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ
اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ
تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر
مرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ!

---

(۲۰)

گریۂ جاں گداز

شمع کی جو چیز اقبال کو بھاتی ہے، وہ اس کا گریۂ جاں گداز ہے، وہ سوچتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ اگر زندگی سوز سے خالی، درد سے محروم اور لذتِ آرزو سے تہی نہ ہے، تو وہ زندگی نہیں، ایسی زندگی اپنے سامنے کوئی مقصد نہیں رکھتی۔ ایسی زندگی پروان نہیں چڑھ سکتی، ایسی زندگی میں جوش اور ولولہ نہیں، وہ مسلمان کو درسِ حیات دیتے ہیں اور اس درسِ حیات کی بنیاد و اساس یہ ہے کہ مسلمان اپنی خودی کو فراموش نہ کرے، اپنی حقیقت کو نہ بھولے، اپنے مقصد کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔ اور یہ جذبہ اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا جب تک عشق، اور سوز و گداز کی کیفیت ان میں نہ پیدا ہو، جب تک وہ شمع کے استقلال سے کام نہ لے۔ نتائج اور ثمرات سے بے پروا ہو کر اپنے مقصد کی دُھن میں گام فرسانہ رہے۔ شمع کی طرح گھلے، گھلتا رہے، لیکن مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دے!

یہی بات ہے، جسے وہ پیغام کی صورت میں اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں،

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمعِ بزم، حاصلِ سوز و ساز دے
شانِ کرم پہ ہے مدار عشقِ گرہ کشائی کا!
دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے

اور حاصلِ کلام یہ کہ:

صورتِ شمع نور کی ملتی نہیں قبا اُسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جاں گداز دے

صحنِ چمن کنجِ قفس

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری!
حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عینِ مستوری
وہ ملتفت ہوں تو کنجِ قفس بھی آزادی
نہ ہوں تو صحنِ چمن بھی مقامِ مجبوری
بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

(۲۱)

جذب حرم

آج کی قوم، کل قبر میں ہو گی، اور آج کے لڑکے، کل قوم بنیں گے!

یہ قوم جو قبر میں جانے کی تیاریاں کر رہی ہے، اب جوشِ کردار سے محروم ہو چکی ہے، وہ پود جو بہت جلد قوم بننے والی ہے، اپنے تازہ ولولوں سے بہت کچھ کر سکتی ہے۔ انقلاب لا سکتی ہے، دنیا کا تختہ الٹ سکتی ہے۔ منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ کاروانِ آرزو کی سالاری کر سکتی ہے۔

اقبالؔ اس حقیقت سے آشنا تھے، وہ نئی پود سے جو امید رکھتے تھے۔ اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں سے نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بھارت اور پاکستان کے بڑے "قوم ساز" ادارے ــــ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ــــ کے طلبہ کو اپنا مخاطب بنایا اور فرمایا:

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سُن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

طائرِ زیرِ دام کا نالہ درسِ غلامی اور طائرِ بام کا نالہ ——؟

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا،
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

بس یہی ذوقِ طلب اور یہی "جذبِ حرم" اقبال کا پیام تھا۔ پیامِ اقبال کی روح تھی۔

دل کی بیداری

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری
مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

(۲۲)

حسنِ کامل

شاعر حسن کا دلدادہ ہوتا ہے، اس کی جادو بیانی، سحر طرازی، قافیہ پیمائی، رنگین مزاجی، رہینِ منت ہوتی ہے حسن کی، وہ جہاں، جس جگہ، جس کسی میں حسن کی تجلی پاتا ہے، اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیتا ہے، وہ خرمن ہے اور حسن برق خرمن سوز، پھر بھی اس میں، اور حسن میں ایسا رشتہ قائم ہے، جو ناقابلِ انفصال ہے، جو کبھی، اور کسی حالت میں نہیں ٹوٹ سکتا، وہ حسن دیکھ کر مچل جاتا ہے اور پھر قابو میں نہیں آتا، حسن کے پاس سب کچھ ہے، اور شاعر کی بساط، عشق کے سوا کچھ نہیں۔ وہ شمع کی طرح پگھلتا، پروانہ کی طرح جلتا اور بلبلِ ناشاد کی طرح آہ و فغاں کرتا ہے، اسی آہ و فغاں پر اس کی زندگی قائم ہے اور اپنی زندگی پر وہ مغموم نہیں، نازاں ہے، اس کو وہ چاہت سمجھتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مدار ہے یہی زندگی کا مقصد، یہی منزلِ مقصود۔

اقبالؔ کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ جب وہ کسی نازک موضوع پر زبانِ سخن وا کرتا ہے، تو سب سے پہلے، وہ زبان کے پجاریوں، الفاظ کے

نقش بندوں، اور ترتیب و بندش کے متوالوں کے سامنے، انہی کی زبان میں گفتگو کرتا ہے، اور جب انہیں اپنا اعجازِ کلام کا قائل کر لیتا ہے، تب اپنے خاص رنگ پر آتا ہے۔ وہی رنگ جس میں شیوا بیانی بھی ہے اور نغزِ گفتار بھی، سوز بھی ہے، اور ساز بھی، اوج بھی ہے اور ندرت بھی، کیف بھی ہے اور سحر بھی۔

"حسن و عشق" کے عنوان سے ایک بڑی ستھری اور پیاری نظم اقبال نے لکھی ہے، پوری نظم حلقۂ ثریا ہے، کوئی شعر بھی پڑھئے، اس کا جادو اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہے گا، لیکن جہاں عشق کی زبان میں اپنا اور حسن کا تقابل کیا ہے وہاں تو ندرتِ بیان اور حسنِ کلام کی انتہا نہیں رہتی

میں حضرتِ سودا کو سُنا بولتے یارو
اللہ رے اللہ رے کیا لطفِ بیاں ہے

اقبال، جب اپنے رنگ میں کچھ کہتا ہے، تو اس کے کلام کا تیور، ہم زبانوں کو پہلے ہی سے متنبہ کر دیتا ہے؛

اب بزم میں حاضر جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

چنانچہ اس معرکہ آرا نظم کا آغاز، ایسے تیور، اور ایسے اسلوب سے ہوتا ہے کہ ذوقِ سلیم سر دھننے لگتا ہے، وجدان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ زبان بلائیں لینے لگتی ہے، لطافتِ بیان اور حسنِ کلام کو خود اپنے وجد پر ناز ہونے لگتا ہے اور سننے بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہاں زبان

اسے کہتے ہیں بیاں یہ ہوتا ہے ترکیب اور بندش اس کا نام ہے، اسلوب بدیع اور انداز دل آویز اسے کہتے ہیں۔ سنیئے:

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمینِ قمر!
نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا آنچل لے کر
چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

اس قصیدہ خوانی کے بعد، پھر اپنا اور حسن کا ربط بتاتے ہیں:

ہے مرے باغِ سخن کے لیئے تو بادِ بہار
میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار!
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں!
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا!

سوال

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ ناؤ نوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

(۲۳)

اقبال

تعلی اور خود ستائی سے ہٹ کر بھی، کبھی کبھی شاعر اپنے بارے میں اظہارِ خیال کرتا ہے۔ خاص طور پر اقبالؔ اپنی ذات سے متعلق جب کچھ کہتے ہیں تو اس میں تعلی اور خود ستائی بہت کم ہوتی ہے۔ حقیقت اور بیانِ واقعہ کا رنگ زیادہ نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ انھوں نے "عاشقِ ہرجائی" کے عنوان سے جو طویل نظم لکھی ہے وہ ہمارے دعوے کا بہترین ثبوت ہے۔

اس نظم میں پہلے ایک معترض، اقبالؔ کے کردار وصفات پر، ذات اور سیرت پر، شخصیت اور رفتار و گفتار پر فکر و عقیدہ پر قول و عمل پر اعتراض کرتا ہے اور چُن چُن کے نقائص نکالتا اور عیوب بیان کرتا ہے، پھر اقبالؔ اس بلندی پر کھڑے ہو کر، جو ہمیشہ اونچی ہی ہوتی رہی ایک مہلک کر کے اپنے معترض کو جواب دیتے ہیں اور بڑی آسانی سے اسے لاجواب کر دیتے ہیں،

" معترض کے سارے اعتراضات سننے کا تو وقت آپ کہاں سے

لائیں گے، لیکن چند شعر بہر حال سن لیجیے۔ کتنا عاجز آکر کہتا ہے:

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبالؔ تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

یہی نہیں بلکہ

تیرے ہنگاموں سے اے دیوانۂ رنگیں نوا!
زینتِ گلشن بھی ہے، آرائشِ صحرا بھی ہے

اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ:

ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعتِ پرواز سے
اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے

اس ستم ظریفی پر معترض کو حیران و پریشان ہونا ہی چاہیے تھا۔

عین شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے

جانبِ منزل رواں بے نقشِ پا مانندِ موج
اور پھر رفتار مثلِ ساحلِ دریا بھی ہے
حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لئے
پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب
اے تلوّن کیش، تو مشہور بھی رسوا بھی ہے

اقبالؔ، بڑے صبر و ضبط سے کام لیتے ہیں اور یہ سارے اعتراضات بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ہنس ہنس کر سنتے رہے لیکن انھیں تسلیم نہیں کرتے، اور تسلیم کریں بھی کیوں جب کہ ان کے پاس ہر اعتراض کا شافی اور کافی جواب بھی موجود ہے۔

معترض کے یہ سارے اعتراضات سننے کے بعد وہ بڑی نرمی اور ملائمت سے اُسے مخاطب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں جناب آپ اس حقیقت کو کیا جانیں کہ:

دل نہیں شاعر کا ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر تجھ کو درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں؟

کہتے ہیں میں ان حسینوں سے محبت نہیں کرتا حسن سے کرتا ہوں۔

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حُسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

یعنی حسینوں سے رشتۂ ارتباط ٹوٹ سکتا ہے حُسن سے نہیں ٹوٹ سکتا۔

معترض صاحب کو ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اقبالؔ کا عشق بے پروا ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز
سوز و سازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں
فیضِ ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب

تشنۂ دائم ہوں، آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

معترض صاحب نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک سے ایک اعتراض کیا تھا۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگی کہ اس سلسلہ میں اقبال خود ہی ان کی مدد کریں گے، یعنی ان کے اعتراضات کی فہرست میں ایک نہایت سخت اور سنگین اعتراض کا اضافہ کردیں گے، کہ آپ تو صرف یہی کچھ فرما رہے تھے، میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس اعتراض تک آپ کو پہنچائے دیتا ہوں، جہاں تک کسی طرح آپ کی طبع رسا پہنچ ہی نہیں سکتی تھی، آپ کو مجھ سے جو گلہ ہے وہ اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے بہت ہلکا ہے۔ میں تو اس سے کہیں بڑا مجرم ہوں جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے۔

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا!
نقش ہوں، اپنے مصوّر سے گلہ رکھتا ہوں میں

اور لیجیے:

محفلِ ہستی میں جب اتنا تنک جلوہ تھا حسن!
پھر تخیل کے لیئے لا انتہا رکھتا ہوں میں؟

دیکھ لیا آپ نے؟ بات شروع کہاں سے ہوئی تھی اور پہنچی کہاں؟ آغازِ کلام ہوا تھا نمودِ حسن سے اور بات ختم ہوئی حسنِ ازل پر!

(۴۴)

خندہ وگریہ

خوشی کا کیف عارضی ہے۔ غم کا کیف مستقل، قہقہہ اُٹھتا ہے، اور فضا میں گم ہوجاتا ہے، آنسو گرتا ہے اور زمین میں جذب ہوجاتا ہے، وہ فضا میں گم ہوکر، فنا کی گود میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جاتا ہے۔ یہ زمین میں جذب ہوکر، جاں جاوداں حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حساس اور دَرد مند لوگوں کو قہقہہ میں وہ لطف نہیں آتا، جو کیفیت اشکِ سوزاں میں محسوس ہوتی ہے۔ شاعر سے بڑھ کر حساس اور دَرد مند کون ہوگا۔ اسے خندہ نہیں بھاتا۔ گریہ پسند آتا ہے۔

اسی کیفیت کو اقبال نے ایک نظم میں بڑے دل میں اتر جانے والے اسلوب سے بیان کیا ہے۔

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش
جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار!
جس کے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار

محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت
اور منت کشِ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ امیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی

لیکن اس کے باوجود:
مگر آتی ہے نسیمِ چمنِ طور کبھی!
سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی
وہ ہوائے نفسِ حور کیا ہے؟
جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

مغربی جمہوریت

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایت و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

---

(۲۵)

روزگار انسان

انسان کی فطرت "کیوں"؟ "کیا"؟ اور "کیسے"؟ ہے، جب کوئی چیز
اس کی نظر سے گذرتی ہے فوراً اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے یہ کیا ہے؟
کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ لیکن انسان کا عالم یہ ہے کہ وہ سمندر کی تہہ میں
پہنچ جاتا ہے، آسمان تک پرواز کرلیتا ہے، لیکن فطرت کے سربستہ
رازوں کی نقاب کشائی اب تک نہیں کرسکا۔ قدرت نے ایک طرف اسے
ذوقِ آگہی دیا ہے۔ دوسری طرف معرفت کے تمام دروازے اس پر بند
کردیئے ہیں، ایک طرف وہ، اس دنیا کو دیکھتا ہے اس کے کارخانے کو
دیکھتا ہے۔ اس کے نظام کو اور اس کے استحکام کی طرف دیکھتا ہے۔ دوسری
طرف علم کے دروازے سے سر ٹکرا کر واپس آجاتا ہے، اللہ تک رسائی نہیں
ہوتی۔ بھید نہیں کھلتے۔ اسرار کا پردہ برقرار رہتا ہے۔ انسان ناکام نہیں ہوتا،
یہاں آکر بے بس ہوجاتا ہے۔ قدرت کے سامنے اس کی کچھ نہیں چلتی۔ یہاں
تک کہ وہ اپنے آپ کو ہیچ اور ناکارہ سمجھنے لگتا ہے۔ ایک عقدہ بھی حل نہیں کرپاتا۔

اقبالؔ ایک شاعر اور ایک حکیم کی حیثیت سے کارخانۂ قدرت اور اس کے اسرار و رموز پر غور کرتے ہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ غور کرتے ہیں یہ نسیم سحر کیا ہے؟ یہ بادِ صرصر کیوں ہے؟ دریا کی یہ روانی، سمندر کا یہ تلاطم، کس نظام کے ماتحت ہے؟ یہ ابر، یہ موسم برشگال، یہ اس کی رعنائیاں کیسے ہیں؟ کس طرح ہیں؟ یہ تارے اور سیارے کیا ہیں؟ ان کے پاؤں میں گردشِ پرکار کس طرح لگی ہے کہ یہ

زندانِ فلک میں پا بہ زنجیر

ہو کر رہ گئے ہیں؟ اور یہ سورج، یہ عابد سحر خیز جس کی روشنی سے دنیا قائم ہے، جس کی حرارت سے دنیا میں نمو اور تازگی ہے، جو ہر روز نہایت پابندیٔ وقت کے ساتھ مغرب کی وادیوں میں چھپ کر:

پیتا ہے مے شفق کا ساغر

یہ کیا ہے؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ نوعیت کیا ہے؟ نظام کیا ہے؟ اتنی بڑی طاقت، کس طرح، اتنی پابند ہے کہ اس کی رفتار میں انچ کا کروڑواں حصہ بھی فرق نہیں آتا۔ اس کے اوقات میں سکینڈ کا کروڑواں حصہ بھی ادھر سے اُدھر نہیں ہوتا۔ ایک بے بس معمول کی طرح، یہ کیونکر مصروفِ خرام ہے اور وہ کون سی منزل ہے جس کی طرف سیارگانِ فلک، ماہِ تمام، خورشیدِ عالمتاب، رواں دواں، بڑھے چلے جا رہے ہیں؟

شاعر اس معمّہ کو حل کرنے کی جتنی کوشش کرتا ہے، اتنا ہی ناکام ہوتا ہے، کامیابی کی منزل دور تر ہوتی چلی جا رہی ہے، لیکن اس ناکامی میں وہ تنہا نہیں ہے،

دنیا کے بڑے بڑے حکیم اور فلسفی، اس راز کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ ساری زندگی اس عقدہ کشائی میں صرف کر دی، مگر کامیاب نہ ہوئے، آخر یہ راز کبھی کھل بھی سکے گا یا نہیں؟ آخر قدرت کی اس ستم ظریفی پر وہ صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔

انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا

پھر، وہ اس نظامِ قدرت کی ناقابلِ فہم، محویہ کاریاں بیان کرنے کے بعد کہتا ہے اور گویا حقیقت تک پہنچ کر کہتا ہے، کیفیت تو یہ ہے کہ:

لذّت گیرِ وجود ہر شئے
سرمستِ نمود ہر شئے

مگر ــــ!

کوئی نہیں غمگسارِ انساں
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

انسان کی بے بسی کی یہ کتنی سچی تصویر ہے۔

(۲۶)

آنسوؤں کے تارے

جلوت وخلوت، ہر ایک کا رنگ الگ الگ ہے، جو بات جلوت میں ہے وہ خلوت میں نہیں۔ بزم وانجمن کی رونق۔ اپنی جگہ مسلّم لیکن تنہائی قلب میں، جو سکون، جو لذت، اور جو یکسوئی ہے، اس کا بھی جواب نہیں۔

شاعر کو انجمن میں وہ لطف نہیں آتا، جو تنہائی میں آتا ہے انجمن کی ہنگامہ آرائیاں، شور ہاؤ ہو اس کی یکسوئی فکر میں خلل انداز ہوتا ہے، اگر انجمن میں بیٹھتا ہے تو تنہا۔ اس کا جسم انجمن میں ہوتا ہے، دل کہیں اور ـــــ یہی بات اقبالؔ اپنے دل کو سمجھاتے ہیں۔

رات کا وقت ہے، بزم شبینہ کی نشاط افروزیاں قائم ہیں۔ مے کدہ میں شور نوشانوش بلند ہے۔ گھروں میں چہل پہل اور رونق کی کیفیت ہے، لیکن شاعر ان تمام ہنگاموں سے دور ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہے۔ دل میں مجلس آرائی کی امنگ اٹھتی ہے، وہ دل کو سمجھاتا ہے، تو اپنے آپ کو

تنہا کیوں محسوس کرتا ہے؟ کیا بزمِ انجم تیری دلچسپی کے لئے کافی نہیں؟

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا؟
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟

اور ذرا دیکھ تو، یہ سکوت، یہ خاموشی کوئی بری چیز نہیں

یہ رفعتِ آسمانِ خاموش
خوابیدہ زمیں، جہانِ خاموش

ہر وہ چیز خاموش ہے، جس میں بلندی ہے، رفعت ہے، لیکن یہ خاموشی بھی اپنے اندر ایک تکلم رکھتی ہے، اور دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔

یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار!
فطرت ہے تمام نسترن زارِ ما!

اور اس ذرا کے لئے، اس نسترن زار سے بھی قطع تعلق کر لے۔ کیا آنسوؤں سے بڑھ کر بھی کوئی رفیق ہو سکتا ہے؟

موتی خوش رنگ پیارے پیارے
یعنی ترے آنسوؤں کے تارے

ان سب پر تو قناعت کیوں نہیں کرتا، آخر،

کس شئے کی تجھے ہوس ہے اے دل؟
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل؟

جب قدرت تری ہم نفس ہے پھر بزمِ غیر کی طرف تو کیوں مائل ہوتا ہے؟

---

(۲۷)

قصۂ ایامِ سلف

اسلام سے اقبال کو والہانہ تعلّقِ خاطر تھا، اور اسی تعلّقِ خاطر نے انھیں عرب قوم کا بھی دیوانہ کردیا تھا، وہ جب اور جہاں، عربوں کے آثار و نقوش دیکھتے تھے، تڑپ جاتے تھے، خود روتے تھے، دوسروں کو رُلاتے تھے، ان کی چشمِ تصوّر کے سامنے، وہ بادیہ نشین قوم آجاتی تھی، جو اسلام قبول کرنے سے پہلے کچھ نہ تھی اور اسلام قبول کرنے کے بعد، ارض و سما کی مالک بن گئی، قبل الاسلام اس کی یہ حالت تھی کہ وہ قبائل میں بٹی ہوئی تھی، عاداتِ رذیلہ کا شکار تھی، جُوا، شراب، زنا، قتل و غارت، کشت و خون یہ اس کی زندگی کا روز مرّہ تھا، لیکن اسلام کے بعد اس کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا، وہی قوم، اب ایک خدا کی کلمہ گو بن گئی۔ اپنے بت، اپنے ہاتھوں سے اس نے توڑ دیئے اور اس جذبۂ توحیدِ الٰہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے سوا ہر طاقت و قوت سے وہ بے پروا اور مستغنی ہو گئی، اس نے روما کا تختہ الٹ دیا۔ پھر اس کی شہنشاہت کا صفایا کردیا، اس نے سمندر کھنگال ڈالے، اور دور دراز ملکوں پر اپنی عظمت اور

شوکت کا پرچم لہرایا، حدیہ ہے کہ وہ یورپ کے حدود میں داخل ہوئی اور یہاں بھی اس نے کئی سو برس تک جاہ وجلال، اور دبدبہ کے ساتھ حکومت کی، وہ اندلس (اسپین) میں پہنچی اور وہاں کے لوگوں کو ایک نئی تہذیب سے آشنا کیا، یہ تہذیب ہر اعتبار سے بہتر اور برتر تھی، لوگوں نے جوق در جوق اور فوج در فوج اور موج در موج اسے قبول کیا، اس کے من چلے سورما سسلی (صقلیہ) پہنچے اور اطالیہ کے اس جزیرہ پر، جہاں صرف بت پرستی ہوتی تھی، انھوں نے مسجدیں تعمیر کیں، محل بنائے، خانقاہیں تیار کیں اور ایسا نظام حکومت دیا جس نے وہاں کے لوگوں کو امن وسکون کی وہ دولت دے دی جس سے وہ مدتِ دراز سے محروم چلے آرہے تھے، جب تک عرب، صقلیہ میں فرماں روا کی حیثیت سے رہے، وہاں امن برستا رہا، وہاں کا معیار زندگی اونچا ہوگیا۔

لیکن زمانہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا، حالات بدلتے رہتے ہیں، عروج وزوال اور اقبال وادبار کا چکر چلتا رہتا ہے، آج ایک قوم سریر حکمرانی پر متمکن ہے، اور دوسری قوم اس کی غلامی کر رہی ہے، کل ایسا انقلاب آیا کہ حکمراں غلام بن گئے اور غلاموں نے حکمرانوں کی زندگی اختیار کر لی۔ جو مالکِ تاج ودیہم تھے، ان کے گلے میں غلامی کی رسّی پڑ گئی اور جو ایک در سے دوسرے در تک غلام کے رُوپ میں پہنچے، اور مشقت کی زندگی بسر کرتے رہتے تھے۔ ان کے سر پر تاجِ شہریاری زیب دینے لگا، قوموں کی زندگی میں اس طرح کے انقلابات آئے دن آتے ہی رہتے ہیں، یہ نہ ہو تو کارخانۂ قدرت

کی یکسانیت سے لوگ اُب جائیں اور غلط کار قوموں کو قدرت کی طرف سے سزا نہ مل سکے اور نیکو کار قومیں، انعام نہ پا سکیں، یہی بات قرآنِ مجید کے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

تلک الایام نداولها بین الناس

اس مفہوم کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے:

پردہ داری می کند بر قصرِ کسریٰ عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

اقبال و ادبار اور عروج و زوال کا یہ دور مسلمانوں پر بھی گذرا۔ وہ مسلمان، جو حاکم اور کشور کشائی کی حیثیت سے سسلی (صقلیہ) میں داخل ہوئے تھے، اور جنہوں نے ایک عرصۂ دراز تک وہاں جاہ و جلال اور حشمت و تمکنت کے ساتھ حکومت کی۔ اپنی کمزوریوں، سازشوں اور غفلت پرستیوں کے باعث وہاں سے نکال دیئے گئے۔

کسی قوم کا آنا اور کسی قوم کا جانا، یہ واقعہ اتنا عبرت انگیز نہیں ہوتا، جتنا یہ واقعہ کہ ایک نئی قوم آئے اور آنے کے بعد جانے والی قوم کے آثار و نقوش کے ساتھ وہ سلوک کرے جو میدانِ جنگ میں دشمن کے سپاہی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ مسلمان، باہمی سازشوں، مخالفتوں اور دراندازیوں کے باعث وہاں نہ رہ سکے۔ انہیں رختِ سفر باندھنا پڑا، اور وہ صقلیہ (سسلی) کے حدود سے نکل کر مغرب و اقصیٰ میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن، تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد فاتح قوم نے ان کے ساتھ، ان کی قوم کے ساتھ، ان کے آثار و نقوش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

خود فرنگی مؤرخین نے اس بات کو شرم و ندامت کے ساتھ تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں کے چلے جانے کے بعد فاتح قوم نے بڑا عجیب رویہ اختیار کیا، جسے نہ انسانیت سے کوئی سروکار تھا، نہ شرافت اور معقولیت سے، اس رویہ کو صرف وحشیانہ اور سفاکانہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں درندگی تھی، بہیمیت تھی، وحشت تھی، اصول، اور شرافت کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہ فرنگی مؤرخین اس اعتراف جرم کے بعد اپنی فاتح قوم کی جو داستان سناتے ہیں وہ بڑی لرزہ خیز ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ مسلمانوں کے سسلی سے چلے جانے کے بعد ان کے شاندار محلات کھنڈر بنا دیئے گئے، وہ محلات جہاں سے ایک نئی اور شاندار تہذیب نمودار ہوئی تھی، اور جس نے سارے سسلی کو انسانیت کی لڑی میں پرو دیا تھا، شاندار مسجدیں ڈھا دی گئیں۔ وہ مسجدیں جہاں سے دن میں کم از کم پانچ بار صدائے توحید بلند ہوتی تھی، جہاں مسلمان اس لئے حاضر ہوتے تھے کہ خدائے واحد کے حضور میں سر بسجود ہوں اور ان مسلمانوں میں ہر ملت، ہر قوم ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ موجود تھے اس لئے کہ اسلام دوسرے اقوام عالم کی طرح، ذات پات اور رنگ و نسل کا قائل نہیں تھا۔ اس کی مسجد کا دروازہ ہر مسلمان کے لئے کھلا رہتا تھا خواہ وہ حبشی ہو یا عرب، ہندی ہو یا ترک، مغربی ہو یا

مشرقی، آقا ہو یا غلام، یہ سب آتے تھے اور صف بستہ ہو کر خدائے حی و قیوم کے آستانہ پر سر بہ سجدہ ہو جاتے تھے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

خانقاہیں مسمار کر دی گئیں، جہاں لوگ قیام فرماتے تھے جنہیں دنیا سے دنیا والوں کے ایہام طمطراق اور جاہ و جلال سے، دنیا کی دولت و ثروت، مقام و منزلت، منصب اور قیادت، وزارت اور بادشاہت کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ ہزارہا ہزار مسلمان عیسائی بنا لیے گئے، یہ وہ مسلمان تھے، جنھوں نے ساری زندگی خدائے واحد کی پرستش میں گزاری تھی اور اب حالات سے مجبور ہو کر یہاں رہ رہے تھے، ان کے سامنے دو صورتیں رہ گئی تھیں، یا عیسائی ہو جائیں ورنہ قتل منظور کریں۔ یہ عیسائی بننے پر مجبور ہو گئے، حالانکہ اپنے دورِ حکومت میں انھوں نے کسی عیسائی، کسی غیر مسلم کو جبراً مسلمان نہیں بنایا تھا، کسی غیر مسلم کے ساتھ غیر رُوادارانہ برتاؤ نہیں کیا تھا۔ ان کے عہدِ حکومت میں ہر شخص کو عقیدہ اور خیال کی آزادی تھی کسی طرح کی پابندی اس پر نہیں تھی جن لوگوں کو مسلمان فاتحوں نے یہ آزادی دی تھی انہی لوگوں نے حکومت کی تلوار ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہ آزادی چھین لی اور وہ بھی دوسروں سے نہیں اپنے سابق آقاؤں سے، ہزاروں عورتیں جبراً عیسائی بنائی گئیں اور انہیں مجبور کیا گیا کہ اپنے مسلمان شوہروں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو فراموش کر کے عیسائی کنبہ میں، عیسائی شوہروں

کی بیوی بن کر رہیں، حالانکہ مسلمانوں کے طویل دورِ حکومت میں، ایسا ایک واقعہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی غیر مسلم عورت کو مسلمان بننے پر یا مسلمان شوہر کی بیوی بننے پر یا غیر مسلم شوہر سے ترکِ تعلق کرنے پر مجبور کیا گیا ہو، لیکن اب ایسا ہوا، اور یہ کرنے والے وہ لوگ تھے جن پر اس طرح کا کوئی حادثہ نہیں گزرا تھا اور جن کے ساتھ یہ زیادتی کی جا رہی تھی، یہ وہ لوگ تھے جن کا دامن اپنے دورِ فرمانروائی میں اس دھبّہ سے بالکل پاک اور صاف تھا۔

آج سسلی (صقلیہ) میں جائیے، وہاں مسلمانوں کے لگائے ہوئے درخت اب بھی ملیں گے جنھوں نے سارے انقلابات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا بنایا ہوا کوئی محل نظر نہیں آئے گا۔ کوئی مسجد دکھائی نہیں دے گی۔ کوئی خانقاہ، کھنڈر کی صورت میں بھی موجود نہیں۔ کوئی حمام، آثارِ قدیمہ کے طور پر بھی، دستیاب نہیں ہو سکتا۔ سارے جزیرہ کا چکر کاٹ لیجیے، بام و در، کوچہ و بازار، باغ و چمن، لبِ جو اور کنارِ ساحل ہر جگہ پہنچ جائیے، خواہ دوربین سے کام لیجیے، خواہ خوردبین سے آپ کو سب کچھ نظر آئے گا۔ آپ سبزۂ زمرّدیں کا نظارہ کر سکیں گے۔ آپ گل و رعنا کے دیدار سے شادکام ہوں گے آپ سرو سمن دیکھیں گے، نسرین و نسترن کا نظارہ کریں گے، حسنِ رہ گذر کی جلوہ سامانیاں دیکھیں گے۔ شکوہِ حکومت کے مناظر آپ کی آنکھوں کے سامنے سے گذریں گے۔ بڑے بڑے گرجا اور کلیسا آپ ملاحظہ فرمائیں گے اور ان میں سے متعدد وہ ہوں گے جو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں موجود تھے، اور مسلمانوں نے جن کی رکھوالی کی تھی، ننوں اور

پادریوں کی وہ خانقاہیں بھی آپ کے پیشِ نگاہ ہوں گی جنہیں مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں کبھی نہیں چھوا، اور ان پر عقیدہ نہ رکھتے ہوئے بھی ان کے تقدّس اور اجلال میں کسی طرح کا فرق نہیں آنے دیا۔

لیکن اس سارے جزیرے کے طول و عرض میں ایک چیز بھی آپ کو ایسی نظر نہیں آئے گی جو مسلمانوں کے عہد سے تعلق رکھتی ہو، جسے دیکھ کر مسلمان یاد آجاتے ہوں جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ جب مسلمان یہاں حکمران تھے، یہ اس عہد کی نشانی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے، بدنام مسلمان ہیں کہ وہ اپنا مذہب تلوار کے زور سے پھیلاتے رہے ہیں اور درحقیقت یہ کارنامہ عیسائیوں کا ہے۔ عیسائیوں نے بت پرستی کا استقبال تلوار کے زور سے کیا اور اپنا مذہب جبراً روم کی آبادی پر ٹھونسا۔ اسپین میں عیسائی یہودیوں کو جبراً عیسائی بنا لیتے تھے یا جلاوطن کر دیتے تھے۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ عیسائیوں کے یہ سارے غیر فانی کارنامے لکھے مسلمانوں کے نامۂ اعمال میں گئے ہیں۔

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

نوجوان اقبالؔ، دیارِ مغرب کے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔ رات کا وقت ہے، سامنے دُور، اسے کچھ ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آتی ہیں، جہاز یہاں رکتا نہیں ادھر سے گذرتا چلا جاتا ہے۔ اقبالؔ کسی ہم سفر سے دریافت کرتا ہے

"یہ کون سا مقام ہے؟"

ہم سفر جواب دیتا ہے۔

"سِسلی" ــــ!

ہم سفر یہ کہہ کر جہاز کی دنیائے رنگ و بو میں کھو جاتا ہے، رقص، قہقہہ بے تکلفی، عشوہ فروشی ــــ اور اقبال، یہ سُن کر جہاں بیٹھا تھا بیٹھا رہ جاتا ہے۔ جہاز چل رہا ہے۔ یا ڈوب رہا ہے یا ساکن ہے؟ اس کی اسے کوئی پروا نہیں۔ جہاز کے لوگ رقص کر رہے ہیں۔ یا نغمہ سرائی میں مصروف ہیں، اس سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ جہاز کے روشن اور تاریک، آباد اور ویران حصّوں میں، ہجر و وصل کی داستانیں کس طرح دہرائی جا رہی ہیں، اقبال کو اس کی بھی فکر نہیں، اس کے وطن میں، اس کے گھر پر کیا ہو رہا ہوگا۔ اس وقت؟ وہ یہ بھی نہیں سوچتا اس کے وہ دوست جن کے ساتھ اس کے اوقات صبح و شام بسر ہوتے تھے، جہاں کر وہ فرصت کے لمحات صرف کرتا تھا، اس وقت کس دُھن میں ہوں گے؟ اقبال کا اس طرف خیال ہی نہیں جاتا۔

وہ خاموش بیٹھا ہے!

اور اس کی چشمِ تصوّر اپنا کام کر رہی ہے!

اس کی نگاہِ تصوّر کے سامنے وہ دَور ہے، جب اس جزیرہ پر اسلام کا پرچم لہراتا تھا۔ جب عرب یہاں حکمران تھے جب یہاں کے تہذیب نا آشنا لوگوں کو پہلے پہل تہذیب اور مدنیت سے روشناس کیا گیا تھا جب یہاں مسجدیں تھیں اور وہاں سے اللہ اکبر کی صدائے دل نواز دن میں پانچ مرتبہ بلند ہوتی تھی۔ جب یہاں خانقاہیں تھیں، اور وہاں ذکر و فکر کے حلقے قائم تھے۔

جب یہاں عرب طرز تعمیر کے حامل، شاندار، اور پرشکوہ محلات تھے، جہاں وقت کی حکمران، — مسلمان قوم — دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی۔ جب یہ سمندر جس پر آج یہ جہاز چل رہا ہے فرنگیوں کے تصرف سے بالاتر تھا۔ یہاں اس قوم — مسلمان — کی کشتیاں چلا کرتی تھیں، جہاز دوڑا کرتے تھے اور اس کا سینہ چیر کر منزل مقصود تک پہنچا کرتے تھے۔

دنیا کی یہ قومیں جو آج سربلند نظر آ رہی ہیں جنھوں نے دنیا کے بہت بڑے حصہ پر اپنی شہنشاہیت اور قیصریت کا تسلط قائم کر رکھا ہے، جاہل تھیں۔ وحشی تھیں۔ نیم خواندہ تھیں۔ غیر مہذب تھیں یسلمانوں نے یہاں آ کر علم کی روشنی پھیلائی، تہذیب کا دیا جلایا، انسانیت کی شمع روشن کی، اخوت اور مساوات کی نعمت عطا کی، اقدار انسانی کو روشناس کرایا۔ توحید کی تبلیغ کی، لیکن مذاہب غیر کے ماننے والوں پر نہ کسی قسم کی زیادتی کی۔ نہ کسی طرح کا جبر، لیکن کیسی عجیب بات ہے مسلمانوں کے زوال پذیر ہوتے ہی اصاقوام فرنگ کے برسر اقتدار آتے ہی، حالات کا نقشہ یکسر بدل گیا — جو عیب تھا وہ صواب بن گیا، جو صواب تھا وہ عیب قرار پایا۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یہ مہذب قومیں، جو اپنی تہذیب و حضارت کا ڈنکا اتنے زور سے پیٹتی ہیں کہ کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ ان کا احتساب کیجیے، تو معلوم ہوگا، ان سے بڑھ کر جابر، سفاک، اور درندہ خو کوئی نہیں اور وہ

مظلوم ــــ مسلمان ــــ قوم جس سے انھوں نے سب کچھ چھینا، اور مالدار بنے ہیں، اپنے دَورِ حکومت میں کتنی صالح نیک، انسانیت دوست اور انسان نواز تھی۔

جہاز کی چہل پہل جاری ہے۔!

رات گزرتی چلی جارہی ہے۔ لیکن اس مختصر سی دنیا میں، جو رونق جو گہما گہمی، جو زندگی، آغازِ شام میں نظر آئی تھی اب اس سے بھی کچھ زیادہ نظر آرہی ہے۔

جہاز سمندر کا سینہ چیرتا آگے بڑھ رہا ہے لیکن شاعر کے خیالات اسے پیچھے بہت پیچھے کئی سو برس پیچھے لئے جارہے ہیں۔ اس کی نظریں اب تک سسلی کا تعاقب کر رہی ہیں۔ آج وہاں کی دنیا بدلی ہوئی ہے۔ لوگ بدلے ہوئے ہیں۔ نسل بدل چکی ہے لیکن اقبال کی آنکھیں آج بھی وہاں مہذب حجازی کے نشانات دیکھ رہی ہیں۔ اس کی نظروں میں ماضی حال بنا ہوا ہے اور وہ وہاں کے بازاروں اور گلیوں میں اب بھی مسلمانوں کو چلتا پھرتا دیکھ رہا ہے ــــ اور آخر ایک ٹھنڈہ سانس لے کر کہتا ہے۔!

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار

وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

اور پھر اس کا یہ نالۂ موزوں، تہذیبِ حجازی کے اس مزار کی ساری تاریخ دہراتا ہے اور تاریخ کے اوراق الٹنے کے بعد وہ کہتا ہے:

نالہ کش شیراز کا بلبل[1] ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں[2] آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

اس جہاز پر کون ہے، جس سے اقبال اپنا دردِ دل کہیں ؟ جسے اپنا ہمراز بنائیں ؟ لیکن نہیں، ہمراز مل ہی جاتے ہیں۔ اقبال نے خود سسلی کو اپنا ہمراز بنا لیا۔

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں ؟
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

---

[1] سعدی شیرازیؒ
[2] دہلی

فرمائش کرتے ہیں:

رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

---

(۲۸)

دیوانگی

اقبال کو خرد سے وہ تعلق نہیں جو دیوانگی سے ہے، انھیں خرد میں سو عیب نظر آتے ہیں اور دیوانگی ان کے نزدیک مجموعۂ اوصاف ہے۔ اگر دیوانگی نہ ہوتی تو کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، کوئی منزل سر نہیں ہو سکتی۔ کوئی معرکہ جیتا نہیں جا سکتا، خرد تو قدم قدم پر مشکلات پیدا کرتی ہے، روڑے اٹکاتی ہے اس کا این و آں اور چناں و چنیں۔ بنے ہوئے کام کو بگاڑ دیتا ہے۔ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ پیرہن جہاں جہاں سے دریدہ اور شکستہ ہو گیا ہے اسے رفو کر لیا جائے، سی لیا جائے، لیکن دیوانگی کہتی ہے۔ سرے سے پیرہن کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دیوانگی کی یہ ادا اقبال کو اتنی محبوب ہے کہ وہ خدا سے دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ اس عقل زیاں اندیش کو تھوڑی سی دیوانگی کی نعمت عطا فرما دے تا کہ یہ کام کی بن جائے۔

الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سر پیرہن نہیں ہے

سوزِ محبت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ملا محبت کا سوز مجھ کو تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے

لیکن یہ وہ باتیں ہیں، جو دوسروں کی سمجھ میں مشکل ہی سے آسکتی ہیں، اور اس دنیا کے لوگ ان باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس، ناآشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

میں اور تو

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ہو
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویراں تمام
تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو
پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو
چشمِ کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو خلوتیوں کے کدو

(۲۹)

پیمانِ رنگ و بو

اقبالؔ کی نظر وسیع ہے، دل فراخ ہے، خیالات عمیق ہیں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے دوسروں کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی، اس کے دل میں جتنی گنجائش ہے دوسرے اس سے یکسر محروم ہیں، اس کے خیالات جتنے گہرے ہیں، دوسروں کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ وہ اس دنیا کا رہنے والا ہے۔ اس دنیا کے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

با ہمیں مردماں بباید ساخت

لہٰذا مجبور ہے، جو کچھ دل میں آئے اسے آسان سے زیادہ آسان اور عام فہم الفاظ میں زباں تک لے آئے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی نہ سمجھ سکے، تو اس بت سے خدا سمجھے۔

اقبالؔ کوشش کرتے ہیں کہ خاموش رہیں، دل میں خیالات وجذبات کا جو تلاطم اٹھ رہا ہے اسے روک کے رکھیں لیکن کامیاب نہیں ہوتے،

طوفان جب مچلتا ہے تو اپنی جگہ نکال ہی لیتا ہے۔

اپنی خاموشی کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

زبانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

لیکن اس مزار سے "قم باذنی" کہہ کر جب وہ اپنے خیالات کو دعوتِ نمود دیتے ہیں تو وہ ابھرتے ہیں اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ کارسازِ عالم سے گلہ کرتے ہیں۔

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا!

اور اس نگار خانۂ آرزو کا مشاہدہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

اگر کوئی شئے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا

یہ نظارے کی تمنا اور سودائے جستجو، یقیناً کسی کی تلاش میں ہے لیکن کس کی؟ یہ میں بھی نہیں جانتا اور کوئی بتاتا ہی نہیں، پھر سوچتے ہیں، یہ تمنا اور جستجو کہیں فریب خوردگیٔ آرزو تو نہیں؟ ڈرتے ڈرتے خدا سے کہتے ہیں۔

بپاسِ شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

نوائے سحر

کیا عجب میری نوا ہائے سحرگاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے
توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

(۳۰)

آہِ شرر فشاں

قوم کی بے بسی اور مجبوری، غفلت اور خود فراموشی، غلامی اور خوئے غلامی، ادبار و انحطاط اور تباہی و بربادی نے اقبالؔ کا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، ان سے یہ حالت نہیں دیکھی جاتی مگر دیکھتے تھے۔ زندگی کا کون سا شعبہ ایسا تھا، جس میں مسلمان، پس رو اور تہی دامن نہ ہوں؟ علم کے میدان میں سب سے پیچھے تھے، تجارت اور کاروبار میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا، دولت و ثروت سے وہ محروم تھے۔ ایجاد و تخلیق کا مادّہ ان میں نہیں رہا تھا۔ جدّت اور تعمیر کے جذبے سے وہ عاری ہو چکے تھے، اور ان سب خامیوں پر مستزاد غلامی ـــ ایک غیر قوم کی غلامی نے ان کے قوائے عمل شل کر دیئے تھے، وہ زندہ تھے لیکن مردوں سے بدتر، نہ امنگ تھی، نہ امنگ، نہ حوصلہ، نہ ولولہ، جو رہزن، رہنما کے بھیس میں سامنے آتا تھا اس کے ساتھ ہو لیتے تھے۔ اس کو کعبۂ مقصود اور قبلۂ آرزو سمجھنے لگتے تھے۔

قوم اگر ادبار زدہ ہوتی ہے، اس کے حالات دگرگوں ہوتے ہیں، اس

میں کمزوریاں اور خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو اس میں کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرتے ہیں، جو اسے جوشِ پیکار سے آشنا کرتے ہیں، جو ایثار و قربانی کا نمونہ پیش کر کے ساری قوم کو ایثار پیشہ بنا دیتے ہیں۔ اس کی کمزوریوں کو رفع کرتے ہیں۔ اس کی کوتاہیاں دُور کرتے ہیں اس کے نقائص کی اصلاح کرتے ہیں۔ اس میں خود شناسی اور خود نگری کا جوہر اجاگر کرتے ہیں اور از منہ رفتہ اسے ایک ناقابلِ تسخیر قوم بنا دیتے ہیں۔

بدقسمتی سے اقبال کی قوم کو یہ بات بھی حاصل نہیں تھی۔ رہنما تھے، لیکن مخلص کم منافق زیادہ، رہبروں کی بھی کمی نہیں تھی لیکن اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھنے والے بہت زیادہ تھے اور قوم پر جان دینے والے بہت کم، قائدوں کا پورا گروہ تھا، لیکن یہ وہ لوگ تھے، جو قوم قوم پکارتے تھے اور جب چیختے چیختے ان کا گلہ پڑ جاتا تھا اور انہیں کوئی منصب مل جاتا تھا تو قوم کو اس طرح فراموش کر دیتے تھے جیسے جس قوم کو زینہ بنا کر، اوپر چڑھے ہیں اس میں اور ان میں کوئی ایکا نہیں کوئی تعلق نہیں، واعظ بھی تھے، لیکن ان کے وعظ و پند کا موضوع صرف تکفیر ہی تھا۔ علماء تھے انہیں آپس میں لڑنے سے فرصت نہیں تھی، صوفیا تھے، وہ حال و قال کی مجلسوں میں اپنے اوقات عزیز صرف کرتے تھے، بینکر اور ساہوکار بھی تھے لیکن۔

دینِ او آئینِ او سوداگری است

حکومتِ وقت کا اشارہ ہو تو تھیلیوں کے منہ کھول دیں گے۔ قوم کو ضرورت ہو تو جیب پر تالہ لگا لیں۔

اقبال یہ دلدوز اور جگر زنگار منظر دیکھتے تھے اور کڑھتے تھے۔ وہ طرح طرح سے اپنی قوم میں حوصلہ اور امنگیں پیدا کرنا چاہتے تھے، اسے زندگی کی حرارت سے آشنا کرنا چاہتے تھے، لیکن نہ قوم سنتی تھی نہ قوم کے لیڈر اور راہنما، وہ اپنی قوم کو آزاد کرانا چاہتے تھے اسے اقوام عالم میں سربلند کرنا چاہتے تھے، لیکن، نہ قوم کو اس کا احساس تھا، نہ قوم کے ناخداؤں میں یہ جذبہ تھا۔ بارہا ان کے دل میں خیال آیا۔ گوشۂ عزلت ترک کریں اور میدان میں اتر پڑیں۔ لیکن شاعر مردِ میدان نہیں ہوتا، بقول انہی کے وہ قوال ہوتا ہے، حال تو دوسروں کو آتا ہے۔

بہر حال جب یہ چیمن ان کے دل میں ہوتی تھی تو وہ پکار اٹھتے تھے:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں آہ ہوگی میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

آخر میں اپنی کیفیت بتاتے ہیں:

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

یہ ذکر حضورِ شہِ یثرب میں نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

خرماں نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں یافت ازاں پشم کہ رشتیم (سعدی)

(۳۱)

غمِ ملّت

ایک تو قوم کا غم وہ ہوتا ہے جسے اکبر نے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے، مگر آرام کے ساتھ

اور ایک غمِ ملت وہ ہے کہ ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں، نعمتیں موجود ہوں۔ آسائشیں مہیا ہوں، لیکن قوم کی برگشتہ بختی اور آشفتہ روزگاری ہر عیش کو مکدر کر دے، ــــ اقبال جس غمِ ملت میں گرفتار تھے وہ اسی قسم کا تھا۔

اگر ان کے سامنے صرف ذاتی سربلندی ہوتی تو واقعی وہ عیش و تنعّم کی زندگی بسر کر سکتے تھے، لیکن وہ ان لوگوں میں تھے جو خود تباہ ہو جانا پسند کرتے ہیں لیکن ملت اور قوم کی بربادی نہیں دیکھ سکتے۔ ان کے پیشِ نظر اپنی سربلندی نہیں ہوتی۔ ملت کی سربلندی ہوتی ہے وہ کبھی اور کسی قیمت پر

ملت کا سودا نہیں کرسکتے۔ ان کی زبانِ حال، اور زبانِ عمل پر صرف ایک ہی ترانہ رہتا ہے

من و تو گرفتار شدیم چہ باک
خرمن اندر میاں سلامت اوست

زندگی اپنی پوری رعنائیوں اور تابانیوں کے ساتھ ان کے حضور میں موجود تھی۔ ان کے دوستوں، اور ساتھیوں میں، کوئی ہائی کورٹ کا جج بن رہا تھا، کسی کو القاب وخطاب سے نوازا جارہا تھا، کوئی وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کا ممبر تھا، کسی کو صوبائی گورنر نے وزارت کے منصب پر پہنچا دیا تھا۔ کوئی برطانوی حکومت کا نمائندہ بن کر لندن میں مقیم تھا۔ کوئی جنوبی افریقہ میں۔ کسی کو وائسرائے کی نظرِ عنایت نے کسی ریاست کا وزیرِ اعظم بنا دیا تھا۔ کوئی سرکار دولتِ مدار کی توجہ اور عنایت سے کسی کمیشن کا صدر تھا، اور دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹ رہا تھا۔ اقبال کے لئے بھی یہ دروازے کھلے ہوئے تھے لیکن انھوں نے اس طرف کبھی توجہ نہیں کی۔

آنچہ فخرِ تست آں ننگِ من است

وہ غریب تھے۔ دولت سے محروم تھے، پریشاں حال اور آشفتہ روزگار تھے لیکن مگن تھے، خوش تھے، وہ اپنے اوقات کا ہر لمحہ، صرف قوم کے لئے وقف کئے ہوئے تھے۔ دوسرے روپیہ پیدا کرتے تھے، قوم کا سودا کرکے قوم کو فروخت کرکے یہ ملنگ اور قلندر بنے ہوئے تھے، قوم کی صلاح وفلاح اور

سود و بہبود کے لئے دوسرے اپنی فرصت کے اوقات کلیسا میں، باغ و چمن میں، بزمِ احباب میں، انجمنِ رنداں میں صرف کرتے تھے اور ان کے اوقات کا مصرف صرف یہ تھا کہ قوم کی فلاں گتھی کس طرح سلجھے؟ اور فلاں مصیبت کس طرح دور ہو؟

دوسروں کا عالم یہ تھا کہ ان کے لئے:

ہے رگِ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی
کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی
سینۂ دریا شعاؤں کے لئے گہوارہ ہے
کس قدر پیارا لبِ جو مہر کا نظارہ ہے
محوِ زینت ہے صنوبر، جوئبار آئینہ ہیں
غنچۂ گل کے لئے بادِ صبا آئینہ ہے
رہتی ہے؟ کوئی باغ کے کاشانہ میں
چشمِ انساں سے نہاں پلکوں کے عزلت خانہ میں
اور بلبل مطربِ رنگیں نوائے گلستاں
جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں
عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے

ان روح افزا اور دل آرا مناظر کا قدرتی نتیجہ یہی ہونا چاہئیے تھا کہ

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
وادیِ کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں

لیکن اقبال کا دل، ان باتوں میں نہیں لگتا۔ وہ کسی اور دنیا کے رہنے والے ہیں، ان کی دلچسپی کی چیزیں کچھ اور ہیں، فرماتے ہیں:

شورشِ بزمِ طرب کیا، عود کی تقریر کیا!
دردمندانِ جہاں کا نالۂ شب گیر کیا!
عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا!
خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا!
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں!
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں!

وہ دیکھتے ہیں، اور بہ چشمِ پرنم:

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

دنیا کی اس بے ثباتی اور موت کی اس ارزانی کے بعد ان کا جی کسی کام میں نہیں لگتا۔ انہیں صرف ایک ہی فکر ہے اور وہ فکر ہے قوم کی:

اس تماشا آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم، یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

(۳۲)

ٹوٹ گیا سازِ چمن

شکوہ ــــــ اقبال کی نغمہ خوانی، اور معرکہ آرا نظموں میں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بچہ بچہ کی زبان پر اقبال کا شکوہ تھا، مکتبوں میں، مدرسوں میں، خانقاہوں میں، دانش کدوں میں، علماء کے حلقوں میں، صوفیا کے زاویوں میں، اقبال کا شکوہ ورد زبان تھا اور بات بھی یہی تھی

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ سے خلوص ٹپک رہا ہے، جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ الفاظ کا دبدبہ منہ سے بولتا تھا۔ اس شکوہ میں اقبال نے امتِ مرحومہ کا حالِ زار بڑی تفصیل اور بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اور خدا سے شکایت کی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو کیوں فراموش کر دیا ہے حالانکہ مسلمان اب بھی مسلمان ہی ہیں:

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں

زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

حد یہ ہے کہ یہاں تک کہہ گئے:

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

جوشِ کلام اور روانیِ سخن میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا ہے۔ کلام کی حدت اور تیزی بھی بڑھتی گئی ہے، فرماتے ہیں:

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب؟
تیری قدرت تو وہ ہے جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدہ موجِ سراب
طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے ناداری ہے!
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

مسلمانوں کی زبوں حالی، اور نامسلموں کی کامرانی سے اقبال بہت دل برداشتہ ہیں۔ بار بار اللہ میاں کو اسی طرف متوجہ کرتے ہیں:

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے

سُنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دورِ ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہُو بیٹھے

اپنے پروانوں کو بھی ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگرسوزی دے

غرض بارگاہِ الٰہی میں شکوہ سے فارغ ہو کر اقبال اپنی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اپنے ذہن ودماغ، اور قلب ونظر کی کیفیت بتاتے ہیں اور کوئی شبہ نہیں ان الفاظ میں، ان کی رُوح سمٹ آئی ہے، اور وہ اپنے تأثراتِ دل ودماغ کی تصویر کھینچنے میں پورے طور سے کامیاب ہوئے ہیں:

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمّازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

ظاہر ہے بلبل سے مراد، خود شاعر ـــــ اقبال ـــــ کا نالۂ حرماں ہے۔

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی!
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

اقبالؔ کو اپنی قوم، اور اپنی ملت سے سب سے بڑی شکایت بھی تھی کہ کوئی اس کی فریاد سمجھنے والا نہیں تھا۔

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینہ میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینہ میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینہ میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

اور آخر میں تو انہوں نے جو کچھ کہا ہے اسے رُوح کی زبان سے تو لیئے!

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اس بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لَے تو حجازی ہے مری

پیامِ عشق

سُن اے طلبگار دردِ پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومنات دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا
نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمالِ شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو ادا مثالِ نماز ہو جا!
نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا
گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرانوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمعِ سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا

---

(۴۳)

بڑی دُور ہے منزل میری

رات اس لئے آتی ہے کہ آرام کیا جائے۔ دن کی شورشیں اور ہنگامہ آرائیاں، رات کے نمودار ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ دعوتِ رزم و پیکار ہے اور رات، دعوتِ سکوت و سکون، امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا گدا، سرمایہ دار ہو یا مزدور۔ کوئی بھی رات بھر نہیں جاگتا۔ دن کی کلفتوں کو، رات کے آرام سے دُور کرتا ہے ـــ لیکن نہیں، ایک شاعر ہے جسے رات کو بھی قرار نہیں، دوسرے سوتے ہیں وہ جاگتا ہے، خلقت آرام کرتی ہے وہ کروٹیں بدلتا ہے۔ دنیا نغیر خواب بلند کرتی ہے وہ نالۂ شب گیر میں مصروف ہو جاتا ہے ـــ آخر کیوں؟

خود رات، یہ منظر دیکھتی ہے تو پریشان ہو جاتی ہے۔ ایک طرف وہ دیکھتی ہے اس کا دامن ساری خلقت کے لئے، عام اس کے کہ وہ انسان ہو یا جانور، چرند ہو یا پرند، درندہ ہو، یا پانی میں تیرنے والی مچھلی، پیامِ امن و خواب ہے۔ لیکن ایک شاعر ہے جو اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ دل میں مغموم و پریشان تو رہتا ہی ہے، لیکن رات کے آتے ہی اس کی خلش کچھ اور بڑھ جاتی ہے اس کے اضطراب میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا

ہے، اس کی بے قراری، بے کلی کچھ عجیب رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

آخر رات اسے ضبط نہیں ہو سکتا۔ وہ شاعر کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ وہ باحالِ مضطر یا موئے پریشاں برآمد ہوتا ہے اور دریافت کرتا ہے تو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟

رات پوچھتی ہے:

تو سوتا کیوں نہیں؟ ساری دنیا میرے نمودار ہوتے ہی مستِ خوابِ خرگوش ہو جاتی ہے، ایک تو ہے کہ میرے آتے ہی تیری بے کلی اور بے قراری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، میری چاندنی جب کھیت کرتی ہے تو ادھر ادھر پیکرِ اضطراب بنا ہوا گھومنے لگتا ہے، لیکن:

خاموش صورتِ گل، مانندِ بو پریشاں

میں پوچھتی ہوں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا تو خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا، یہ وہ وقت ہے کہ

دریا کی تہہ میں چشمِ گرداب سو گئی ہے
ساحل سے لگ کے موجِ بیتاب سو گئی ہے

پھر آخر، تیری آنکھیں نیند سے کیوں محروم ہیں؟ تو گرداب سے زیادہ آشفتہ اور موجِ بیتاب سے زیادہ پریشان ہے؟ موج کی سرشت بے قراری ہے، گرداب کی فطرت، اضطراب ہے۔ کیا تو اپنی بے قراری اور اضطراب میں موج اور گرداب سے بھی بڑھا ہوا ہے؟ شاعر خاموشی کے ساتھ، لیلائے شب کی یہ باتیں سنتا ہے اسے افسوس ہے کہ جسے سب سے زیادہ میرا راز داں ہونا چاہیے تھا

وہی سب سے زیادہ میرے حالات سے ناواقف اور لاعلم ہے۔ ایک آہ سرد کے ساتھ وہ رات کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے:

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں
چھپ کے انسانوں سے مانندِ سحر روتا ہوں

صبح کو اٹھ کر لوگ، پھولوں پر، کلیوں پر، شاخ گل پر، یہ شبنم کے قطرے جو دیکھتے ہیں، یہ کیا ہیں۔ یہ صبح کے آنسو ہیں، جو رات کی حکومت میں اس کی آنکھوں سے ٹپکتے ہیں۔ میں بھی اس کی پیروی کرتا ہوں اور جب تو نمودار ہوتی ہے تو اپنا فریضہ پورا کرتا ہوں۔

دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں
عزلتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں

اس دنیا میں کوئی میرا محرم نہیں۔ ہمراز نہیں، رفیق و دمساز نہیں۔ میری غیرت اسے گوارا نہیں کرتی کہ ایسے لوگوں کے سامنے یہ موتی — قطرات اشک — بکھیر دوں جو ان کی قدر و قیمت سے ناواقف ہیں۔ رات کو جب یہ دنیا کے بندے اور غرض کے پتلے، درد سے ناآشنا، اور سوز سے محروم لوگ سو جاتے ہیں لمبی تان کر، تو میں اپنا کام کرتا ہوں۔ تیری چاندنی کے کھیت میں موتی بوتا ہوں۔

مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو!
تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو؟

یہ دنیا سننے والوں اور دیکھنے والوں سے بھری ہوئی ہے مگر نہ یہاں

کوئی ایسا ہے، جو میری تپش شوق کو دیکھ سکے نہ ایسا ہے جو میری آہ و فریاد کا راز داں ہو۔

برقِ ایمن مرے سینہ پہ پڑی روتی ہے!
دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے؟

میرا سینہ برقِ ایمن کی تجلیات کا گہوارہ ہے جو آنکھ تجلی کا نظارہ کر چکی ہو، نہ اسے نیند آسکتی ہے، نہ وہ سو سکتی ہے۔

صفتِ شمع لحد مردہ ہے محفل میری!
آہ اے رات بڑی دُور ہے منزل میری!

شمع لحد جلتی ہے، پگھلتی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔ نہ اسے بادِ صرصر کی پروا ہوتی ہے۔ نہ نسیمِ سحری، نہ اسے بزم و انجمن کی شورشوں سے واسطہ ہوتا ہے، نہ بت کدہ، اور مے خانے کی رونق سے، نہ وہ زاہدِ پیر کلیسا اور برہمن کے کاشانہ میں پہنچ پاتی ہے، نہ کسی بتِ پُرفن، کسی محبوبِ طرار و گلعذار، اور پری رخسار کے بالا خانہ میں اس کا گذر ہوتا ہے، وہ شمع لحد ہوتی ہے،

صرف شمع لحد — !

اور شمع لحد کی تپش کا نظارہ دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا، اس کی فریادِ نہاں سُننے والا کوئی نہیں ہوتا۔

یہی حال میرا ہے، — شمع لحد کی طرح میری محفل بھی ویران ہے سنسان ہے، خاموش ہے، نہ اس میں شورِ ہاؤ ہو ہے۔ نہ شور نوشا نوش اور میں ان سب سے بے نیاز بھی ہوں، میری منزل بہت دور ہے اور اسی خاموشی کے ساتھ کہ مجھے اس کی طرف بڑھنا ہے جانا ہے، پہنچنا ہے۔

ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں میں
تیرے تابندہ ستاروں کو سُنا جاتا ہوں میں

ابھی میں نے کہا تھا "میرا کوئی ہمراز نہیں، میرا کوئی محرمِ اسرار نہیں" - اور یہ تو سچ ہی تھا، غلط نہ تھا۔ لیکن میں ایک بات بھول گیا، — یہ تارے جو میری طرح،
خاموش صورتِ گل، مانندِ بوپریشاں
نظر آتے ہیں، جن کی آواز یا تک سُنائی نہیں دیتی اور جو اپنی دُور دراز منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ یہ میرے دوست ہیں۔ محرمِ اسرار ہیں۔ راز داں ہیں، یہ بھی دن کو روپوش رہتے ہیں، رات کو نمودار ہوتے ہیں اور میں جب بہت زیادہ ضبطِ محبت سے گھبرا جاتا ہوں تو ان کی محفل میں پہنچتا ہوں اور اپنا افسانہ انہیں سُنا جاتا ہوں۔

کشاکش

سفینہ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا
چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

---

(۳۴)

مقامِ محمود

ذاتی سربلندی کی خاطر قوم و ملت کو ٹھکرا دینا، اپنی ذات پر قوم کو ترجیح نہ دینا، اپنے مفاد کے سامنے ملی مفاد کو خاطر میں نہ لانا، پیشہ ور لیڈروں کی آج بھی سرشت ہے، اور جب انگریز اس دیس کے حکمران تھے، تب تو یہ جذبہ کمال اوج پر پہنچا ہوا تھا، جس سے ڈپٹی کمشنر خوش وہ لیڈر، جس سے گورنر خوش وہ لیڈروں کا لیڈر، جس سے وائسرائے بہادر راضی، وہ سارے ملک اور ساری قوم کا ناخدا۔ عراق میں، انگریزی فوجیں مسلمانوں کو پامال کریں، گولہ باری کریں، مسلمانوں کو تباہ و برباد کریں، لیڈر خوش ہے اور سرکار پایدار کو دعائیں دے رہا ہے، ایران کو، برطانیہ کی استعماری فوجیں پامال کریں، وہاں کے عوام کے سرو سینہ کو اپنے نیزوں سے چھید ڈالیں، وہاں کے خواص کو دار و رسن سے آشنا کریں، اس کے جس حصہ پر چاہیں اپنا اقتدار اور تسلط قائم کریں۔ لیڈر اس پر شادمانی کے شادیانے بجا رہا ہے، ترکیہ، جو اس زمانہ میں، خلافتِ اسلامیہ کا پایۂ تخت تھا اور از روئے مذہب، جو مسلمانوں کے نزدیک ایک محبوب اور مقدس

ملک کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، فرنگی سامراج کے ہتھیاروں سے مجروح ہو گیا، وہاں کی بندرگاہوں پر، عمارتوں پر، برطانوی پرچم لہرایا جائے۔ وہاں کے لوگوں کی آزادی چھین لی جائے، وہاں کا نظام بدل دیا جائے، اور وہاں وہ نظام مسلط کر دیا جائے جس سے مسلمانوں کو، اسلام کو، مسلمانوں کے ملی مزاج کو کوئی سروکار نہیں، تو بھی لیڈر خوش ہے اور سرکار کو کامیابی اور کامرانی کی دعائیں دے رہا ہے۔ ترکیہ کے خلاف اگر انگریز اعلانِ جنگ کر دیں، اور میدانِ جنگ میں اپنی کثرتِ سپاہ اور کثرتِ آلات واسلحہ سے اسے مغلوب اور تباہ و برباد کرنا شروع کر دیں، تو یہ لیڈر زیادہ خوش ہے۔ اپنے دیس سے، اپنے وطن سے، اپنے شہر سے، اپنے دیہات سے مسلمان سپاہیوں کی سستی قیمت پر بھرتی کر کر کے میدانِ جنگ کی طرف روانہ کر رہا ہے کہ جاؤ مسلمانو! اپنے خلیفۃ المسلمین کا تختہ الٹ دو، اپنے مسلمان بھائیوں کے گلے کاٹو، اپنی قوم، اور ملت کے جذبۂ حریت کو پاؤں تلے روند دو، اور پورے طور پر پامال کر دو، انگریز اپنے مفاد اور مصالح کے پیشِ نظر قبضہ کرنا ضروری سمجھیں اور قوت وطاقت کے بل پر قبضہ کر ہی لیں، وہاں کے مسلمانوں کو پھانسیاں دیں حریت طلب لوگوں کی گردنیں کاٹیں۔ آزادی خواہوں کو جیل میں ٹھونس دیں، بادشاہ کو شاہ شطرنج بنا دیں، تو یہ لیڈر خوش اور بہت خوش ہے، اپنی طرف سے سپاہیوں کا نذرانہ پیش کر رہا ہے۔ حجازِ مقدس میں اگر انگریز سازشیں کریں، اور وہاں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا کر دیں۔ ایک کا ساتھ دیں۔ ایک کو لڑائیں، تو اس لیڈر کے گھر میں گھی کے چراغ جل رہے ہیں اور وفورِ مسرت سے اس کے بندِ قبا ٹوٹے

جارہے ہیں، شام، لبنان، شرقِ اردن اور دوسرے مقامات پر اگر فرنگی ...... کاریاں رنگ لائیں۔ مسلمانوں کے مفادات اگر مجروح ہوں۔ ان کی آزادی اگر چھنی جائے۔ انہیں غلام بننے پر اگر مجبور کیا جائے تو یہ لیڈر نہایت سعادت مندی کے ساتھ تائیدِ سرکار کے لئے موجود اس کے لئے فوج بھی ہے اور زرِ لقد کی سپاہ بھی، جس کا جس طرح جی چاہے مقابلہ کرلے، سوڈان میں اگر کوئی مہدی پیدا ہوا وہ برطانوی استعمار کے خلاف صف آرا ہو کر میدانِ جہاد میں اترے اور بڑی حد تک انگریزوں کا قلع قمع کردے اور انگریز پھر کر میدان میں اتر آئیں اور نہایت سفاکی اور درندگی، بہمیت اور شقاوت کے ساتھ حریت پرستوں کو کچلیں، ماریں، قتل کریں، عورتوں کی بے آبروئی کریں۔ بچوں پر رحم نہ کریں۔ بوڑھوں کو شکنجۂ تعزیر میں کسیں۔ حتیٰ کہ مہدی کو، دیوانہ مشہور کردیں اور اس دیوانے سے انتقام اس طرح لیں کہ جب سوڈانی بالکل کچل دیئے جائیں اور وہاں پورے طور پر انگریزی تسلط قائم ہو جائے تو اس کی قبر کھودیں اور ہڈیاں نکال کر ان سے انتقام لیں تو یہ لیڈر مسکرا مسکرا کر، ہنس ہنس کر یہ منظر دیکھے گا اور خوش ہو ہو کر اپنی سرکار کی بلائیں لے گا اور ہانکے پکارے کہے گا:

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اور ان سب باتوں سے قطع نظر خود اس کے دیس ـــ پاک و ہند ـــ میں انگریز، درندگی اور سفاکی پر اتر آئیں، والیانِ ریاست کی ریاست ضبط کرلیں۔ تعلقہ داروں کے تعلقے چھین لیں۔ حریت پرستوں کو پھانسی پر لٹکا دیں،

اور جیل بھیج دیں۔ رضاکاروں کے کوڑے لگوائیں اور روح فرسا اذیتوں میں مبتلا کر دیں۔ عورتوں اور بچوں تک پر رحم نہ کریں، انہیں اسیر زنداں کریں ان پر بھی ظلم توڑیں۔ انھیں بھی عبرت انگیز سزا دیں، بوڑھوں کے بڑھاپے کا خیال نہ کریں، ان سے پوری پوری مشقت لیں۔ وہ لوگ جو خاندانی اعتبار سے، خواہ کتنے ہی اونچے اونچے ہوں ان کا پایۂ علم خواہ کتنا ہی بلند ہو، خواہ یہ انگریزی، انگریزوں سے زیادہ فصیح و بلیغ بولتے ہوں، خواہ یہ آئی سی ایس کا امتحان شاندار طور پر پاس کر چکے ہوں، خواہ قوم کی نظر میں ان کے ایثار و قربانی کی کتنی ہی قدر ہو، خواہ قوم انہیں کتنا ہی عزیز و محبوب رکھتی ہو، لیکن انگریز انہیں ستائے، پریشان کرے۔ ان کی جائیداد یا نیلام کر دے، ان کے گھر ضبط کر لے، ان کے کھیت چھین لے۔ ان کے بنک بیلنس کو سر بمہر کر دے انھیں پھانس دے۔ جیل بھیجے اور جیل میں ان کے ساتھ وہ برتاؤ کرے، جو خونیوں اور قاتلوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان سے وہ مشقت لے جو ڈاکوؤں اور لٹیروں سے بھی نہیں لی جاتی — تو بھی یہ لیڈر ہے۔ ان حریت پرستوں کو گالیاں دینے میں پیش پیش۔ اس ظلم کا مظاہرہ کرنے والے انگریزوں کی تائید میں سب سے آگے، خواہ اس کا گلا پھٹ جائے۔ سینہ کی کڑیاں ٹوٹ جائیں۔ رگیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، لیکن یہ اپنے آقا — انگریز — کی تائید و حمایت میں سب کچھ کہنے اور سب کچھ کرنے کو تیار۔

یہ تھی وہ فضا، جب اقبال نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا۔

ایک ناصح اقبال کو دیکھ کر حیرت کرتا ہے کہ اس شخص میں وہ ساری صلاحیتیں موجود ہیں، یہ سرسری اور شاہری چھوڑ کر لیڈری کیوں نہیں کرتا؟ چنانچہ وہ اعتراف

کہتا ہے:

میں نے اقبال سے از راہِ نصیحت یہ کہا
عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکرِ حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز
ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے
فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز
درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز
غمِ صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں!
پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغِ پرواز؟

اور یہ سب کچھ سُن کر پھر اُسے اکساتا ہے:

عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشاں است

حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز را

ہم نے پوری نظم نہیں درج کی ہے، چند اشعار پیش کئے ہیں، لیکن ان چند شعروں میں بھی اقبال نے جس طرح کوزے میں دریا کو بند کیا ہے اور اپنے اوپر ڈھال کر جس طرح وقت کے خود پرست لیڈر کا سراپا کھینچا ہے، وہ اقبال کے ذہنِ رسا کا کمال ہے بلکہ سچ تو یہ ہے انسانی قوت نطق و کلام کا اعجاز ہے۔

دیدۂ خونبار

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نا امیدِ نورِ ایمن ہوگئیں

اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہوگئیں

وسعتِ گردوں میں بھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں

دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں؟
اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بداماں ہوگئیں

---

(۳۵)

شمع و شاعر

شاعر پر مختلف واردات اور کیفیات طاری ہوتے ہیں اور ان کا وہ فاش و برملا اظہار بھی کرتا رہتا ہے۔ شمع و شاعر میں بڑی دیرینہ مناسبت ہے۔ وہ بھی جلتا ہے، یہ بھی جلتا ہے۔ اس کی سرشت بھی سوز و گداز ہے۔ اس کی فطرت بھی یہی ہے۔ وہ بھی اس سے مستغنی اور صلہ سے بے پروا ہے۔ یہی اس کا بھی حال ہے۔ اسے بھی دوسروں کا غم ہے اور یہ بھی اپنے غم سے سروکار نہیں رکھتا ـــــ دوسروں کے ـــــ قوم کے غم میں جاں بلب رہتا ہے۔

لیکن اس یکسانیت اور مناسبت کے باوجود، دونوں میں ایک بہت بڑا فرق بھی ہے۔ شمع پر نثار ہونے، اس کے غم کی داد دینے، اور اس کے سوز و تپش پر مرحبا کہنے کے لئے پروانوں کا جم غفیر موجود ہے لیکن شاعر کے غم اور سوز و تپش پر مرحبا کہنے والا کوئی نہیں، اس کے غم کی داد پروانے تک نہیں دیتے ـــــ آخر یہ فرق کیوں ہے؟

ایک روز اسی موضوع پر شمع و شاعر میں بحث و گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔

دونوں بڑی بے مروتی اور بڑی صفائی سے اپنے اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہیں بلکہ یوں کہئیے، خوب کھری کھری سناتے ہیں۔ اس بحث و گفتگو کی آواز کہیں مدھم ہے، کہیں تیز و زوردار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں اقبال کی شخصیت اور شخصیت سے زیادہ روح بہر حال نمایاں ہے

اقبال شمعِ پیکرِ حیرت بن کر پوچھتے ہیں،

دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش!
گیسوئے تو از پرِ پروانہ دارد شانہ!

میں نے اپنے ویران گھر کی شمعِ سوزاں سے کہا،
تیرے گیسو اور زلف کی کنگھی پروانوں کے پر بنے ہوئے ہیں۔

در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم!
نے نصیبِ محفلے، نے قسمتِ کاشانۂ!

میرا حال یہ ہے کہ میں بھی تیری سوز و گداز کا پتلا ہوں، جلتا ہوں اور پگھلتا رہتا ہوں لیکن میری مثال، لالۂ صحرا کے چراغ کی سی ہے، جس کے نصیب میں نہ محفل آتی ہے، نہ کوئی کاشانہ۔

مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم!
در طوافِ شعلہ ام بالے نہ زد پروانۂ!

تیرے لئے میں مدتوں جلتا اور پگھلتا رہا، سوختہ ہوتا رہا۔
لیکن میرے شعلہ کا طواف کرنے کے لئے ایک پروانہ بھی نہیں آیا۔

می طپید صد جلوہ در جانِ املِ فرسودہ من

برمی خیزد از ایں محفل دل دیوانہ!

میری جانِ ناتواں کے اندر بھی صد ہا جلوے مچل رہے ہیں۔
لیکن اس محفل سے کیا بات ہے کوئی دل دیوانہ نہیں اٹھتا؟

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی!
کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی؟

آخر یہ آتش عالم افروز تو نے کس طرح اور کہاں سے حاصل کی ہے؟
یہ بات تیرے اندر کیسے پیدا ہو گئی کہ تو نے ایک حقیر کیڑے — پروانہ — کو سوزِ کلیم بخش دیا؟

اب ذرا غور کیجیے، ان باتوں کا جواب شمع کیا دیتی ہے؟ — وہ شاعر کی یہ باتیں توجہ اور التفات سے سنتی ہے، اور مسکراتی رہتی ہے۔ پھر جواب دیتی ہے، جواب کیا دیتی ہے، چٹکیاں لیتی ہے، نشتر چبھوتی ہے، دل پر وار کرتی ہے۔ کہتی ہے:

میں تو جلتی ہوں کہ مضمر ہے مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا!

کتنا بڑا فرق ہے، مجھ میں اور تجھ میں، میں اس لیے جلتی ہوں کہ میری سرشت اور فطرت ہی سراپا سوز ہے اور تو اس لیے فروزاں ہوتا ہے کہ پروانے تیرے گرد آئیں، تیرا طواف کریں اور جان دے دیں — میں ایثار ہوں تو سراپا پندار۔

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
شبنم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا

میں اس لیے روتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا طوفان مچل رہا ہے اور وہ قطرہ قطرہ بن کر میری آنکھوں سے ٹپکتا ہے۔ تو اس لیے شبنم افشاں ہے، یعنی قطراتِ شبنم کی طرح اپنے آنسوؤں کے قطرے ٹپکاتا ہے کہ محفلِ گل۔ محفلِ عالم ــــ میں تیرا چرچا ہو، لوگ کہیں کہ ہاں، واقعی یہ شاعر کیسا دردمند ہے کہ اس کی آنکھوں سے ہر وقت جوئے اشک بہتی رہتی ہے۔ ہر وقت اس کا خونِ جگر، اشکِ سحرگاہی کی صورت میں منتقل ہوتا رہتا ہے ــــ کاش میرے دل میں یہ تمنا نہ ہوتی کہ بزمِ گل میں تیرا چرچا ہو، اس آرزو سے تو بے نیاز ہوتا لیکن تیرا دل طوفانِ اشک کا مرکز ہوتا، پھر تیرا چرچا بھی ہوتا اور یہ قطراتِ اشک کچھ قدر و قیمت بھی رکھتے۔

گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح

ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

میرا حال تو یہ ہے کہ میرا خونِ جگر بے اثر نہیں رہ سکتا، چنانچہ دیکھ لے، میری صبح، میرے اشکِ خونینہ سے گل بدامن ہو رہی ہے۔ یعنی میری رات اور میرے دن میں ایک ربط قائم ہے، رات کو روتی ہوں اور دن کو میرے آنسو نمایاں ہوتے ہیں اور تیری یہ کیفیت ہے کہ تیرا کل تیرے آج سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، دونوں میں بیر ہے۔ اس تضاد کے باوجود میں اور تو ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہمارے کیفیات میں اشتراک کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں

شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

وہ روشنی بیکار ہے جو سوزِ دروں سے محروم ہو، میرا نور، میرے سوزِ دروں اور دردِ نہاں کا نتیجہ ہے، تو سوزِ دروں اور دردِ نہاں سے محروم ہے۔ تو شعلہ تو رکھتا ہے لیکن ویسا ہی جیسا لالۂ صحرا کا شعلہ ہوتا ہے۔ رنگ وہی لیکن سوزِ دروں ناپیدا، لہٰذا تجھے یکسانیت اور اشتراک میرے بجائے لالۂ صحرا میں تلاش کرنا چاہیئے۔

بڑی دیر تک شمع، شاعر کی باتوں کا جواب دیتی رہتی ہے۔ بہت کچھ کہتی ہے اور شاعر گم سم سُنتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایسا تیر لگاتی ہے جس کا کوئی توڑ نہیں۔

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا زیبا ہے تجھے
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا
اور ہے تیرا شعار، آئینِ گلزار ہے
آنکھ روتی ہے تری رسوا ہے آئینہ ترا

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا

---

(۳۶)

رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا

ذاتِ رسالت مآبؐ سے اقبالؔ کو بڑی گہری اور غیر معمولی عقیدت تھی۔ اسی مناسبت سے خاکِ حجاز کا ذرّہ ذرّہ ان کے لئے سرمۂ چشم کی حیثیت رکھتا تھا، اپنے اشعار میں متعدد مواقع پر انھوں نے "غبارِ راہِ حجاز" بن جانے کی تمنا کی ہے، گو زندگی میں ان کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی کہ صحرائے بطحا، اور دیارِ یثرب میں پہنچتے، لیکن، جب تک زندہ رہے اس تمنا میں جلتے رہے۔

جب رسول اللہؐ اور خاکِ حجاز سے عقیدت کے سلسلہ میں اقبالؔ، کوئی منفرد حیثیت — نہیں رکھتے تھے، کون مسلمان ہے جو رسالت مآبؐ سے محبت نہ کرتا ہو، اور خاکِ حجاز کو عزیز نہ رکھتا ہو؟ بہت سے لوگ ایسے ملیں گے، جو اس باب میں اقبالؔ سے بھی آگے ہیں، یعنی ذاتِ رسالت پناہؐ سے ان کی شیفتگی اور بطحا و یثرب سے ان کی عقیدت اقبالؔ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے، لیکن ان میں، اور اقبالؔ میں ایک فرق ضرور ہے اور وہ فرق بجائے خود خاص اہمیت رکھتا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بنیادی اور اساسی

فرق ہے، اسی لئے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔

ایک تحریک شروع ہوئی کہ جدہ میں، جو گویا حجاز کا دروازہ ہے۔ ایک ہسپتال کھولا جائے۔ آج کا جدہ دنیا کے ترقی یافتہ اور متمدن شہروں میں سے ایک ہے وہاں فلک رفعت کوٹھیاں تعمیر ہو چکی ہیں۔ بلند اور شاندار عمارتوں نے جدہ کو نیویارک، لندن، برلن اور پیرس کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ وہاں زمین کی قیمت اتنی بڑھ چکی ہے کہ ایک سو گز زمین ایک ہزار روپیہ میں بہ مشکل ملتی ہے لیکن آج سے ۴۵ ۔ ۵۰ سال پہلے کا جدہ اب سے بالکل مختلف تھا، وہاں نہ کوئی شاندار عمارت تھی نہ ہسپتال، نہ ضروریات تمدن کی اور چیزیں لہٰذا، شفاخانہ کی اس تحریک نے عالم اسلام میں عام طور پر اور پاک و ہند میں خاص طور پر بڑی ہمہ گیری حاصل کر لی۔ اس مقصد کے لئے چندے ہونے لگے اور یہ طے ہوا کہ یہ رقم وہاں بھیج دی جائے تاکہ ہسپتال اور زیادہ شاندار طور پر تیار ہو سکے۔

یہ خوشخبری لے کر ایک پیشوائے قوم اقبالؔ کے پاس پہنچے اور انہیں لکھایا:

ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرہ بے قرار
سنتا ہے تو کسی سے جو افسانۂ حجاز

یہ بات سن کر اقبالؔ کے کان کھڑے ہوئے کہ ضرور کوئی خاص بات ہے، لیکن اس حقیقت سے کہ ان کی خاک کا ہر ذرہ افسانۂ حجاز سن کر بے قرار ہو جاتا ہے۔ وہ انکار نہ کر سکے۔ انھوں نے جواب دیا بے شک ایسا ہوتا ہے اور اس پر مجھے

فخر ہے، ناز ہے، لیکن اس ارشادِ گرامی کا مطلب کیا ہے، افسانۂ حجاز سے میری وابستگی اور تعلق خاطر کو اس وقت زیرِ بحث لانے کی کیا ضرورت پیش آگئی آپ کو؟ کوئی خاص وجہ تو ہوگی جو آپ نے یہ ذکر چھیڑا ہے؟ بتائیے وہ محرک کیا ہے؟ یہ سوال آپ مجھ سے کیوں کر رہے ہیں؟ انھوں نے فرمایا:

دستِ جنوں کو اپنے بڑھا جیب کی طرف
مشہور تو جہاں میں ہے دیوانۂ حجاز

یہاں تک بھی خیریت رہی۔ اقبال نے جواب میں عرض کیا:
بجا ارشاد ہوا، میں دیوانۂ حجاز مشہور ہوں اور یہ شہرت کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر دیوانۂ حجاز ہوں، تو دستِ جنوں کو جیب و دامن تک کیوں لے جاؤں؟ —

ارشاد ہوا۔

دار الشفا حوالیِ بطحا میں چاہیئے
نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہیئے

جدہ میں شفاخانہ تعمیر ہو رہا ہے۔ وہاں بیماروں اور ناچاروں کا علاج ہوگا۔ ان کا روگ دُور کیا جائے گا۔ انہیں صحت دی جائے گی ان کے زخموں پر مرہم رکھا جائے گا۔ ان کی مصیبت کا علاج کیا جائے گا۔ بھلا جو لوگ صحرائے بطحا اور دیارِ یثرب کے آس پاس رہیں، ان کی خدمت ہمارا فرض نہیں ہے، کیا ہمیں یہ نہیں چاہیئے کہ ان کی صحت، علاج اور تیمارداری کے سلسلہ میں اپنا فرض ادا کریں؟

اقبالؔ نے یہ داستان بڑے مزے سے لے کر سنائی۔ پیشوائے قوم کی ساری باتیں سننے کے بعد وہ فرماتے ہیں۔

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں

زندگی مجاز ہے، موت حقیقت، موت کوئی گھبرانے اور ڈرنے کی چیز تو نہیں۔ وہ تو درحقیقت ایک نئی مستقل اور پائیدار زندگی کا نام ہے۔

لکھا ہے اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مئے عمر دراز میں

عاشق کو جو لذت اور حلاوت موت کی تلخی میں مل گئی اسے عمر دراز سے بہرہ ور ہونے کے باوجود خضر والا مقام بھی نہ حاصل کر سکے یہ کیسی عجیب بات ہے۔ آپ فانی دے کر آنی خریدنا چاہتے ہیں، وقتی چیز کو ابدی چیز پر ترجیح دے رہے ہیں۔ کم از کم میں تو آپ کی ہمنوائی سے اپنے آپ کو معذور پاتا ہوں۔

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

ہسپتال بنا کر معالج اور تیماردار پیدا کر کے دوسروں کو آپ زندگی کی نوید اور بشارت دیں۔ مجھے تو سرزمینِ حجاز میں موت کی تمنا ہے۔ میں وہاں زندہ رہنا نہیں چاہتا مرنا چاہتا ہوں۔ رنجوریٔ تن کا مداوا حاصل کرنے میں وہاں نہیں جا رہا۔ غمِ دل کا علاج کرنے جانا چاہتا ہوں اور اس کا علاج موت ہی ہے ــــ موت یعنی حیاتِ جاوداں!

(۳۷)

شاعر کا فرض

شاعری کو "جزویست از پیغمبری" کہا گیا ہے، لیکن کس شاعری کو؟ کیا اس شاعری کو جو رندی اور ہوسناکی کا پیغام سناتی ہے؟ نہیں، وہ شاعری نہیں، افیون ہے۔ شراب ہے، زہرِ ہلاہل ہے۔ کوئی قوم اس سے سرسبز نہیں ہو سکتی۔ شادکام نہیں ہو سکتی۔ حصولِ مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ شاعری جسے "جزویست از پیغمبری" کہا گیا ہے۔ وہ شاعری ہے جو قوم کی مردہ رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑا دے، جو سوئی ہوئی قوم کو زندہ اور بیدار کر دے، جو جیالوں میں مر مٹنے اور کٹ مرنے کا جذبہ پیدا کر دے، جو قوم کی تعمیر اور تشکیلِ نو میں ممد و معاون ہو، جو قوم پر نکتہ چینی کرے تو اس کے عیب نمایاں کرے اس کے نقائص بیان کرے، اور پھر اسے رفعت اور شکوہ کا پیام دے اس میں ایک ایسا جذبہ پیدا کر دے، جو طوفانوں کا مقابلہ کر سکے، پہاڑوں سے ٹکرا سکے، آفتوں اور تباہیوں کو خاطر میں نہ لائے۔

اقبال اسی قسم کے شاعر تھے، وہ اس طرح کی شاعری کو ملک و ملت

کے لئے مفید اور کارگر سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

مدیرِ مخزن سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہہ دے

جو کام کچھ کررہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

تو ان کا مطلب رندی اور ہوسناکی کی شاعری سے تھا جو قوم پر اضمحلال اور افسردگی کا عالم طاری کردیتی ہے جو اس کی زندگی سے حرارت چھین لیتی ہے اور اسے عمل کی نعمت سے محروم کردیتی ہے، وہ شاعری جو قوم کے لئے حیاتِ تازہ کا حکم رکھتی ہو مفید ہے۔ اقبال چاہتے تھے وہ شاعری یکسر ترک کردینا چاہیئے، جس کا مقصد رندی اور ہوسناکی ہے، وہ شاعری اختیار کی جائے جو ملت کے مفادِ عمومی کی نگہبان ہو۔

اس موضوع پر کئی مقامات پر انھوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ کہیں کھل کر، کہیں بند بند، ایک مقام پر اپنے خیالات ذرا وضاحت سے پیش کئے ہیں اور بتایا ہے میں کس طرح کی شاعری کرتا ہوں اور کس طرح کی شاعری کی قوم کو ضرورت ہے۔

بات انھوں نے جوئے کوہسار سے شروع کی ہے، بتاتے ہیں، فرازِ کوہ سے جو سرود آفریں شرابِ لالہ گوں سے مست میکدۂ بہار کے ایوان سے قدم باہر نکالتی ہے اور پھر زندگی بھر وہ رواں ہی رہتی ہے۔ اس کی روانی ہی اس کی زندگی ہے، قرار نام ہے موت کا اور بے قراری نام ہے زندگی کا، وہ قرار سے آشنا نہیں ہوتی۔ بے قرار، مضطرب، بس اس ایک دھن میں رواں دواں رہتی ہے، نادیوں میں اٹھکیلیاں کرتی پہنچتی ہے۔ سبزہ و مرغزار سے عشق بازی کرتی ہے۔ کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔ جس سے اناج پیدا ہوتا ہے اور خلقت کا پیٹ بھرتا ہے باغ چمن میں پھولوں اور کلیوں کو پیامِ نمود دیتی ہے، جس سے آنکھیں طراوت حاصل کرتی ہے اور دل و دماغ سکون حاصل کرتے

ہیں۔ اس کی بے قراری، خلقتِ خدا کے لئے، امن و سکون ...... اور راحت و آسائش کا پیام ہے۔

یہ سب کچھ بتا چکنے کے بعد، اقبال کہتے ہیں، شاعری بھی، جوئے رواں کی طرح ہوتا ہے، وہ بھی دلوں کی کھیتی کو پانی دیتا، اور روح کے پھولوں میں رعنائی پیدا کرتا ہے۔

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری!
ہوتی ہے اس کی فیض سے مزرعِ زندگی ہری

اور شاعر کا کلام، زندگی کی کھیتی ہی میں ہریالی نہیں پیدا کرتا، بلکہ،

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

پھر کھل کر اور صاف صاف کہتے ہیں کہ وہی شاعری شاعری ہے، جو قوم کی آذریت کے لئے نوائے خلیل کا حکم رکھتی ہو، ورنہ وہ شاعری نہیں الفاظ کی طلسم بندی ہے۔

اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگیِ دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

دنیا والے اس شاعری سے حیاتِ دوام حاصل کر سکتے ہیں، جس کی تربیت خونِ جگر سے ہوئی ہو، اور یہ شاعری، اگر دم توڑ دے، اس کا وجود اگر مٹ جائے تو پھر نہ قوم کی خیر ہے نہ امورِ ملی کی!

گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو!
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

۱

(۳۸)

شورشِ محشر

کہتے ہیں کہ شاعر قوم کو بنا اور بگاڑ سکتا ہے اور یہ قول کچھ غلط نہیں، امر واقعہ یہ ہے، کہ شعر میں جادو ہوتا ہے۔ اس جادو کو نیک کام میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور برے کام میں بھی۔ جن شاعروں نے اپنی شاعری کا موضوع، ساقی سیمیں اور ساعد زریں، کو بنایا، جنھوں نے گل و بلبل کا افسانہ سنایا، جنھوں نے رندی اور ہوسناکی کی داستانیں طشت از بام کیں، جنھوں نے امرد پرستی، کے قصے مزے لے لے کر بیان کئے، جو ہمیشہ زلف و کاکل میں الجھے رہے، جن کے منہ سے ہمیشہ رخسار و گلو کی تعریف و توصیف کے قصیدے جاری ہوتے رہے جنھوں نے سارا زورِ کلام معاملہ بندی اور عشرت پر صرف کر دیا خود اُن کے زمانے کی سوسائٹی اور سماج پر نظر ڈالئے، کون کہہ سکتا ہے ان کا چلایا ہوا جادو بے اثر رہا؟ اس زمانہ کی سوسائٹی میں جو اقدارِ حیات ہوسناکی اور رندی شاعری نے پیدا کر دیئے تھے، آج ان کا تصوّر کرتے ہی شرم آتی ہے وہ ذکر ہی طبعِ نازک پر بار ہے۔

اقبالؔ نے جس سوسائٹی میں آنکھیں کھولیں، اگرچہ کسی درجہ میں اس کی

اصلاح اور تعمیر نو کا کام شروع ہو چکا تھا۔ لیکن کم و بیش حالات وہی تھے، امراء کی عیاشیاں، "ارکی بے پروائیاں، خواص کی عشرت پسندی، عوام کی خود پرستی، علماء کا مشغلۂ پیکار باہمی، مناظرہ اور تکفیر صوفیا کی خانقاہوں میں، ذکر و شغل، ہو حق اور نعرۂ تکبیر، دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اس سے کسی کو سروکار نہیں۔ دنیا کس نہج پر جا رہی ہے، اسے سوچنے کی کسی کو پروا نہیں۔ عالم اسلام کا کیا حال ہے؟ اس فرسودہ موضوع پر بحث و گفتگو اور غور و فکر کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں، خلافتِ اسلامیہ کی قبا کس طرح تار تار کی جا رہی ہے اس کا غم کسی کو نہیں، حجازِ مقدس، مقاماتِ مقدسہ اور عتبات عالیات کو فرنگی استعمار پرستوں نے کس طرح ہدفِ جوع الارض بنا رکھا ہے، اس کا کسی کو خیال نہیں، خود پاک و ہند کے مسلمانوں پر اپنا نے وطن کے ہاتھوں، فرنگی سامراج کے ہاتھوں، قومی غداروں اور منافقوں کے ہاتھوں کیا گزر رہی ہے؟ اس کا کسی کو دھیان نہیں۔ سب اپنے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اپنی دھن میں مست تھے، اور اپنے غریب خانہ میں، ایوانِ امارت میں خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اور اس زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے تھے گویا جو کچھ ہے ٹھیک ہے۔ جس طرح گزر رہی ہے، درست ہے۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

کہیں شراب کا دور چل رہا ہے کہیں کوئی مہ جبیں مصروفِ رقص ہے۔ کہیں نغمہ کی دل کشی ناہیدِ فلک کا مقابلہ کر رہی ہے کہیں کنکوے لڑائے جا رہے ہیں۔

کہیں بٹیروں کی پالی ہو رہی ہے۔ کہیں کبوتر اڑائے جا رہے ہیں کہیں داد عیش دی جا رہی ہے۔ کہیں تھیٹر سے دلچسپی لی جا رہی ہے کہیں جوا کھیلا جا رہا ہے۔ کہیں مشاعرے اور مناظرے ہو رہے ہیں۔ کہیں نعت پڑھی جا رہی ہے کہیں سوزخوانی ہو رہی ہے۔ کہیں میلاد شریف کی محفلیں ہیں۔ کہیں محرم کی مجلسیں ـــــ اور کہیں امیر حمزہ کی داستانیں۔

کسی کو یہ نہیں معلوم کہ صیاد گھات میں ہے۔ دام ہم رنگ زمین ہے۔ بہت سے ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں، اور جو باقی ہیں، وہ ایک لمحہ میں گرفتارِ بلا ہو سکتے ہیں۔ "آج" بس یہی سب کچھ تھا، گزرا ہوا کل اور آنے والا کل کسی کی دلچسپی اور غور و فکر کا موضوع نہ تھا۔

یہ فضا تھی، جب سید احمد خان ایک مصلح کے روپ میں نمودار ہوئے۔ شبلی کے تاریخ کی محفل کیا تھی۔ حالی نے قوم کے عزاخانے میں مرثیہ ملی پڑھنا شروع کیا۔ نذیر احمد نے حکایت، اور لطافتِ لسانی کے جوہر دکھائے۔ محسن الملک، وقار الملک، اور دوسرے اکابر نے قوم کے کان میں صورِ بیداری پھونکا، لیکن وہ کسمسا کر رہ گئی۔ اس کے خوابِ خرگوش میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ صرف کچھ نیند کے ماتے ایسے تھے جنھوں نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھے، ورنہ زیادہ تر ایسے تھے جنھوں نے آواز سنی کی ان سنی کر دی اور گھوڑے بیچ کر سوتے رہے۔

اس کے بعد، دوسرا دَور شروع ہوا!

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی؟!

یہ دَور، گو جلد شروع ہوا اور جلد ہی ختم بھی ہو گیا، لیکن اس کے نقوش اتنے

گہرے اور پائیدار تھے کہ شاید کئی نسلوں تک اس کے آثار قائم رہیں گے۔

اسی دور میں محمد علی کی صالح، مخلصانہ اور ہمہ گیر قیادت منظرِ عام پر آئی اور اس نے پاک و ہند کے طول و عرض میں ہلچل مچادی، اس دور میں شوکت علی کا سراپا ایثار و عمل اور کوہ وقار شخص نمودار ہوا، اور اس نے پاک و ہند کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ اس دور میں ابوالکلام کی یگانہ اور فرید خطابت فضا میں گونجی اور اس نے صرف سوتوں ہی کو نہیں جگایا، بلکہ جو مر چکے تھے انہیں بھی زندگی، اور زندگی کی حرارت سے مالا مال کر دیا۔ ابوالکلام کی خطابت سے در و دیوار گونجے، اس کی آواز جھونپڑوں میں بھی پہنچی، اور ایوانوں میں بھی، گھروں میں بھی اور قصور ولایت میں بھی، یہاں تک کہ

تزلزل در ایوانِ کسریٰ فتاد!

قصرِ شہریاری کے کنگرے اور ایوانِ خسروی کے منارے، ان کی ہیبت خطابت سے لرزنے لگے، کانپنے لگے، اور اسی دور میں اقبال ابھرا، نمایاں ہوا اور چھا گیا۔ اس کی شاعری وطن پرستی سے شروع ہوئی تھی، لیکن اسلام پر ختم ہوئی۔ ذرا غور تو کیجئے اس آغاز و انجام پر

گنگا سے جو پھسلا، لبِ کوثر نکلا

کوئی شبہ نہیں ان سب کے اثرات ہیں، اور اپنی جگہ مستقل، یادگار اور دیرپا اثرات ہیں لیکن "خدمت" اور کام کا جو موقع اقبال کو ملا۔ وہ کسی کو نہیں ملا، جس یکسوئی اور تسلسل کے ساتھ اقبال نے اپنا مشن جاری رکھا وہ بات کسی بزرگ کو حاصل نہ ہو سکی۔

محمد علی کی قومی زندگی کا بڑا حصّہ نظر بندی۔ جیل اور پیکار باہمی میں گذرا۔ اسے "حق" کے لئے صرف دشمنوں ہی سے نہیں اپنوں سے بھی لڑنا پڑا۔ اُن سے جو کبھی اس کے دوست تھے، محبوب تھے، رفیق تھے۔ اس نے استعمارِ فرنگ سے ٹکر لی ۔۔ اور اس نے مسلمان، سرکار پرستوں کے وار سہے، اس کی ساری زندگی، جہاد، پیکار، حملے جوابی حملے اور دفاع میں گذر گئی۔ قدرت کی طرف سے عمر ہی کم لکھا کر لایا تھا، ۵۲ سال کی عمر میں اس جہانِ گزراں سے رخصت ہو گیا۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

شوکت علی، قد و قامت کے اعتبار سے جیسا کوہ پیکر تھا۔ اتنا ہی بڑا اس کا دل بھی تھا۔ اسے محمد علی سے عشق تھا، لیکن ملّتِ اسلامیہ کو وہ محمد علی سے زیادہ چاہتا تھا۔ محمد علی کا غمِ مرگ، مردانہ وار اس نے جھیل لیا اور اپنے رنگ میں، اپنے اسلوب سے قوم کی خدمت کرتا رہا، لیکن اسے جو زمانہ ملا وہ انتشار اور افتراق کا زمانہ تھا۔ وہ اکیلا تھا اور ہر طرف سے اس پر حملے ہو رہے تھے۔ مسلم نیشلسٹ پارٹی کے تیر براہِ راست اس کا سینہ چھید تے تھے، مجلس احرار کی سنگینیں اس کے دست دراز در پر چپ کے لگائی تھیں۔ نیلی پوش تحریک کی طرف سے اس پر یلغاری ہوتی تھی۔ وہ مسلمانوں کی اور ملّتِ اسلامیہ کی خدمت کرنا چاہتا تھا اور ان محاذوں کی طرف سے اسے دعوتِ مبازرت دی جاتی تھی۔ وہ ہمت کا پکا، ارادہ کا سچا اور محبت کا کھرا آدمی تھا۔ خندہ جبینی کے ساتھ ان کو برداشت کرتا رہا۔ کبھی کبھی اپنا سیاہ آبنوسی ڈنڈا ہی فضا میں گھما کر، دو چار سر زخمی کر دیتا تھا ۔۔

اس نے چارسدہ اور اتمان زئی میں عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خان کو جاکر للکارا اور یہ حضرات اس کے سامنے نہ آسکے۔ اور دوسرے مقامات پر نیشلسٹ مسلمانوں کے حملے سہے، وار کیے اور سرخ رو نکلا، لیکن وہ اکیلا کیا کیا کرتا! کس کس سے لڑتا یا کہاں کہاں پہنچتا، پھر بھی ــــ زندگی کی آخری سانس تک میدان میں ڈٹا رہا۔ بوڑھا ہو چکا تھا، تھک چکا تھا، عاجز آچکا تھا، آخر ایک روز بستر پر ایسا لیٹا کہ پھر آنکھ نہ کھولی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ابوالکلام، جو امر بالمعروف، اور نہی عن المنکر کا پرچم لے کر میدانِ عمل میں گام فرسا ہوئے تھے، جنھوں نے "حزب اللہ" قائم کرکے امتِ اسلامیہ کو سرفروشی اور جہاد کی دعوت دی تھی، جنہوں نے الہلال اور البلاغ نکال کر ملّتِ مسلمہ کو بہت سی نئی چیزیں دی تھیں ــــ نئی زبان، نیا لب ولہجہ، نئے الفاظ، نئے محاورات، نئے خیالات، نیا پیام۔ بہت کچھ ــــ جن کی دعوت اور جن کے پیام کا مقصد و منشا صرف مردِ مسلمان کی انفرادیت کا تحفظ، اور ناموسِ اسلام کا دفاع تھا۔

امام الہند، قومیتِ متحدہ کے راستے پر گامزن ہو گئے تھے۔ مردِ مسلمان کی انفرادیت اب ان کے نزدیک بے معنی لفظ ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن مسلمانانِ ہند کو امام الہند کا دیا ہوا پچھلا سبق کچھ اس عقیدت اور خلوص سے یاد تھا کہ وہ بھولتا ہی نہیں تھا۔ قوم اصرار کے ساتھ امام الہند کے بتائے ہوئے راستہ پر استقلال و عزیمت کا پرچم لئے ہوئے گامزن تھی، لیکن امام الہند

دوسرا راستہ اختیار کر چکے تھے ۔۔۔ کوئی شبہ نہیں ان کا یہ اقدام خلوص پر مبنی تھا۔
لیکن اقبالؔ نے ایک مختصر سی مدت تک وطن کے بت کی پوجا کی اور پھر، جو دہ راہِ حجاز پر پڑے، تو زندگی کی آخری سانس تک اسی راستہ پر گامزن رہے۔
پاک و ہند میں بڑے بڑے طوفان آئے، بڑی بڑی، قیامت خیز تحریکیں اٹھیں، انقلابات آئے لیکن اقبالؔ نے ان کی طرف توجہ بھی نہ کی: جیسے صحراء میں کوئی طوفان آئے وہ خواہ کتنا ہی بڑا اور کتنا ہی مہیب کیوں نہ ہو لیکن اہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اسی طرح اقبالؔ ان تمام طوفانوں انقلابوں اور تحریکوں سے الگ رہے۔ وہ عملی آدمی نہیں تھے، اور اپنی اس کمزوری یا خوبی کا انہیں اعتراف واحساس بھی تھا۔ وہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھے دیکھتے سب کچھ رہے لیکن عمل کے میدان میں کودنے کی نہ انہوں نے ہمت کی، نہ ضرورت محسوس کی۔ البتہ اپنے کام میں فرق نہیں آنے دیا۔ اپنی قمہ سرائی، اور حدی خوانی سے ایک دن کیا ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوئے۔ حد یہ ہے کہ بستر مرگ تک پر وہ اپنا پیام قوم کے کانوں تک پہنچاتے رہے۔
مذکورہ حضرات میں اقبالؔ کے سوا کسی کو اتنا موقع نہ ملا کہ وہ اتنے تسلسل اور یکسانیت اور استقلال کے ساتھ اپنی خدمت، اور اپنے "کام" کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد علی شوکت علی اور ابوالکلام کے مقابلہ میں اقبالؔ کا نقش بہت گہرا ہے اور یہ نقش نہ دوستوں کے مٹائے مٹ سکتا ہے ۔۔۔ اس لئے کہ دوستوں نے بھی کچھ کم کوشش نہیں کی ۔۔۔ اور نہ دشمنوں کے مٹائے۔ اس پس منظر کو پیش کرنے کے بعد اب میں آپ کو، اقبالؔ کی ایک نظم کے چند اشعار کی طرف متوجہ کرتا ہوں، ان اشعار کو پڑھیئے اور غور کیجئے۔ کیا اقبالؔ کے سوا، یہ باتیں کسی اور کے منہ سے بھی نکل

سکتی تھیں، ان میں جو زور ہے، جو اثر ہے، جو سحر ہے، وہ صرف حق، اور صداقت اور حسن نیت کا ثمرہ ہے۔ ہر شعر کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے اقبال کی وہ دعوت نمایاں ہے جس کے لئے وہ زندہ تھے،

اقبال خدا سے دعا کرتے ہیں:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر
اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلیٰ دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر
خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے
بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورتِ مینا دے

جس شعر پر نظم ختم کرتے ہیں اس کا اثر اور سوز و گداز دیکھئے۔

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

الفاظ کی سادگی، مفہوم کی بلندی، مقصد کی رفعت، اس ایک شعر میں کیا کچھ نہیں ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں۔ ان من البیان لسحر!

مقصدِ قدرت

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں
نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی!
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شئے کی حقیقت ہوں

(۳۹)

پھر کیا؟

یہ زندگی کتنے دن کی ہے؟ زندگی کا یہ ٹھاٹھ کتنے روز کا مہمان ہے؟ آنکھ بند ہوئی، اور سب کچھ دوسروں کا۔ نظیر اکبر آبادی نے سچ تو کہا ہے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

لیکن اس چند روزہ زندگی کے لئے ہم نے کیسے کیسے حدود قائم کر رکھے ہیں؟ یہ غریب ہے وہ امیر ہے؟ یہ مزدور ہے وہ سرمایہ دار ہے۔ یہ کاشتکار ہے وہ زمیندار ہے۔ یہ رعایا ہے وہ راعی ہے۔ یہ گدائے بے نوا ہے وہ شاہ کج کلاہ ہے۔ یہ اپنے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ وہ ملکوں اور ملتوں کو فتح کر لیتا ہے۔ یہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا۔ وہ سماء سے لے کر سمک تک، ہر چیز کو اپنا ہدف بنا لیتا ہے۔ یہ ننگا ہے، وہ موٹر کا مالک ہے طیاروں میں اڑتا ہے۔ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ اس کا بینک بیلنس حد و شمار سے خارج ہے۔ یہ پیادہ پا ہے، وہ شہسوار ہے، یہ ایک ایک نوالہ کو ترستا ہے وہ اپنے دستر خوان پر دنیا جہان کی نعمتیں رکھتا ہے۔ یہ فاقہ کشی کے باعث دم توڑ رہا ہے۔ وہ شکم پری

کے سبب لب گور ہے، اس کے پاس پیسہ نہیں کہ کتاب لے اور پڑھے، اس کے پاس روپیہ ہے لیکن وہ علم و مطالعہ کی اہمیت نہیں محسوس کرتا۔

غرض، اس دنیا میں لوگوں نے از خود برتری اور کمتری کے حدود قائم کر رکھے ہیں۔ اونچ نیچ کی دیواریں قائم کر لی ہیں۔ مگر کوئی نہیں سوچتا اس چند روزہ زندگی میں یہ افتراق، یہ جذبۂ تفوق، یہ احساس برتری، کوئی معنی نہیں رکھتا، ایک دن موت آئے گی اور کون کہہ سکتا ہے وہ خود بخود ختم ہو جائے، گوشۂ قبر ایک ایسی دنیا ہے جہاں شاہ و گدا ایک ہو جاتے ہیں، امیر و غریب کا امتیاز قائم نہیں رہتا، موت ہر کسی کو آتی ہے اور مرنے کے بعد ہر ایک کا بدن سڑتا گلتا اور کیڑوں مکوڑوں کی غذا بنتا ہے، جب ہماری کائنات صرف یہ ہے، پھر ایک مختصر مدت کے لئے، انسانیت میں تفریق کرنا، اور پست و بلند کے مدارج قائم کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟

اقبالؔ نے اسی خیال کو بڑے ستھرے اور شائستہ انداز میں، ایک مقام پر پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

رہین شکوۂ ایام ہے زباں میری
تری مراد پہ ہے دور آسماں پھر کیا!

ہاں ——— میں ناکام ہوں، نامراد ہوں، حرماں نصیب ہوں، جو چاہتا ہوں، نہیں پاتا، جو مانگتا ہوں نہیں ملتا۔ میری ہر خواہش ہیچ، میری ہر آرزو بیکار، اور تو کامیاب ہے، بامراد ہے، جو چاہتا ہے، ہوتا ہے، جو مانگتا ہے پاتا ہے، جو مانگتا ہے ملتا ہے،...... مجھ میں، اور تجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے ——— لیکن کیا یہ فرق

میرے اور تیرے انجام میں بھی قائم رہے گا۔

رکھا مجھے چمن آوارہ مثلِ موجِ نسیم
عطا فلک نے کیا تجھ کو آشیاں پھر کیا؟

مانتا ہوں، میں آشفتہ حال، اور پریشان روزگار ہوں، میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کوئی مقام نہیں، کوئی مسکن نہیں، موجِ نسیم کی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہتا ہوں اور تجھے خدا نے آستان و ایوان عطا کر رکھا ہے، تو صاحبِ نشیمن ہے تو کاشانہ کا مالک ہے، جہاں صرف تو ہی نہیں رہتا تیرے بہت سے متوسلین بھی رہتے ہیں، لیکن یہ تو بتا، کیا میری طرح تو بھی نہیں مرے گا؟ کیا میری طرح تو بھی اس دنیا سے خالی ہاتھ نہیں جائے گا؟

فزوں ہے سود سے سرمایۂ حیات ترا!
مرے نصیب میں ہے کاوشِ زیاں پھر کیا؟

یہ بھی درست ہے کہ روپیہ، روپیہ کو کھینچتا ہے، تیرا ہاتھ نہیں پارس پتھر ہے، تو مسِ خام کو کیمیا بنا سکتا ہے، تو خاک کو سونا بنا سکتا ہے، تیرے گھر میں ہن برستا ہے۔ دولت تیرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ امارت تیرے جلو میں چلتی ہے، اور میرا یہ حال ہے کہ کنگال ہوں، سعی کرتا ہوں، محنت کرتا ہوں، لیکن نقصان اور خسارہ کے سوا کچھ میرے ہاتھ نہیں آتا، تیرا سرمایہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا رہتا ہے اور میری پونجی جو پہلے ہی کچھ نہ تھی، گھٹتے گھٹتے ختم ہوتی جارہی ہے لیکن کیا اس صورتِ حال کو موت آکر ختم نہیں کردے گی؟ کیا موت کا فیصلہ ہم دونوں میں مساوات نہیں قائم کردے گا؟ کیا پھر وہ من و تو کا یہ امتیاز قائم رہے گا؟

ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں تیرے طیّارے
مرا جہاز ہے محروم بادباں پھر کیا؟

اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا، تو وہ ہے کہ فضا کی پنہائیاں تیرے طیاروں کے لئے تنگ ہے، اور میری ٹوٹی پھوٹی کشتی، بادبان تک سے محروم ہے تو منزل مقصود تک لمحوں میں پہنچ سکتا ہے اور میں ناخدا کی منت سماجت کے باوجود منزل تک پہنچنے کی آس نہیں قائم کرسکتا، لیکن انجام کار، گوشۂ قبر میں ہم دونوں ملیں گے، تو بالکل یکساں ہوں گے۔

بہ ہیچ گونہ دریں گلستاں قرار ما نیست!
تو گر یار شدی، ما خزاں شرع چہ شد!

اس گلزارِ حیات میں ایک لمحہ بھی ثبات و قرار کا میسر نہیں آتا تو بہار ہے میں خزاں ہوں، لیکن کل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں بہار بن جاؤں اور تو خزاں کی صورت میں نظر آئے۔ انقلاباتِ عالم کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اور ایسا نہ ہو تو بھی زندگی کے چند دن گزار لینے کے بعد ابدی زندگی کے دروازے پر ہم دونوں جب قدم رکھیں گے، تو یہ فرق و امتیاز مٹ چکا ہوگا۔ پھر یہ پندار کیوں؟ اور نخوت کس لئے؟

(۴۰)

جواب لاجواب

جو تمام صلاحیتیں ایک لیڈر میں ہونی چاہئیں، اقبال میں موجود تھیں،
وہ انگریزی زبان پر۔ خواہ تقریر ہو یا تحریر۔ غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔
علوم عصریہ سے بہت اچھی طرح واقف تھے، بلکہ ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔
سیاسیاتِ عالم اور سیاستِ وطنی کے ایک ایک پہلو پر ان کی نگاہ تھی۔
مسلمانوں کی تجدیدِ حیات کے لئے وہ سرگرم عمل تھے۔ سحرِ فرنگ کے خلاف
اپنے اشعار میں جادو بھرے خیالات ظاہر کیا کرتے تھے، غلامی کے خلاف
وہ مسلسل شاعرانہ جہاد میں مصروف تھے، غرض اگر وہ پبلک پلیٹ فارم پر
آتے تو کسی سے پیچھے نہ رہتے۔ بہت جلد، اور بڑی آسانی سے، وہ عوام میں
بھی اقتدار حاصل کر لیتے اور حکومت کی نظر میں بھی چڑھ جاتے۔ پھر ان کے
لئے وائسرائے یا گورنر کی اکزیکٹو کونسل کا ممبر نامزد ہونا، اور پانچ ہزار روپیہ
ماہوار تنخواہ لینا بہت آسان ہو جاتا۔ لیکن یہ باتیں ان کی طبیعت اور مزاج کے
خلاف تھیں۔ وہ قیادت کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کے باوجود،

اس طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد!
پر طبیعت ادھر نہیں آتی!

وہ جانتے تھے، لیڈری، کتنی منفعت بخش چیز ہے اور ان کے بہت سے ساتھیوں اور دوستوں نے اس سونے کی چڑیا سے کتنا غیر معمولی فائدہ اُٹھایا ہے۔ پھر بھی وہ اس طرف ملتفت نہیں ہوتے تھے۔

اقبال کے معزز دوست اصرار کے ساتھ انہیں سیاسیات میں حصّہ لینے، اور پبلک پلیٹ فارم پر آجانے کی ترغیب دیا کرتے تھے، یقیناً ان کا یہ اصرار خلوص ہی پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ اس سے متاثر ہو کر کچھ دنوں کے لئے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی بھاری کثرتِ آراء سے اپنے دولت مند حریف اور مقابل کو پچھاڑ کر منتخب ہو گئے تھے۔ لیکن یہ ایک عارضی اور اتفاقی حادثہ تھا۔ دراصل ان چیزوں پر نہ وہ مائل تھے، نہ مشتاق، وہ اپنے گوشۂ عزلت میں بڑے آرام سے تھے۔

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اگر وہ سیاست کے کارزار سے اپنا دامن الجھاتے، تو ان کی وہ صلاحیتیں پردۂ خفا میں رہ جاتیں، جن کے بارے میں گرامی نے کہا ہے:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

یہی وجہ ہے کہ جب ان سے اس طرح کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو وہ بے تامل، صاف اور واضح الفاظ میں معذرت کر دیتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ ان کے کسی دوست نے ازراہ اخلاص صلاح دی کہ شاعری سے قطع تعلق کیجئے۔ بیرسٹری کو سلام کیجئے میدان میں آیئے۔ اپنی قیادت کا جوہر چمکایئے اور حریفوں کو بڑی آسانی سے مات دے دیجئے۔

لیکن اقبال نے شکریہ کے ساتھ یہ پیش کش مسترد کر دی۔

ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری!
ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش

اور لیڈر دماغِ فتنہ تراش کے بغیر بیکار ہے۔

مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز
جہاں میں ہوں میں مثالِ سحاب دریا پاش

لہٰذا، اے دوست!

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

(۱۴)

مایوسی

کبھی کبھی، اقبال مایوس بھی ہو جاتے تھے ــــ وہ سوچتے تھے، جس چمن میں نوائے بلبل اور صدائے گل نہ سُنی جاتی ہو وہاں رہنے سے کیا فائدہ؟ کبھی کبھی وہ یہ بھی غور کرتے تھے کہیں ایسا تو نہیں یہ زمین ہی شور ہے۔ یہاں چاہے جتنے پہلے بیج ڈالے جائیں۔ لیکن فصل نہیں اُگ سکتی؟ انھوں نے زندگی کا بڑا حصّہ، اپنی قوم کو بیدار کرنے میں صرف کیا، لیکن ان کی آنکھوں کے سامنے کوئی ایسا منظر نہیں آیا جسے دیکھ کر وہ خیال کر سکتے کہ ان کی آہ رنگ لا رہی ہے، ان کا نالہ سُنا جا رہا ہے؟ ان کے پیام پر توجہ کی جا رہی ہے۔

اقبال ان لوگوں میں تھے، جو نتائج سے بے پروا ہو کر میدانِ عمل میں گام فرسا ہوتے ہیں۔

احسان ناخدا کا اُٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

انھوں نے اپنا ایک راستہ معین کر لیا تھا، اور اس پر استقلال

و عزیمت کے ساتھ گام فرسا تھے، لیکن جب یہ دیکھتے تھے کہ ان کی نوائے جگر خراش پر کان نہیں دھرے جاتے تو مایوسی ان پر غالب آجاتی تھی۔ چنانچہ اس عالم میں کہتے ہیں:

کہاں اقبال تو نے آ بنایا آشیاں اپنا
نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامانِ رسوائی

یعنی اے اقبال تو کس مقام پر آکر پھنس گیا ہے؛ تو وہاں نغمہ سرائی کر رہا ہے۔ جہاں سُننے والے نہیں، جنھیں تو اپنے نغمے سُناتا ہے۔ یہ گو کان رکھتے ہیں، لیکن بہرے ہیں۔ دل رکھتے ہیں مگر احساس کی نعمت سے محروم ہیں، دماغ کے مالک ہیں لیکن سوچنا گناہ سمجھتے ہیں۔ صاحبِ دل بھی ہیں لیکن ان کا دل گوشت کا لوتھڑا نہیں۔ پتھر کا ٹکڑا ہے، ایسے لوگوں کے سامنے نغمہ سرائی کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے، خود اپنے آپ کو رسوا کرنا، اور اپنے اخلاص کو متہم کرنا ہے، تو نے نغمہ سرائی کے لئے جو مقام منتخب کیا ہے وہ بالکل غلط اور قطعاً ناموزوں ہے۔ اگر آشیاں بنانا ہی تھا تو کسی ایسی جگہ بنایا ہوتا جہاں حسّاس اور دردمند لوگ ہوتے جو نوائے شاعر پر توجہ کرتے۔

شرارے وادیٔ ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن
نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخمِ سینائی

جو زمین اتنی بنجر ہو چکی ہے کہ وہاں چارے اور اناج کی تخم ریزی بھی بیکار اور لاحاصل ہے، تو اس کے بارے میں اتنا حسنِ ظن رکھتا ہے کہ وہاں وادیٔ ایمن

کے شرارے بو رہا ہے، نادان عقل سے کام لے۔ یہ وہ زمین نہیں، جو سر سبز ہو سکے، جہاں تیرے شرارے برگ و بار لا سکیں اور تیری ملت میں گدازِ قلب پیدا کر سکیں۔

کلی زورِ نفس سے بھی وہاں گُل ہو نہیں سکتی
جہاں ہر شئے سے ہو محروم تقاضائے خود افزائی

جہاں کی زمین اتنی بنجر ہو، جہاں کا پانی اتنا شور ہو۔ وہاں تو فصلِ گل کی توقع کرتا ہے، تیرا خیال ہے وہاں نسرین و نسترن کی کلیاں پھولیں گی۔ گلاب اور یاسمین کے پھول کھلیں گے وہاں؟ —— یہ تیری سادہ لوحی ہے، جہاں ہر چیز خود افزائی کے تقاضے سے محروم ہو، یعنی زندگی اور زندگی کی تڑپ سے ناآشنا ہو، وہاں کسی طرح اگر کلی نکل بھی آئے اور وہ لاکھ زور مارے، لیکن پھول نہیں بن سکتی۔ وہاں کبھی اور کسی صورت سے شاخِ گل سرسبز نہیں ہو سکتی۔

قیامت ہے کہ فطرت سو گئی اہلِ گلستاں کی
نہ ہے بیدار دل پیری، نہ ہمت خواہ برنائی

حالت تو یہ ہے کہ جہاں تو نے آشیانہ بنایا ہے، جہاں تو نغمہ سرائی کر رہا ہے، وہاں کے لوگ خوابِ ابد میں مصروف ہو چکے ہیں۔ ان کی فطرت مر چکی ہے۔ ان میں کوئی حوصلہ نہیں، کوئی امنگ نہیں، جہاں نہ بوڑھوں کے دل بیدار ہیں نہ جوانوں میں ہمت اور ذوق و شوق ہے، ان حالات میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

تمہید میں یہ ساری باتیں بیان کر کے یعنی مایوسی اور ناکامی کی داستان

سُنا چکنے کے بعد خود اپنے آپ کو مشورہ دیتے ہیں۔

نہیں ضبطِ نوا ممکن تو اُڑ جا اس گلستاں سے
کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرا کی تنہائی

اور اگر تو ضبطِ نوا پر قادر نہیں، تو کہنا مان' یہاں نہ رہ، پر پرواز پیدا کر اور اُڑ جا، یہاں کی محفل آرائیوں کے مقابلہ میں صحرا کی تنہائی ہزار درجہ غنیمت ہے۔

---

(۲۴)

دین و مذہب

حقیقت یہ ہے کہ لادینی قومیں، مادّی نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی ترقی کرلیں، لیکن ان کے اخلاقی اقدار، حددرجہ پست اور رکیک ہوتے ہیں، یہ قومیں خدا کو نہیں مانتیں لہٰذا خدا کے بنائے ہوئے نظامِ حیات کو بھی تسلیم نہیں کرتیں۔ انھوں نے اپنے دماغ سے سوچ کر کچھ ضابطے مقرر کرلئے ہیں۔ کچھ قاعدے بنالئے ہیں۔ ایک نظام تیار کردیا ہے۔ اور سمجھ لیا ہے کہ کام ہوگیا اور انسانیت سدھر گئی، اور کائنات کے تمام دکھوں کا علاج ہوگیا۔

لیکن ان رہنمایانِ اقوام کے کردار و سیرت پر اگر ایک نظر ڈالی جائے، تو بہت جلد یہ حقیقت واشگاف ہوجائے گی کہ یہ خود بہت زیادہ اخلاقی اعتبار سے علیل و مریض ہیں۔ جب انہیں کسوٹی پر کسا جاتا ہے تو یہ خود اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر بھی پوری نہیں اترتیں۔ جنگ سے متعلق، انسانی "نقطۂ نظر سے انھوں نے بہت سے قاعدے اور قانون بنا رکھے ہیں اور انہیں بین الاقوامی طور پر تسلیم بھی کیا جاچکا ہے لیکن جنگ شروع ہوتی ہے تو یہ ضابطے اور

قامتِ بالائے طاق رکھے رہ جاتے ہیں، اور بری طرح ان کا بھرم کھل جاتا ہے۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

جنگ کے زمانے میں، اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکل جاتا ہے اور حقیقت آئینہ کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ یہ قومیں، جنھیں اپنی انسانیت نوازی پر ناز ہے، اور جنھیں اپنے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ ان سے بڑھ کر انسان دوست کوئی نہیں۔ جنگ کے زمانے میں ہسپتالوں پر بمباری کرنے سے نہیں چوکتیں، جاپان کے ہیروشیما پر بم پھینکنے والا کوئی غیر مہذب ملک نہ تھا، بلکہ دنیا کا سب سے بڑا اور مہذب ملک امریکہ تھا، جو لوگ اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے شکنجۂ تعزیر و عقوبت میں کسے جاتے ہیں۔ ان کی داستانِ درد کسے نہیں معلوم ؟ دوسری جنگِ عظیم میں صرف ہٹلر، مسولینی، سٹالن اور ٹوجو ہی نے اپنے جنگی قیدیوں کے ساتھ سفاکانہ اور غیر انسانی اور لرزہ خیز برتاؤ نہیں کیا، امریکہ برطانیہ اور فرانس نے بھی موقع پانے کے بعد کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان لوگوں نے ایک اصول یہ بھی وضع کیا ہے کہ جو لوگ شکست کھا جائیں ان کی کمر توڑ دو۔ انہیں ذلیل کرو۔ انہیں عبرت انگیز سزا دو۔ اور آغازِ جنگ سے پہلے کے جرائم میں انہیں متہم کرو، اور خود صرف انہیں بلکہ ان کے متعلقین تک کو ناقابلِ برداشت سزا دو، تاکہ دوسرے سبق حاصل کریں، غور کیجئے، تو یہ سب کچھ کرشمہ ہے لادینی نظامِ حکومت، اور اندازِ جہاں بانی کا۔

اسلام، ایک دین ہے، ایک مذہب ہے ایک ضابطۂ حیات ہے اور اس کی یہ حیثیت کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ تمام تر خدا کے احکام و فرمان

سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف لفظ و عبارت کے لحاظ سے یہ آئینِ آسمانی ہے، بلکہ اس پر عمل کرنے والوں نے یہ ثابت کر دیا کہ صرف آسمانی نظام ہی اتنا انسانیت دوست، اور اتنا مکمل ہو سکتا ہے۔ ذرا تصور تو کیجئے، آج سے چودہ سو برس پہلے کی جنگوں کا، اس وقت نہ کوئی برطانیہ تھا، نہ امریکہ، نہ فرانس، نہ روس، ساری دنیا پر عام طور پر اور عرب خطہ پر خاص طور پر جنگل کی حکومت کارفرما تھی، جو میدانِ جنگ میں گرفتار ہوا وہ یا تو قتل کر ڈالا گیا، یا غلام بنا لیا گیا لیکن اسلام ایک خدائی مذہب ــــ نے اسے یکسر بدل ڈالا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ جنگ کے دوران میں کسی عورت کو کسی بچہ کو، کسی بوڑھے کو، اور کسی غیر جنگ آزما شخص کو، خواہ وہ کتنا ہی تندرست و توانا ہو اور جنگ کی غیر معمولی صلاحیتوں سے کیوں نہ بہرہ ور ہو قتل نہیں کیا جا سکتا، کسی درخت کو نہیں کاٹا جا سکتا۔ کسی کھیت کو نہیں جلایا جا سکتا، کوئی مکان نہیں ڈھایا جا سکتا، کسی پر ناقابلِ برداشت تاوانِ جنگ نہیں عائد کیا جا سکتا۔ صرف مالِ غنیمت ہی کو تاوانِ جنگ خیال کیا جا سکتا ہے، اور جنگ ختم ہونے کے بعد، جو لوگ میدانِ جنگ میں گرفتار ہوں، ان کے ساتھ دو ہی سلوک کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) یا تو فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جائے۔

(۲) یا احسان رکھ کر انہیں آزادی عطا کر دی جائے۔

اس کے سوا کوئی تیسری صورت اسلام نے تجویز نہیں کی ہے، مکہ میں ۱۲ سال تک، جن لوگوں نے روح فرسا اذیتیں رسالت مآبؐ کو پہنچائی تھیں اور مسلمانوں پر خواب و خور حرام کر دیا تھا، جنھوں نے دعوتِ اسلام کو ناکام بنانے

کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا اور ہر رنگ انسانیت سوز حرکت کا مظاہرہ کیا تھا، ایسی حرکتیں اگر وہ آپ کے زمانے میں کرتے، تو امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس مل کر، ان سب کو مجتمع کرتے اور ان پر ہائیڈروجن بم کی مشق شروع کر دیتے، لیکن ایک آسمانی مذہب کے پیغمبرؐ نے ایسا نہیں کیا۔ اسؐ نے بھرے مجمع میں ان خطاکاروں اور بدنہادوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔

لا تثریب علیکم الیوم فاذہبوا انتم الطلقاء۔

آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں ہے، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

جو لوگ یہ سوچ کر جمع ہوئے تھے کہ مرنے کے لئے جا رہے ہیں، وہ زندگی کی سوغات لے کر اپنے گھر واپس آ گئے ــــ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ تھیں وہ چیزیں، جنھوں نے اقبالؔ کے دل میں گھر کر لیا تھا اور وہ دنیا کو یہ دعوت دینے پر مجبور ہو گئے تھے کہ وہ اسلام کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے اور مسلمانوں سے تو وہ صرف یہی ایک حرف بار بار نئے لہجے اور نئے الفاظ میں کہا کرتے تھے۔

ہو تری خاک کے ہر ذرّہ سے تعمیر حرم
دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر

جب تک تو اے مردِ مسلمان اپنے دل کو فرنگی اثر سے آزاد نہیں کر لیتا، تیری خاک کے ذرّے تعمیرِ حرم کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے، حالانکہ ضرورت اسی کی ہے کہ وہ صرف اسی میں لگے رہیں۔

پھر ابھارتے ہیں:

اے رہروِ فرزانہ رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو

جانتے ہیں اور ہر اہلِ دل کو بتاتے ہیں کہ دارالامان صرف رحمۃ اللعالمینؐ کا دامن ہے، اور کچھ نہیں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

اپنا جائزہ لیتے ہیں تو کہتے ہیں:

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخم ہائے عجم رہا!
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ مری نوا عربی رہی!

مسلمان کو یقین دلاتے ہیں:

اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر
آیۂ لا یخلف المیعاد، رکھ!

اور جب دیکھتے ہیں کہ مسلمان اس سبق سے غافل ہے، تو بادِ صبا کو پیامبر بناتے ہیں۔

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

پھر مسلمان سے مخاطب ہوتے ہیں، اپنا اور اس کا تقابل کرتے ہیں:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا ، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آذری
میں نوائے سوختہ در گلو ، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم، گروِ عجم، ترا دیں خریدۂ کافری

---

(۴۳)

کچھ اپنے متعلق

پیامِ مشرق، اقبالؔ کی معرکہ آرا کتابوں میں ہے، یہ وہی دیوان ہے، جو شاعر المانوی (جرمنی) گوئٹے کے جواب میں اقبالؔ کے قلم سے نکلا ہے، اس کے دیباچہ میں اقبالؔ کہتے ہیں

" پیامِ مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن
"حکیمِ حیات" گوئٹے کا مغربی دیوان ہے
جس کی نسبت جرمن کا اسرائیلی شاعر
ہائنا لکھتا ہے کہ یہ" ایک گلدستۂ
عقیدت ہے، جو مغرب نے مشرق
کو بھیجا ہے، اس دیوان سے اس امر
کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور
اور سرد رُوحانیت سے بیزار ہو کر،
مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔

آگے چل کر علامہ فرماتے ہیں:

۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمہ کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا، حافظ کے ترنم نے اس کے (گوئٹے کے) تخیلات میں ایک ہیجانِ عظیم برپا کر دیا، بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ حافظ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے. گوئٹے کا سوانح نگار بیل سوشکی لکھتا ہے! ـــ "بلبلِ شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی ۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ شاید میری روح حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔!

حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیلات میں عطار، سعدی، فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنونِ احسان ہے، ایک آدھ جگہ ردیف قافیہ کی قید سے غزل بھی لکھی ہے۔ اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی، (مثلاً گوہرِ اشعار، تیرِ مژگاں" زلفِ گرہ گیر، بے تکلف استعمال کرتا ہے، بلکہ فارسیت کے جوش میں امرد پرستی کی طرف اشارات کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتا، اس کے دیوان کے مختلف حصوں کے نام بھی فارسی میں مثلاً مغنی نامہ، ساقی نامہ، عشق نامہ،

پھر علامہ اپنے دیوان "پیامِ مشرق" کے بارے میں فرماتے ہیں:

"پیامِ مشرق" مغربی دیوان سے سو سال بعد لکھا گیا ہے،
اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی، اور ملی حقائق کو پیش کرنا ہے
جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے، سو سال پیشتر
کے جرمنی، اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ مماثلت ضرور ہے، لیکن
حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب ایک بہت بڑے
روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم
ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً اس پہلو
سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت،
ایک نیا آدم اور ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی
مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ
محسوس کر لینا چاہیئے، کہ زندگی اپنی خودی میں کسی قسم کا انقلاب
نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں
انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی
جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو،
فطرت کا یہ اٹل قانون، جس کو قرآنِ مجید نے ان اللہ لا یغیر
ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ انداز
میں بیان کیا ہے۔ میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت
کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے،

اقبال نے، جو دیباچہ پیامِ مشرق کا لکھا ہے اس کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں ہم نے پیش کر دیا ہے، اس سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پیامِ مشرق کا محرک کیا ہے؟ کس فضا اور کن حالات میں اقبال کی زبان پر، یہ اشعار نازل ہوئے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ پیامِ مشرق' اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے' اپنے پیام اور رُوح کی حیثیت سے اپنے فکر و خیال کے لحاظ سے' ایک مقامِ خاص پر فائز ہے، جس زمانے میں" پیامِ مشرق" منظرِ عام پر آئی (۱۹۲۳ء) اس وقت غازی امان اللہ خان کا طوطی بول رہا تھا' وہ اسلامی دنیا میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے فرنگی استعمار کے پنجہ سے اپنے ملک کو نیا نیا آزاد کرایا تھا۔ ان کے ولولے تازہ تھے حوصلے بلند تھے۔ ہر شخص انہیں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور ہندوستان کے مظلوم و غلام مسلمان تو خاص طور پر انہیں، آیت من آیات اللہ سمجھ رہے تھے۔ اقبال نے اپنی یہ معرکہ آرا کتاب انہی کے نام معنون کی۔

یہ تمہید بڑا دلکش ہے، شاعر نے ایک ایک شعر میں اپنی روح سمودی ہے۔ اس وقت امان اللہ خان کی شخصیت، اور ان کے بارے میں اقبال کے خیالات سے ہمیں بحث نہیں ہے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے اور خدا کو منظور ہوا تو اس پر کسی دوسری مجلس میں گفتگو ہو گی۔ اس کتاب میں ہم جو چیز زیرِ بحث لائیں گے' وہ وہی ہو گی جس کا تعلق' اقبال کی ذات سے ہے، یا ان خیالات سے جو اقبال نے وقتاً فوقتاً اپنے بارے میں ظاہر کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ضمنی طور پر، اگر کچھ اور مباحث آجائیں تو دوسری بات ہے کیونکہ اس کتاب میں ہم جو کچھ بتانا

چاہتے ہیں وہ یہی ہے کہ اپنے اشعار کے آئینہ میں اقبال کیسے دکھائی دیتے ہیں؛ یعنی کلام اقبال پڑھ کر اگر کوئی شخص اقبال کو پرکھنا جانچنا اور جاننا چاہے تو وہ کیا رائے قائم کرے گا؟

اقبال، "پیام مشرق" کا نذرانہ لے کر، شاہ افغانستان، امان اللہ خاں غازی کے حضور میں گویا پہنچتے ہیں اور ایک عقیدہ مدحیہ کے ساتھ اسے پیش کرتے ہیں۔ اس وقت وہ سراپا جذبات بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ جانتے ہیں، میری بات اگر اس کے دل میں اتر گئی تو کام بن گیا، میں فقیر بے نوا ہوں، صرف نغمہ سرائی کر سکتا ہوں۔ یہ تاج دار، اور شہریار ہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔ میرے افکار و خیالات کو عملی جامہ بھی پہنا سکتا ہے۔ میرے پیش کردہ نظام کو صرف یہی بروئے کار لا سکتا ہے۔ جو خواب میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا ہوں، اور جو میری زندگی کا مقصد بن چکا ہے۔ اس کی تعبیر اس شاہِ کج کلاہ کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن میری بات اس کے دل میں اس وقت تک نہیں اتر سکتی۔ جب تک یہ میرے ظاہر و باطن سے میری صورت اور سیرت سے میری گفتار و کردار سے واقف نہ ہو جائیں، اگر اس نے صرف مجھے ایک قصیدہ گو شاعر سمجھا تو کیا سمجھا؟ پھر نہ میرا مقصد حاصل ہوگا نہ یہ کوئی ترقی کر سکے گا۔ لہٰذا اس قصیدے میں کافی زور اس پر لگاتے ہیں کہ صحیح طور پر اپنا تعارف کرا دیں، تاکہ غازی امان اللہ خان مغالطہ میں نہ رہیں۔ شاعر کے اصل مقام اور حیثیت سے آشنا ہو جائیں، اپنے تعارف پر جو زور انھوں نے صرف کیا ہے، وہ تعلّی اور خود ستائی کے لئے نہیں بلکہ ایک

نیک اور اچھے مقصد کو بروئے کار لانے کے لیئے۔

بادشاہ کی تعریف و توصیف سے عہدہ برآ ہونے کے بعد کہتے ہیں :

تا مرا رمزِ حیات آموختند!
آتشے در پیکرم افروختند!

خدا نے مجھے رمزِ حیات کا محرم بنا دیا ہے اور میرے تن میں ایک ایسی آگ بھر دی ہے جس نے مجھے شعلہ بنا دیا ہے۔

یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام
عشق را عہدِ شباب آوردہ ام

اور اس شعلہ نے مجھے نوائے سینہ تاب عطا کردی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں نے عشق کو جو مردہ دلوں میں رہ کر مردہ و افسردہ ہو چکا تھا، عہدِ شباب عطا کیا ہے اب پھر وہ جوان ہے، اور اس میں امنگ ہے، حوصلہ ہے، ولولہ ہے، حصولِ مقصد کی تڑپ ہے۔

اس کے بعد وہ گوئٹے کا تعارف بادشاہ سے کراتے ہیں۔

پیرِ مغرب، شاعرِ المانوی!
آں قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی!

جرمنی کا شاعرِ بے بدل، ـــــ گوئٹے جو فارسی ادبیات اور شعر و سخن کا دلدادہ تھا۔

بست نقشِ شاہدانِ شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ

اس نے مغربی دیوان لکھ کر، مشرق کی خدمت میں سلام کا نذرانہ پیش کیا ہے۔

در جوابش گفتہ ام پیغامِ شرق
ماہتابے ریختم بر شامِ شرق

میں نے "پیامِ مشرق" اس کے جواب میں لکھا ہے اور یہ لکھ کر مشرق کی اندھیری رات میں چاند جگمگا دیا ہے۔

اب، اپنا اور گوئٹے کا تقابل کرتے ہیں!

رونقِ افرنگی جواناں مثلِ برق!
شعلۂ من از دمِ پیرانِ شرق

وہ فرنگ کا رہنے والا تھا، چالاک، چست، برق جہندہ، میرا شعلہ، پیرانِ مشرق کے فیضِ صحبت کا نتیجہ ہے۔

او چمن زادے چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ!

وہ ایک زندہ قوم کا فرد تھا، ایک زندہ قوم کے آغوش میں اس نے تربیت پائی تھی۔ وہ بے جھجک تھا، بے باک تھا، من چلا تھا۔ میں ایک مردہ زمین میں پیدا ہوا ہوں، زندگی سے ناآشنا، زندگی کی امنگوں سے محروم، زندگی کی تڑپ سے خالی، یہی تو خصوصیت ہے اس زمین کی!

او چو بلبل در چمن فردوسِ گوش
من بہ صحرا چوں جرس گرمِ خروش

وہ بلبل کی طرح چمن میں نغمہ سرائی کرتا تھا چہچہاتا تھا، اس پر کوئی پابندی نہیں تھی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی، کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ ہر قسم کی فکر سے اس کا دماغ خالی تھا، جو کچھ کہتا تھا، اس کی قوم گوش و ہوش سے سنتی تھی، اس کی آواز پر کان دھرتی تھی۔ اس کی ترنم ریزیوں سے لطف لیتی تھی۔ اس کی نغمہ سرائی کا اثر قبول کرتی تھی، اس کے پیام پر کان دھرتی تھی۔ اس کی بات مانتی تھی۔ میری حالت یہ ہے کہ جس طرح صحرا اور ریگستان میں گھنٹہ بجتا ہے جس کی آواز کوئی نہیں سنتا، جس کی آواز کا جواب کوئی نہیں دیتا، صحرا میں سننے والے ماننے والے، جواب دینے والے کہاں سے آئے۔ میں بھی جرس کی طرح اگرچہ سرگرم فغاں ہوں، لیکن، بے نتیجہ،

گوشِ سخن شنوئی؟ دیدۂ اعتبار کو

صحرا اور ریگستان میں لاکھ ترنم ریزیاں کروں لیکن ان کا حاصل؟

ہر دو خنجر، صبح خند، آئینہ فام

او برہنہ من ہنوز اندر نیام

میں اور گوئٹے، فکر و خیال کے اعتبار سے یکساں بلندی پر فائز ہیں، ہم دونوں خنجر براں کی مانند، صیقل زدہ اور با آب و تاب ہیں۔ لیکن وہ ایک آزاد قوم کا فرد ہے۔ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شمشیر عریاں، میں بھی شمشیر آبدار ہوں، خنجر براں ہوں، میری کاٹ کا بھی کوئی جواب نہیں، میری آب و تاب سے ہی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن میں ایک غلام ملک کا باشندہ ہوں۔ ایک غلام قوم کا فرد ہوں لہٰذا میری مثال اس شمشیر کی مانند ہے

جو نیام کے اندر رہو، جسے نیام کے اندر سے باہر نکلنے اور اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ نہ ملا ہو۔ میرے خیالات سے، میرے فکرِ بلند سے، میرے پیام سے غفلت برتی جاتی ہے۔ مجھے ہیچ سمجھا جاتا ہے۔ میں اگرچہ تلوار ہوں لیکن زنگ آلود تلوار کی طرح اب تک کونے میں پڑا ہوں۔

آگے چل کر اس مفہوم کو اور زیادہ دل دوز انداز میں بیان کرتے ہیں؛

ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
رو ز خوش در تہِ قلزم تپید
تا گریبانِ صدف را امید
من بآغوشِ صدف تابم ہنوز
در ضمیرِ بحر نایابم ہنوز

یعنی ہم دونوں ایک ہی دریائے ناپیدا کنار کے گوہر ارجمند ہیں لیکن دونوں کا نصیب الگ الگ اور مقدر جدا جدا ہے۔ وہ دریا کی تہہ میں مچلا، اور گریبانِ صدف کے اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور میں آغوشِ صدف میں محبوس ہوں۔ میری چمک اور آب و تاب رائگاں جا رہی ہے۔ نہ کوئی دیکھنے والا ہے۔ نہ کوئی پوچھنے والا،

آشنائے من ز من بیگانہ رفت!
از خمستانم تہی پیمانہ رفت!

میرا کوئی آشنا نہیں، اور جو ہے بھی، وہ آشنا ہونے کے باوجود،

میرے لئے اجنبی اور غیر ہے، اس لئے کہ مجھے پہچانتا نہیں ہے میری آواز کو، میرے پیام کو، وہ میرے خمکدہ میں آتا ہے لیکن اپنا پیمانہ خالی واپس لے جاتا ہے۔ یہ پیمانہ بھرے تو اس وقت جب وہ میری شراب فکر کا جلوہ دیکھے۔

من شکوہ خسروی او دہم
تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم

میں تو اسے شکوہ خسروی عطا کرتا ہوں، تختِ کسریٰ اس کے قدموں کے نیچے لاکر ڈال دیتا ہوں، یعنی اگر وہ میری بات سمجھے، میرے پیام پر غور کرے اور اپنی زندگی اس انقلاب سے آشنا کرے، جو میں لانا چاہتا ہوں تو وہ شکوہ خسروی اور تخت کسریٰ کا مالک بڑی آسانی سے بن سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں کرتا، بلکہ ـــــ

او حدیثِ دل بری خواہد زمن!
رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن

وہ چاہتا ہے کہ میں، اسے عشق و ہوس کی داستانیں نظم کر کر کے سناؤں، اس میں، اسلامیت کی جو روح میں پیدا کرنا چاہتا ہوں، اس سے دستبردار ہو جاؤں اور اسے عیش و عشرت فسق و معصیت نجاست اور آلودگی کی زندگی کی طرف راغب کروں اس وقت کے دوسرے شعرا جس طرح، ہوسناکی، اور رندی، عیاشی اور عشرت پسندی کے خیالات، دل آویز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ میں بھی وہی کروں۔

کم نظر بیتابی جانم نہ دید

آشکارم دید و پنہانم ندید

اس نے میری بیتابی جان پر نظر نہ ڈالی۔ صرف میرا سراپا دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اس نے یہ تو دیکھ لیا کہ میں شاعر ہوں۔ لیکن میرا پیام کیا ہے؟ اس پر غور نہ کر سکا۔ اس نے یہ دیکھ لیا کہ میں ساز ہوں، لیکن میرے اندر سے لَے کس طرح کی نکلتی ہے۔ یہ اس نے کبھی نہ سوچا۔ اس نے اپنی عیش و عشرت کی فکر رکھی، میری تاب و تواں اور سوز و ساز کی طرف ذرا بھی راغب نہ ہوا

حق رموزِ ملک و دیں برمن کشود
نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود!

خدائے ملک و دیں کے اسرار و رموز مجھ پر فاش کرائے۔ حکمرانی کس طرح ہوتی ہے؟ قومیں کس طرح بنتی ہیں؟ ملتوں کی تعمیر کیونکر ہوتی ہے؟ انقلاباتِ عالم سے کیا سبق ملتا ہے؟ ملتِ اسلامیہ اپنی وضع و تشکیل میں کس اسلوبِ خاص کی حامل ہے؟ یہ ساری باتیں خدائے بزرگ و برتر نے مجھ پر فاش کر دیں، اور دوسروں کے شکوہ و تجمل کا رعب میرے دل سے ہٹا لیا، کوئی غیر الٰہی طاقت کوئی لادینی نظام، کوئی بادشاہ، جو اصولِ اسلام سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ میری نظر میں نہ اس کی وقعت ہے نہ اہمیت۔

برگِ گل رنگین ز مضمونِ من است!
مصرعۂ من قطرۂ خونِ من است!

اور میں کسی دوسرے کی پروا ہی کیوں کروں؟ خدا کا دیا ہوا میرے پاس کیا نہیں ہے؟ یہ برگِ گل کی رنگینی جس سے خلقت کی آنکھیں ٹھنڈی

ہوتی ہیں کہاں سے آتی ہے؟ میرے مضمون سے یہ رنگین لباس میرے کلام رنگین ہی نے تو برگِ گل کو پہنایا ہے۔ میری زبان سے جو شعر نکلتے ہیں۔ وہ صرف تک بندی نہیں ہوتی۔ قافیہ پیمائی نہیں موزونی طبع کا مظاہرہ نہیں ہوتا، بلکہ میرا ہر مصرعہ میرے خونِ جگر کا ایک قطرہ ہوتا ہے اور

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب!
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار کا!

کیا یہ کائنات میں کسی چیز سے کچھ کم حیثیت رکھتا ہے؟

از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند!
در دیارِ ہند خوارم کردہ اند!

قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو ایک طرف تو مجھے صاحبِ ہنر بنا دیا۔ دوسری طرف ایسے ملک میں پیدا کر کے خوار و رسوا کیا جہاں با ہنر ہونا عیب ہے۔

لالہ و گل از نوائم بے نصیب
طائرم در گلستانِ خود غریب

میرے نوا سنجی سے، میرے چمن کے لالہ و گل لطف نہیں لیتے۔ فائدہ نہیں اٹھاتے میرا طائر فکر خود اپنے چمن میں اجنبی ہے!۔ کیا یہ بہت بڑی ٹریجڈی نہیں؟ کیا اس سے بھی بڑا کوئی المیہ ہو سکتا ہے؟ اور بات تو یہ ہے کہ،

بس کہ گردون، سفلہ دوں پرور ست!
وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است

جب حال یہ ہے، تو پھر شکایت کیوں ہے اور شکوہ کیوں زبان پر لائیے۔ یہ میری غلطی تھی کہ — میں نے یہ نہ سوچا کہ یہ پیر گردوں ہمیشہ سے شعلہ پرور ہے۔

(۴۴)

سوز و سازِ آرزو

اقبال ہی نے کہا تھا۔

الٰہی تیرا جہاں کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ جہانِ گزراں، نگار خانۂ آرزو ہو یا نہ ہو، لیکن شاعر — اقبال — کا دل ضرور تھا، اس کا دل سچے معنوں میں محشر ستانِ جذبات، اور نگار خانۂ آرزو بنا ہوا تھا، یہی آرزو تھی جو اسے مثلِ بو پریشان رکھتی تھی، یہی حسرت تھی جس نے اسے آشفتہ اور حیران و پریشان کر رکھا تھا۔ وہ اس سے بے نیاز تھا کہ آرزو پوری ہوتی ہے یا نہیں۔ وہ اس کی پرواہ بھی نہیں کرتا تھا۔ آرزو کی تعیین کر لے یعنی معلوم یا نا معلوم آرزو کی، سوز و ساز میں زندگی گزار دینا، بجائے خود ایک مقصد ہے، ایک منزل ہے، اور وہ اسی طرف رواں دواں، اور اسی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ آرزو کی لذت بجائے خود بہت بڑی نعمت ہے، خواہ وہ پوری ہو یا نہ ہو، خواہ اس کا حصول ممکن ہو یا نہ ہو، اقبال کی زندگی شرارِ آرزو بن کر رہ گئی تھی۔ کبھی یہ شعلہ

بھڑک اٹھتا تھا، کبھی افسردہ ہو جاتا تھا۔ جب بھڑکتا تھا، تو جان و تن کو خاک کر دیتا تھا۔ جب افسردہ ہوتا تھا تو بھی اس کی تب و تاب خورشیدِ جہاں تاب سے چشمک زن رہتی تھی۔

اقبال کی زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے تو ایسا محسوس ہوگا، ان کی زندگی کا ہر دَور، خواہ طالب علمی کا ہو، قیام ہند کا ہو، یا انگلستان اور جرمنی کا، پروفیسری کا دَور ہو یا بیرسٹری کا، مفکّر کی حیثیت سے وہ روشناس ہو، یا شاعر کی حیثیت سے۔ سیاست داں بن کر نظر آئے ہوں، یا لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بن کر، گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کی ہو۔ یا دیارِ اندلس (اسپین) کے گورنر بن کر الحمرا، اور قصرِ زہرا، غرناطہ اور قرطبہ کے گلی کوچوں اور بام و در کا گشت کر رہے ہوں۔ عطیہ بیگم سے خط و کتابت کرتے نظر آتے ہوں، یا علّامہ سیّد سلیمان ندوی۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواری۔ اکبر الہ آبادی اور دوسرے مشاہیر سے نامہ و پیام میں مصروف ہوں۔ مسلم کانفرنس کے اسٹیج پر تقریر کر رہے ہوں، یا مسلم لیگ کا خطبۂ صدارت پڑھ رہے ہوں، غیر ملکیوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے وسائل پر غور کر رہے ہوں، یا پاکستان کا تخیل پیش کر کے اسے عملی جامہ پہنانے کی ترغیب ملّتِ اسلامیہ کو دے رہے ہوں۔ یا عالمِ اسلام کے حالِ زار پر خون کے آنسو رو رہے ہوں، مسلمانوں میں "نیشلزم" "قومیت" "وطنیت" اور اصولِ اسلام سے بیزاری کے مظاہر دیکھ رہے ہوں، یا بعض عربی ممالک کے نوجوانوں کی اولوالعزمیاں ان کی رگوں میں نیا خون پیدا کر رہی ہوں، خلافتِ اسلامیہ ترکیہ مٹ رہی ہو،

یا ایران پر تباہی، بربادی، اور ہلاکت کے بادل منڈلا رہے ہوں، یا عراق ہوسِ فرنگ کا تختۂ مشق بن رہا ہو۔ یا شام ولبنان پر فرانس کے طیارے بمباری کر رہے ہوں، ہر دَور اور ہر عہد میں اقبالؔ کا وجود سراپا اضطراب رہا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اقبالؔ نے کبھی کسی تحریک میں عملی حصّہ نہیں لیا، یا کم از کم یہ کہ قید وبند کی منزل تک وہ شریک نہیں رہے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ کم ہمت اور کم حوصلہ تھے۔ یہ تھا کہ وہ عملی آدمی نہیں تھے، اور شاعر عملی آدمی ہوتا بھی نہیں، دنیا کا سارا کام، تقسیمِ عمل کے اصول پر چلتا ہے ہر شخص نہ ہر کام کر سکتا ہے، نہ کرنا چاہیے۔ سیاست دان کا کام شاعر نہیں کر سکتا، شاعر کا کام لیڈر نہیں کر سکتا۔ دونوں کے راستے جدا ہیں، راہیں الگ ہیں، گو مقصد ایک ہی ہو۔ اقبالؔ نے بے شک کسی تحریک میں عملی حصّہ نہیں لیا۔ لیکن سیاسی تحریکوں کے لیڈروں سے کہیں بڑا کارنامہ انھوں نے انجام دیا۔ انھوں نے قوم کو مقصد دیا۔ منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کی۔ ایک نیا جذبہ دیا۔ بیداری پیدا کی۔ "بھٹکے ہوئے آہو" کو "سوئے حرم" پہنچا دیا، اور یہ وہ کارنامہ ہے جو کسی لیڈر، کسی قائد، کسی رہنما سے نہیں وجود پذیر ہوا اس پر بجا طور سے اقبالؔ فخر کر سکتے ہیں اور شاید انہیں فخر تھا ہی۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا، اقبالؔ کی ساری زندگی تب وتاب میں گزری، اور یہ میں ہی نہیں کہتا وہ خود کہتے ہیں۔

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم
نمی دانم چہ می خواہم، چہ جویم

بر آید آرزو یا بر نہ آید!
شہیدِ سوز و سازِ آرزویم

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگیٔ افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز

---

(۵۴)

نگاہم برتر از گردوں تنم خاک

رباعی بڑا مشکل فن ہے، چار مصرعوں کے قطعہ، اور چار مصرعوں میں بھی آخری مصرعہ کو روح کلام اور جانِ سخن بنا دینا ہر شخص کا کام نہیں۔

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ہر شاعر رباعی گو نہیں ہو سکتا اور ہو بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتا، فارسی اور اردو کے شعراء کی فہرست بڑی طویل ہے، اور اس طویل فہرست میں چند ہی ایسے نام ملیں گے جو اس باب میں امتیاز و اختصاص کے حامل ہیں۔

اقبال نے رباعیات پر بھی توجہ کی ہے اور حق یہ ہے کہ خوب کہی ہیں سیاست، تصوف، فلسفہ، نفسیات کون سا موضوع ہے جس کے سمندر کو انھوں نے رباعی کے کوزہ میں نہیں بند کیا ہے، اور جہاں خودی اور خود نگری، اور خود شناسی سے تعلق فرمایا ہے، وہاں تو اتنے اونچے اُڑے ہیں کہ ہر کہ و مہ کی نظر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ایسی دور کی کوڑی لاتے ہیں اور ایسی پتہ کی بات کہتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے — فرماتے ہیں۔

چو ذوق نغمہ ام در جلوت آرد
قیامت انگنم در محفلِ خویش
چو می خواہم ولے خلوت بگیرم
جہاں راگم کنم اندر دلِ خویش

اب ذرا اس رباعی سے اس رباعی کو ملا کر پڑھیے :

سریرِ کیقباد، اکلیلِ جم خاک
کلیسا و شبستان و حرم خاک
ولیکن من ندانم گوہرم چیست!
نگاہم برتر از گردوں، تنم خاک

ہے کوئی جواب اس بات کا

نگاہم برتر از گردوں تنم خاک؟

شعاعِ آفتاب

خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستی خاموش میں
پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں
مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے
جستجو میں لذتِ تنویر رکھتی ہے مجھے
برقِ آتش خو نہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں
مہرِ عالم تاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں

سرمہ بن کر چشم انساں میں سما جاؤں گی میں
رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں
تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے؟
سونے والے میں کسی کو ذوق بیداری بھی ہے؟

---

(۶۴)

حال و قال

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر اپنی کیفیت بیان کرتا ہے۔ اپنے احوال و مقامات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اپنے واردات اور تاثرات کی جھلک دکھاتا ہے جو دیدۂ بینا رکھتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے اور تڑپ اٹھتا ہے محسوس کر لیتا ہے۔ شاعر کس بلندی سے اپنا الہامی کلام سنا رہا ہے!

اور جب اس پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ تنہائی میں ہجوم پیدا کر لیتا ہے اور ہجوم میں تنہائی اختیار کر لیتا ہے، جو کچھ دل پر نازل ہوتا ہے، زبان پر آجاتا ہے، جو پیام وہ اپنی قوم اور ملت کو دینا چاہتا ہے، بے تامل اور بے اندیشہ اسے پابندِ گفتار کر دیتا ہے۔ پھر وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور اپنے ہر مخاطب کو اس دنیا کا آدمی بنا دینا چاہتا ہے، جیسا خود ہے چاہتا ہے، ایسا ہی ہر شخص ہو جائے، اس لئے نئے نئے طرز و اسلوب سے وہ اپنے مخاطب کو متوجہ کرتا ہے، اور اس میں حوصلہ کی بلندی اور ہمت کی رفعت پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے ـــــ کہتا ہے:

اگر در مشتِ خاکِ تو نہادند!
دلِ صد پارۂ خوں نابہ یارے
ز ابرِ نو بہاراں گریہ آموز!
کہ از اشکِ تو روید لالہ زارے

اور پھر یہ پیام دے کر وہ خاموش نہیں بیٹھ جاتا، اس میں اور زیادہ گرمی، اور زیادہ شدت، اور زیادہ جوش و خروش پیدا کرتا ہے۔ اصطلاحیں مختلف ہیں، الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔ انداز جُدا ہے، اسلوب میں فرق ہے بات وہی ہے جو تھی، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اور وہ بات کیا ہے؟ وہ پیام کیا ہے، یہی کہ اس سینۂ خالی میں دل پیدا کرو، دل میں شرارِ آرزو پیدا کرو اور شرارِ آرزو سے اپنے آپ کو بھی پھونک دو۔ اور خاشاکِ غیر اللہ کو بھی خاکستر کر کے رکھ دو۔

تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

اقبال کے ہر پیام کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے، اور کچھ نہیں، زندگی کی حقیقت و ماہیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اور کتنی سچی بات فرماتے ہیں کہ:

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد!
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروز تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

اس طرح سے وہ بار بار مختلف حقائق کی طرف اپنے مخاطب کو متوجہ کرتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ نتیجہ حسب دل خواہ برآمد نہیں ہوا تو پھر اپنی بیزاری اور بے گانگی، اس دنیا کے دوں سے بے پروائی اور بے تعلقی کے اظہار میں بھی تامل نہیں کرتے، اور اس بیزاری کے اعلان میں بھی، گویا جاتے جاتے بھی وہ اہل چمن پر اپنا احسان دہر جاتے ہیں اور بتا جاتے ہیں کہ

نہ پیوستم دریں بستاں سرا، دل
زبند ایں و آں آزادہ رفتم!

چمن دہر سے میں نے اپنا دل نہیں اٹکایا اور یہ جو چنان و چنیں، ایں و آں، اور قیل و قال کا چکر چلتا رہتا ہے اس سے میں الگ ہی رہا۔

چو بادِ صبح گردیدم دمے چند
گلاں را آب و رنگے دادہ رفتم!

جس طرح بادِ صبحگاہی اور نسیم سحر سے پھولوں کی نئی آب و تاب اور رونق اور زندگی مل جاتی ہے۔ وہ اٹھکھیلیاں کرتی آتی ہے اور نعمت بانٹتی ہوئی رخصت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میں بھی اس دنیا میں تھوڑی مدت کے لئے ذرا دیر کے لئے پھولوں کو آب و رنگ کی نعمت عطا کی، اور رخصت ہو گیا۔

انجمِ گردوں فروز

آہ! سیمابِ پریشاں، انجمِ گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں، ممنونِ شب ہے جن کا سوز
عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے
پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثالِ شمعِ روشن محفلِ قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے

(۴۷)

نوائے سادہ

شاعر یہ دنیا دیکھتا ہے، یہاں کے لوگوں کو دیکھتا ہے، اور ان لوگوں کے قائم کئے ہوئے معیارِ سود و زیاں کو دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں آکر پھنس گیا ہوں، میں جو کچھ سوچتا ہوں۔ اس سے یہ دنیا کتنی مختلف ہے۔ ساری دنیا کے لوگ کتنے الگ ہیں؟ شاید یہ لوگ میری بات سمجھ ہی نہیں سکتے؟ یا شاید میں ان کے درمیان بالکل اجنبی ہوں، یہ میرے رازداں نہیں ہو سکتے۔ میں ان کا ہم زبان نہیں بن سکتا۔ یہ کچھ اور ہیں، میں کچھ اور ہوں، ان کے سوچنے کا طرز کچھ اور ہے، میرا اندازِ فکر الگ،

لیکن مجھ میں، ان میں ایک فرق اور بھی ہے، اور وہ بہت بڑا فرق ہے، اسے کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، وہ فرق ہے کہ میں اس وسیع و عریض دنیا میں، بالکل تنہا ہوں، نہ میرا کوئی ہم نفس

ہے نہ ہم زبان، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں دنیا کو، اپنی نگاہ سے نہیں دوسروں کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوں۔

زخوب و زشت تو ناآشنایم
عیارش کردۂ سود و زیاں را
دریں محفل ز من تنہا تر نیست
بہ چشم دیگرے بینم جہاں را

(۴۸)

منزل

منزل، ــــ یہ ایک لفظ ہے، اس کا مفہوم معروف و متعین ہے، کون ہے جسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دھن نہ ہو؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہی تو کہ انسان اپنی منزل تک پہنچ جائے۔ ہر شخص کی منزل جدا ہوتی ہے، کوئی غریب ہے لکھ پتی بننا چاہتا ہے، کوئی لکھ پتی ہے کروڑ پتی بننا چاہتا ہے۔ کوئی جاہل ہے، عالم بننا چاہتا ہے، کوئی عالم ہے، فاضل بننا چاہتا ہے۔ کسی کو بیرسٹری کی دھن ہے، کسی کو جج کی۔ کوئی خطاب حاصل کرنا چاہتا ہے، کوئی صنعت کار بننا چاہتا ہے، کسی کی آرزو ہے کہ محبوب و مطلوب کو حاصل کرے، اور اس کے پہلو میں ساری زندگی گزار دے۔ کسی کو فراق میں لذّت ملتی ہے، لطف آتا ہے۔ وہ وصل سے کتراتا ہے، اور فراق و ہجر کی مدّت کو زیادہ سے زیادہ طول دینا چاہتا ہے، کسی کو قائد اور افسر بننے کی ہوس ہے، کوئی زمامِ اقتدار و اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کا متمنی ہے،

کوئی کسی معمولی عہدے پر فائز ہے، اور بڑے سے بڑے منصب پر فائز ہو جانے کی آرزو میں بے قرار ہے۔

غرض جس طرح انسان، اپنے رنگ کے اعتبار سے نسل کے اعتبار سے، خاندان کے اعتبار سے، ملک، وطن اور قوم کے اعتبار سے، دوسرے انسان سے الگ ہے۔ اسی طرح اپنے مقصد کے اعتبار سے بھی وہ دوسروں سے جُدا ہے۔ ہر شخص اپنا ایک خاص مقصد رکھتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ سراپا جہد وعمل بنا ہوا ہے، جب تک وہ اپنا مقصود نہیں حاصل کر لیتا، یعنی اپنی منزل تک نہیں پہنچ جاتا اسے کسی چیز میں لطف نہیں آتا۔ کسی پہلو قرار نہیں آتا۔

لیکن اس دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو منزل کو کوئی خاص حیثیت اور اہمیت نہیں دیتے، بلکہ کبھی کبھی تو سنگِ راہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنھیں بارگاہِ الٰہی کی طرف سے جنون، یا عشق، یا جستجو کی نعمت عطا فرمائی گئی ہے۔ ان کا خیال ہے اگر ہم منزل تک پہنچ گئے تو فنا ہو گئے، جذبہ ختم، جستجو ناپید، حرارت نابود، عشق قصۂ ماضی، جنون، ایک داستانِ بے معنی! ـــــ یہ لوگ منزل کو اپنی راہ کا روڑا سمجھتے ہیں، اسے حاصل کرنے کی، اس تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے، اس سے گھبراتے ہیں۔ اسے اچھے الفاظ میں یاد تک نہیں کرتے، اقبالؔ کہتے ہیں۔

مگو از مدعائے زندگانی!
ترا بر شیوہ ہائے اونگہ نیست
من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم!
کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست

اے شخص!
تو زندگی کا مقصد اور مدعا کیا جانے؟ زندگی کے شیوہ ہائے گوناگوں پر تیری نظر کب ہے؟
میرا حال تو یہ ہے کہ میں ذوقِ سفر میں مست ہو رہا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ بس چلتا رہوں، چلتا رہوں، قرار نہ ہو۔ قیام نہ ہو، میرے سامنے اگر منزل آجاتی ہے تو میں اسے سنگِ راہ سمجھنے لگتا ہوں، اسے ٹھکراتا ہوں، پامال کرتا ہوں اور آگے بڑھ جاتا ہوں، اپنا سفر جاری رکھتا ہوں، اور یہ سب اس لئے ہے کہ عشق کا تقاضا جستجو ہے، قرار و قیام نہیں۔

مپرس از عشق و از نیرنگیٔ عشق
بہر رنگے کہ خواہی سر برآرد
درونِ سینہ بیش از نقطۂ نیست
جو آید بر زباں، پایاں ندارد

اور جس چیز کا پایاں کار نہ ہو، انتہا نہ ہو، وہ زبان و کلام کی محتاج کب ہو سکتی ہے؟

ہاں تو بات منزل کی ہو رہی تھی، وہی منزل جسے اقبال سنگ رہ سمجھتے ہیں، ایک اور موقع پر منزل کے لئے اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ اقبال نے استعمال کئے ہیں۔

خیالِ او درون دیدہ خوش تر
غمش افسردہ جاں کاہیدہ خوش تر
مرا صاحب دلے ایں نکتہ آموخت
ز منزل جادۂ پیچیدہ خوش تر

عرفی

مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بے تابی
مزاجِ اہلِ عالم میں تغیر آ گیا ایسا!
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنا سے لطفِ بے خوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر؟
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی
صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم کو
نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

(۴۹)

تمیزِ رنگ و بو

اقبالؔ کی ساری زندگی ایک ہی پیام کی تبلیغ و تلقین میں بسر ہوئی ہے۔

اسلام ترا ہے تو مصطفوی ہے

وہ رُوح کی گہرائیوں سے، مسلمانوں کو بار بار بتارہے ہیں،

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ ہر معاملہ میں سمجھوتہ کرسکتے ہیں، لیکن اگر مفاہمت نہیں کرسکتے تو وطنیت کے معاملہ میں اس لئے کہ ان کے نزدیک

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے؛

وہ پرجوش اور پرخروش انداز میں مسلمانوں کو ہوشیار کرتے ہیں، اکساتے ہیں اور کہتے ہیں؛

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

وہ مختلف انداز و اسلوب سے اس زہر کا تریاق مہیا کرتے ہیں۔ اس تحریک کے خلاف لب کشائی کرتے ہیں۔ کبھی نرم و ملائم الفاظ میں، کبھی سنگ و درشت الفاظ میں، لیکن مطلب ایک ہی ہوتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں اور دیکھئے کتنے سرمست انداز میں کہتے ہیں:

چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

موت کا راز

آہ! غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنتِ نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پردا ہوا
فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو!
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو!

•

(۵۰)

دل من اے دل من

جنون کی تمکنت، دیوانگی کا وقار، قلندری کی شان صرف اس ذرا سے نقطۂ موہوم پر قائم ہے جسے دل کہتے ہیں، زندگی کی رونق اسی سے ہے، روح کی تمکنت اسی سے ہے، جسم کا شکوہ اسی سے ہے۔ دنیا کی چہل پہل اسی سے ہے، یہ ہے تو سب کچھ ہے، یہ نہیں تو کچھ نہیں، سب کچھ ہیچ! —— یہی وجہ ہے کہ اقبال اس آفت کے ٹکڑے کو جس کا نام دل ہے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں، اور معترف ہیں۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبادت ہے تیرے جینے سے

اس لئے وہ اپنے دل کو بہت سنبھال کر رکھتے ہیں اسے مرنے نہیں دیتے۔ اس کے جوش اور ولولہ کو قائم رکھتے ہیں، اس کی تازگی اور رعنائی میں فرق نہیں آنے دیتے۔ مولانا روم نے عشق کے

بارے میں فرمایا ہے:

اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما!

اقبالؔ، عشق کے مرکز، اور اس چشمہ کو طبیبِ ہر مرض سمجھتے ہیں۔
اور اسے اپنی ساری کائنات قرار دیتے ہیں!

دلِ من، اے دلِ من، اے دلِ من!
یم من، کشتیٔ من، ساحلِ من!

میرے دل!
اے میرے دل!
تو میرا بحرِ ناپیدا کنار ہے، تو میرا سفینۂ آزاد ہے، تو میرا
ساحلِ مراد ہے!

چو شبنم بر سرِ خاکم چکیدی!
دیا چوں غنچہ رستی از گِلِ من؟

چمنستانِ جہاں

اے تارو! نہ چمنستانِ جہاں کی!
گلشن نہیں، اک بستی ہے وہ آہ و فغاں کی
آتی ہے صبا واں سے پلٹ جانے کی خاطر
بے چاری کلی کھلتی ہے مرجھانے کی خاطر

کیا تم سے کہوں کیا چمن افروز کلی ہے
ننھا سا کوئی شعلۂ بے سوز کلی ہے
گل نالۂ بلبل کی صدا سن نہیں سکتا
دامن سے مرے موتیوں کو چن نہیں سکتا
ہیں مرغ نوا ریز گرفتار، غضب ہے
اگتے ہیں تہِ سایۂ گل خار، غضب ہے

●

(۵۱)

میں کیا ہوں

یہ سوال کہ "میں کیا ہوں؟" بہت پرانا اور بہت اہم ہے، اور اس پر فکر و نظر کی ساری اساس قائم ہے۔ اگر کوئی یہ نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں، تو وہ کچھ نہیں جانتا اور اگر کوئی خود شناسی مرحلہ طے کر لیتا ہے تو پھر خدا شناسی میں دیر نہیں لگتی۔ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" بڑی تابندہ حقیقت ہے۔

عام لوگ جس طرح دوسرے بہت سے مسائل پر غور نہیں کرتے اسی طرح "خود شناسی" اور خود نگری بھی ان کی نظر میں کارِ بیکاراں ہے۔ لیکن جن لوگوں کو فطرت کی طرف سے طبع سلیم عطا ہوئی ہے، جو فکر و نظر کے حامل ہیں۔ وہ اپنی فکر و تامل کا مرکز و محور جس چیز کو بناتے ہیں۔ وہ بھی خود شناسی ہے۔ پھر اس سے وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔

دنیا کے حکیموں اور مفکروں کے حالات و سوانح اپنے سامنے رکھئے، جو شخص جتنا بڑا ہو گا، اتنا ہی زیادہ وہ اس مسئلے پر غور کرے گا، صوفیا کے

ہاں تو خاص طور خود شناسی اور خود نگری پر زور دیا جاتا ہے۔

اقبالؔ بھی بڑے مفکر اور حکیم تھے۔ انہوں نے ہی سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا ہے وہ بھی خود شناسی ہے۔ وہ اپنے مخاطب کو بار بار اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جانتے ہیں یہ مرحلہ سَر کئے بغیر کوئی شخص، نہ علم حاصل کر سکتا ہے نہ معرفت، نہ اپنے کام آسکتا ہے، نہ دوسروں کے، نہ اچھا بندہ بن سکتا ہے، نہ اچھا انسان، وہ انسان کو اس کا مقام بتاتے ہیں، اُسے متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی ہستی اپنے وجود کی غرض و غایت پر غور کرے، اپنے آپ کو پہچانئے، دیکھئے، سمجھئے، وہ بتاتے ہیں:

دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

وہ چاہتے ہیں، یہ شوکتِ طوفان، ابھرے۔ بڑے نمایاں ہو، انسان نے اپنی خودی بیچ رکھی ہے۔ اپنے آپ کو غلام بنا رکھا ہے۔ غیر الٰہی قوتوں نے اس پر غلبہ و تسلّط حاصل کر لیا ہے، اور وہ ایک بے بس معمول کی طرح ان کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ یہ صورت حال صرف اس لئے ہے کہ اس کی خودی کم ہے۔ اس گوہرِ نایاب کو اگر وہ تلاش کرے، تو پھر اسے کوئی غلام نہیں بنا سکتا ہے۔ پھر کوئی اس پر غلبہ و تسلّط نہیں حاصل کر سکتا۔ پھر وہ کائنات پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ پھر وہ مہر و مہ کو اپنا غلام بنا سکتا ہے۔ پھر وہ تحت الثریٰ اور فلک الافلاک پر اپنا پرچم لہرا سکتا ہے۔ لیکن اس طرف سے وہ غافل ہے۔ اس مسئلہ پر وہ غور نہیں کرتا۔ اس میں یہ لگن نہیں پیدا ہوتی کہ اپنے آپ کو پہچانے،

معرفتِ نفس حاصل کرے۔ خودشناسی کی نعمت سے مالا مال ہو، یہ کیفیت دیکھ کر اس کا دل کڑھتا ہے وہ مغموم و ملول ہو جاتے ہیں۔ چاہتے ہیں وہی جذبہ جو ان کے سینہ میں مچل رہا ہے۔ دوسروں تک جس طرح بھی ہو منتقل کر دیں۔ تاکہ انسان، انسان بن جائے، اپنی حقیقت سے غافل نہ رہے ـــــ ملاحظہ کیجیے، انسان کو کس تیور سے کام لے کر ابھارتے ہیں۔

تو می گوئی کہ آدم خاک زاد است

اسیرِ عالمِ کون و فساد است

شاید تیرا یہ خیال ہے کہ انسان صرف خاک زاد ہی ہے۔ اس میں کوئی قوت پنہاں نہیں۔ وہ بس ایک معمول کی طرح۔ اسیرِ عالمِ کون و فساد ہے۔ اس زنجیر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔

ولے فطرت ز اعجازے کہ دارد

بنائے بحر و بر جو تش نہادہ

لیکن نہیں

امر واقعہ یہ نہیں ہے!

انسان بہت کچھ ہے۔ وہ حقیقتِ اعلیٰ کا مظہر ہے۔ وہ اس کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔ یہ ساری کائنات، یہ سارا کارخانہ ہست و بود اسی کے دم سے قائم ہے اسی کے لئے ہے۔ اسی کے تصرّف میں ہے۔ وہ ایسی ہستی، ایسا وجود ہے کہ یہ بحرِ بیکراں اس کی آب و جود سے قائم ہے۔

وہ طرح طرح سے، نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لے کر،

نئے نئے نکتوں کے پیشِ نظر، انسان میں معرفتِ نفس کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، کبھی یوں کہتے ہیں۔

عشوۂ غنچۂ نورستہ دل گیر
ازیں بستاں سرا دیگر چہ خواہی

اے غنچۂ نورستہ، تو ملول و غمگین کیوں ہوتا ہے؟ اس بستان سرائے عالم میں سب کچھ تو تجھے حاصل ہے، پھر اور کیا چاہتا ہے؟ اور کس چیز کی جستجو ہے تجھے؟

لبِ جو، بزمِ گل، مرغ، چمن سیر
صبا، شبنم، نوائے صبح گاہی!

کیا ان نعمتوں کے علاوہ بھی تجھے کچھ درکار ہے؟

کبھی اندازِ بیان فلسفیانہ ہو جاتا ہے اور وہ وجودِ ہستی کو ایک نقطۂ موہوم سمجھنے لگتے ہیں کہ معرفتِ نفس کی ایک منزل یہ بھی ہے۔

چہ پرسی از کجایم چیستم من؟
بخود پیچیدہ ام تارِ سیہ من!

اے دوست! — مجھ سے یہ کیا سوال کرتا ہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ کیا ہوں؟ میری حقیقت تو بس صرف اتنی ہی ہے کہ اپنے آپ سے الجھا ہوا ہوں اور جب تک زندہ رہوں گا، یہ خود پیچیدگی قائم رہے گی۔

دریں دریا چو موجِ بے قرارم
اگر بر خود نہ پیچم، نیستم من!

دریائے ہستی میں، میری حیثیت صرف وہ ہے، جو ایک موج بے قرار کی ہوتی ہے۔ اگر اپنے آپ میں نہ ابھار رہوں اور اگر خود پیچیدگی کا شغل نہ اختیار کروں، تو یہ زندگی ہی اس لمحہ ختم ہو جائے۔

اور یہ کہہ کر پھر وجود و ہستی پر غور کرتے ہیں تو فرماتے ہیں:

ندانم بادہ ام یا ساغرم من!
گہر در دامنم، یا گوہرم من!

کچھ پتہ نہیں چلتا میں کیا ہوں؟ بادہ ہوں؟ یا ساغر، ظرف ہوں، یا مظروف؟

چناں بینم چو بر دل دیدہ بندم!
کہ جانم دیگرست و دیگرم من!

اور جب زیادہ غور کرتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کچھ اور ہوں، اور یہ حیات کوئی الگ چیز،

(۵۲)

تراشیدم پرستیدم شکستم

اقبال ایک فلسفی تھے، ایک دیدہ وَر فلسفی، ایک نکتہ بیں حکیم۔ ایک دقیقہ سنج مفکّر! ـــــ ساتھ ہی ساتھ، سقراط سے لے کر برگساں تک، ہر دَور کی تاریخ فلسفہ و حکمت بھی ان کے پیشِ نظر تھی، ان تمام اَدوار کے حکیموں، فلسفیوں اور مفکّروں کے احوال و مقامات، خیالات و نظریات، اور اسلوبِ فکر و نظر سے بھی وہ واقف تھے۔ اقبال کو معلوم تھا، حقیقت کی تلاش میں دنیا کے بڑے انسانوں نے کتنی تگ و دو کی کس کس طرح، انھوں نے فطرت کے رازِ سربستہ پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کیسے کیسے نئے نظریے اور خیالات دُنیا کے سامنے پیش کئے، لیکن اس ساری تگ و دو کا حاصل کیا نکلا؟

کیا حقیقت مل گئی؟ ـــــ کیا تلاشِ حقیقت کا مقصد پورا ہوگیا؟ واقعات کا جواب بہرحال نفی میں ہے، واقعہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے سوچا، نظریات قائم کئے اور ان سے دست بردار ہو گئے، پھر کسی فیصلہ

تک پہنچے مگر اس پر قائم نہ رہ سکے، جس بات کو جس شدت کے ساتھ پیش کیا دلائل و براہین کی جس قوت کے ساتھ ثابت کیا۔ عقل و منطق کے جس زور سے منوایا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد، غلطی واضح ہو گئی، نظریات کمزور اور بے بنیاد ثابت ہوئے۔ دلائل و براہین کا تار و پود بکھر گیا۔ عقل و منطق کی نارسائی کا اعتراف کر لینا پڑا۔

جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے، یہی ہوتا چلا آرہا ہے، اب تک حقائقِ عالم اور معارفِ فطرت سے متعلق، ہزاروں نظریئے، فیصلہ کن صورت میں دنیا کے سامنے پیش کئے جا چکے ہیں۔ لیکن عقل و فکر کے ان مستحکم اور سربفلک قلعوں کو، کسی دشمن نے نہیں، خود اس برادری کے لوگوں نے توڑا اور پاش پاش کر دیا۔ جب یہ قطعیت کے ساتھ آگے بڑھے، جب جزم و یقین کے جلو میں یہ گام فرسا ہوا، ابھی چند قدم بھی چلنے نہ پائے تھے کہ معلوم ہوا جس راستہ پر چل رہے تھے وہ غلط تھا۔

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی!
ایں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

جس مقصد کو اپنا منتہائے نظر بنایا تھا وہ ہیچ اور ناکارہ ثابت ہوا، جن لوگوں نے اس پر ایمان و یقین کا اعلان کیا تھا، وہی اس کے بارے میں شک اور تذبذب، بلکہ انکار کا اظہار کرنے لگے، گویا یہ عقل جس پر اتنا غرہ کیا جاتا ہے نہ موصل الی المطلوب ہے، نہ بجائے خود جادہ و منزل، یہ خود ہی تاریکی میں بھٹکتی پھرتی ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتی رہتی ہے۔ اس

کے ہاتھ میں اگر زمامِ کار دے دی جائے تو یہ کبھی بھی فلاح و نجاح سے بہرہ ور نہ ہو سکیں، جو لوگ صرف اس پر تکیہ کرتے ہیں۔ انہیں بہر حال بعد میں پچھتانا اور پشیمان ہونا پڑتا ہے اور وہ پھر ایک نئے مقصد کی تلاش میں، ایک نئی منزل کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر اسی طرح رہبری کرتے ہوئے ایک مدّت گزر جاتی ہے۔ ایک دَور ختم ہو جاتا ہے۔ ایک جُگ بیت جاتا ہے اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ منزل قریب آگئی۔ مقصد حاصل ہو گیا، تو پھر، وہی ناکامی کا اعتراف، وہی داغِ حسرت! ـــــ یہ ایک سلسلہ ہے، جو رائج ہے۔ اس کے تواتر اور تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اقبال چونکہ خود بھی بہت بڑے حکیم اور مفکر ہیں۔ فلسفہ کے سمجھنے اور سمجھانے میں ان کی عمر گذری ہے اس لئے ایسے واردات کو وہ بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں اور بڑے دل آویز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اور ماضی کے اکابر کے ساتھ اتنی رعایت کرتے ہیں کہ سب کچھ اپنے اوپر اوڑھ کر بیان کرتے ہیں! ـــــ چنانچہ فرماتے ہیں:

ہزاروں سال با فطرت نشستم!
بہ او پیوستم و از خود گسستم!

ہزاروں سال بیت گئے، میں رازِ فطرت کو معلوم کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہوں، اور اس طرح سرگرداں ہوں کہ جو کچھ سمجھا اسے مان لیا۔ اس پر یقین کر لیا۔ اپنے آپ کو، اپنی حقیقت کو بھول بیٹھا اور اصنامِ خیالی کو پوجتا رہا۔

ولیکن سرگذشتم ایں دو حرف است
تراشیدم، پرستیدم، شکستم

لیکن ان ہزارہا سال کی میری تلاش و جستجو کا کیا نتیجہ ہے؟ یہ طویل تاریخ اگر مختصر کر کے بیان کرنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں۔

- میں نے بت تراشے
- میں نے ان کی پرستش کی،
- اور میں نے انہیں توڑ دیا۔

یہ ہے میری سرگذشت ــــ میری ہی نہیں ہر فلسفی کی۔ ہر حکیم کی۔

---

(۵۳)

گدائے بے نیاز

شاعر ــــ اقبالؔ ــــ جب اپنے وجود پر، اپنی شخصیت پر، اپنے کارناموں پر، اپنی خدمات پر، اور اپنی خدمات کے نتائج پر غور کرتا ہے تو اس کا دل فخر و نازش کے جذبات سے مملو ہو جاتا ہے اور وہ نعرہ لگاتا ہے:

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

وہ اس بات پر فخر محسوس کرتا ہے کہ خدا نے اسے عشق کا جذبہ دیا، اور اس جذبہ کو اس نے صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا۔ اپنی قوم میں بھی تقسیم کر دیا۔ وہ اس لذتِ جنون سے نا آشنا تھی، وہ حقیقتِ عشق سے بہرہ وَر نہ تھی۔ وہ خوابِ خرگوش میں مست تھی۔ اسے نہ اپنا ماضی یاد تھا، نہ اپنے حال کی فکر تھی نہ اپنے مستقبل کا خیال تھا۔ وہ زندہ تھی لیکن اس پر موت طاری ہو چکی تھی، نہ اس میں اُمنگ باقی رہ گئی تھی، نہ حوصلہ، اس لئے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

حالانکہ اسے خیر لکھ رہا کہ اس دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ اس میں یہ طاقت تھی کہ وہ خود اپنی تقدیر کی خالق بن سکتی تھی اس لئے تو انھوں نے کہا تھا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن وہی قوم اب راضی بہ رضا ہو کر بیٹھ گئی تھی ــــ زندگی کی لذت سے ناآشنا، زندگی کے ذوق سے بے خبر!

یہ حالات تھے جب میں نے نغمہ سرائی شروع کی:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

میرے نغمہ نے سوتے ہوؤں کو جگا دیا۔ ان میں عشق کی آگ جو بجھ چکی تھی، پھر بھڑک اٹھی، وہ ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہو گئے۔ میں نے اپنے آپ کو فنا کر دیا، پروانے کی طرح جلتا رہا لیکن اپنی قوم کو موت کے پنجہ سے بچا لیا۔ کیا میرا یہ کارنامہ ایسا نہیں ہے جس پر میں فخر کر سکوں؟ جس پر مجھے ناز ہو؟

شاعر کچھ نہیں کرتے، مگر فخر کرتے ہیں، تعلّی کا اظہار کرتے ہیں ــــ شاندار قصیدے وہ امیروں، بادشاہوں اور شہریاروں کی توصیف میں زیبِ قرطاس و قلم کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ زوردار اور پراثر اشعار اپنے

بارے میں کہتے ہیں۔ اپنے مفاخرے کے اظہار میں زمین آسمان کے قلا بے ملا دیتے ہیں۔ پھر اگر اقبال کسی موقعہ پر اپنے تفاخر کا اظہار کرتا ہے تو کیا غلط کرتا ہے؟ کیا غلط کہتا ہے؟ سچ پوچھئے اور نگاہِ حقیقت بیں سے دیکھئے، تو وہ اپنے بارے میں، جو کچھ کہتا ہے وہ حقیقت سے بہت کم ہے۔ صرف اظہارِ انکسار ہے، اظہارِ واقعہ نہیں، اظہارِ واقعہ ہوتا تو اس سے کہیں زیادہ پُر زور اور پُر شور طور پر وہ اپنی مدحت سرائی کر سکتا تھا۔ بہرحال کہتا ہے:

بہ خود نازم، گدائے بے نیازم
تہیم، سوزم، گدازم، بے نوازم

میں ایک گدائے بے نیاز ہوں، لیکن اپنے وجود پر نازاں بھی ہوں۔ میں دنیا کو، دنیا کی حقیقت کو جانتا ہوں، اسے منہ نہیں لگاتا۔ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسے کام میں نہیں لاتا، اس لئے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ دنیا کے پاس نہیں ہے۔ دنیا کے پاس مال و دولت ہے۔ جاہ و منزلت ہے، اقتدار و اختیار ہے، حشمت و سطوت ہے، لیکن یہ سب چیزیں آنی اور فانی ہیں۔ یہ دولت رہنے والی نہیں۔ یہ جاہ و منصب کی نمائش بھی چند روزہ ہے۔ یہ اقتدار و اختیار کہ جس کی مسند پر بیٹھ کر انسان خدائی کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ عارضی اور وقتی چیز ہے۔ آج ہی بازار میں جا کر دیکھ لو، بہت سے بادشاہ، جو تخت و تاج سے محروم ہو چکے ہیں، ٹھوکریں کھاتے اور دَر دَر مارے مارے پھرتے نظر آئیں گے۔ یہ حشمت و سطوت بھی زمانے کی طرح بدلتی رہتی ہے۔ آج کچھ ہے کل کچھ، آج کسی کے پاس ہے، کل کسی کے پاس،

یہی وجہ ہے کہ میں ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتا، انہیں حقیر سمجھتا ہوں۔ لائق ترین نہیں سمجھتا، اس کے برعکس میرے پاس جو کچھ ہے وہ غیر فانی ہے۔ میری متاع عشق ہے، اور عشق کو زوال نہیں، یہ وہ چیز ہے، جو قدرت نے ازراو عنایت مجھے عطا فرمائی ہے اور مجھے اس پر ناز ہے، فخر ہے، آتش عشق نے مجھے تڑپ دی ہے، سوز دیا ہے، گداز عطا کیا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نغمہ سرائی کی دولت عطا کی ہے۔ وہ نغمہ جو دل سے نکلتا ہے۔ اور دل کے گوشہ میں جا کر اپنا نشیمن بنا لیتا ہے۔

ترا از نغمہ در آتش نشاندم
سکندر فطرتم، آئینہ سازم

اور اے میری قوم!

اے میری قوم کے نوجوانو!

یہ میری نغمہ سرائی اس لئے نہیں کہ تم اسے مایۂ تفریح سمجھو، ایک دل بہلاوا — نہیں، یہ وہ نغمہ سرائی ہے، جو میری آتشِ عشق کی ترجمان ہے اس نغمہ سرائی کے ذریعہ میں تیری ہی اس منزلِ عشق کی طرف رہنمائی کر رہا ہوں، جو اصل حیات ہے اصل مقصود ہے۔ حاصلِ کائنات ہے۔

میں وہ سکندر فطرت ہوں کہ میں نے تیرے لئے ایک ایسا آئینہ بنا دیا ہے جس میں تو سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ اقوام عالم کی کیفیت بھی، اپنا ماضی بھی، حال بھی اور مستقبل بھی! — کیا میرا یہ کارنامہ ایسا نہیں ہے، جس پر میں ناز کر سکوں؟ فخر کر سکوں؟

---

(۵۴)

جہاں دیباچہ افسانہ ما

اقبالؔ کے کلام اور پیام میں، جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ تعمیرِ خودی ہے، انھوں نے اپنی قوم کو صرف ایک ہی درس دیا ہے۔ یہ کہ، وہ خودی کی لذت آشنا بن جائے۔ اپنی حقیقت کو پہچانے، اپنے مقصدِ وجود سے آشنا ہو اور جو ذمہ داریاں اُسے سونپی گئی ہیں، انہیں خوبی اور شائستگی کے ساتھ انجام دے، خوش قسمتی سے، مسلمان قوم کو ایک سعادت ایسی حاصل ہے، جس میں کوئی دوسری قوم اس میں شریک و سہیم نہیں۔ وہ سعادت یہ ہے کہ اسلام جو کچھ کہتا ہے وہ جیسی قوم تیار کرنا چاہتا ہے، اقبالؔ بار بار، جس رستے کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ کوئی لامعلوم، اور غیر معروف چیز نہیں ہے۔ دنیا اس سے واقف ہے، اسے جانتی ہے، مانتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ گرامی میں، اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین کے عہدِ حکومت میں دنیا ایسے لوگوں کو دیکھ چکی ہے جو خودی کی نعمت سے بہرہ ور تھے اور اس قوت سے مستحکم ہو کر انھوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی تھی، گویا جو نظریہ اقبالؔ

ملّت کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ نیا نہیں ہے۔ برتا جا چکا ہے۔ پرکھا جا چکا ہے، آزمایا جا چکا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ عمل میں لایا جا چکا ہے۔ دوستوں کو چھوڑیئے، دشمنوں نے اعتراف کیا ہے کہ اس سے اچھا زمانہ انسانیت کے لئے کوئی نہیں گزرا، یہی وہ زمانہ تھا، جب انسان کو اس کے چھینے ہوئے حقوق ملے۔ پست و بلند کا امتیاز مٹا۔ غلامی کا استیصال کیا گیا، عورت کو وہ مرتبہ دیا گیا جس سے اس کے پہلے، اور اس کے بعد وہ کبھی آشنا نہیں ہوئی، رواداری کا ایسا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا گیا جو آج بھی سرمۂ چشم صاحب نظراں ہے، غرض جس نہج، جس اسلوب اور جس انداز سے بھی اس نظام کو اپنایا گیا، اسے برتر اور بہتر پایا گیا۔ اقبالؔ پوچھتے ہیں، جب ایک مرتبہ اتنا کامیاب اور شاندار تجربہ کیا جا چکا ہے تو اب پھر اس کا اعادہ کیوں نہیں کیا جاتا، وہ قوم جس کے اجداد نے، دنیا پر اتنا بڑا احسان کیا تھا، آج دُنیا پر ایک بوجھ بنی ہوئی ہے۔ وہ اپنی رفعتیں کھو چکی ہے اور ادبار و انحطاط کے غار میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے دنیا کی قومیں اعزاز و احترام کے ساتھ اس کا نام لیتی تھیں اب اس کا مذاق اڑاتی ہیں، تمسخر کرتی ہیں۔ اس سے اسے حقیر اور ہیچ اور ناکارہ خیال کرتی ہیں۔

اقبالؔ، اپنی قوم کو یہی بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں۔ اور بار بار یاد دلاتے ہیں۔ وہ عرفی کے اس شعر پر عامل ہیں۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

ان کی نوا میں تلخی بھی ہے اور ان کی حدی خوانی میں تیزی تھی۔

اقبال اپنی قوم کو بتاتے ہیں:

سکندر رفت شمشیرِ علم رفت
خراجِ شہر و گنج کان و یم رفت

سکندر بڑی آب و تاب کے ساتھ دنیا کے پردہ پر نمودار ہوا، اس نے فتوحات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کیا، وہ دور دراز مقامات پر پہنچا، اور اس نے اپنی فتح کا جھنڈا لہرایا، لیکن آج سکندر کہاں ہے؟ جو خراج، اونٹوں اور خچروں سے لد کر اس کے حضور میں پہنچا کرتا تھا، وہ کیا ہوا؟ بحر و بر جو دولت سمٹ سمٹ کر اس کے دامن تک پہنچی تھی اور جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا، اور دونوں ہاتھوں سے لٹایا تھا، کس خزانے میں ہے؟

امم را از شہاں پائندہ مرداں!
نمی بینی کہ ایراں ماند جم رفت!

قومیں، بادشاہوں سے زیادہ پائندہ ہوتی ہیں، کیا تو نہیں دیکھتا، جم رخصت ہو گیا لیکن ایرانی قوم اب تک باقی ہے؟

یہ کہہ کر انہوں نے ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔ اب وہ اپنے خاص موضوع پر آتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد
ز سودایم متاعِ او گراں شد

میں نے اپنی نغمہ سرائی سے عجم کی پیری کو شباب سے، موت کو زندگی

سے بدل دیا ہے، وہ کچھ نہ تھا لیکن میں نے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

ہجوے بود، رہ گم کردہ در دشتا
زآواز درایم کارواں شد!

اس کی حالت اس ہجوم کی سی تھی، جس نے صحرا میں اپنا راستہ گم کر دیا ہو۔ لیکن وہی گم کردہ راہ ہجوم، میری بانگِ درا سے ایک کارواں کی صورت میں تبدیل ہو گیا، اور یہ کارواں، منزلِ مقصود کی طرف اب بڑھ رہا ہے، جس کی نظر سے منزل اوجھل ہو چکی تھی، اب وہ منزل کا شناسا بن چکا ہے۔

پھر اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں،

عجم از نغمہ ام آتش بجاں است!
صدائے من درائے کارواں است

میری نغمہ سرائی نے عجم کو آتش بجاں کر دیا ہے، اب وہ ایک پیکرِ خاکی نہیں ہے، اس میں سوز و ساز ہے، شرارِ آرزو ہے، جوشِ تمنا ہے، میری آواز اس کے لئے درائے کارواں ثابت ہوئی اور کارواں رواں دواں منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

حدی را تیز تر خوانم چو عرفی!
کہ راہ خوابیدہ محمل گراں است

میں بھی عرفی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں، یعنی حدی خوانی میں، میں نے شدت، اور جوش کے عناصر بڑھا دیئے ہیں اس لئے کہ محمل گراں ہے۔

راستہ دشوار ہے، جب تک جذبہ و جوش کارفرما نہ ہو، یہ راستہ طے نہیں کیا جا سکتا۔

پھر اور زیادہ جوش اور ولولہ کے ساتھ یہی بات کہتے ہیں،

زجانِ بے قرار آتش کشادم
دلے در سینۂ مشرق نہادم

میں، جوشِ عشق سے ایک پیکرِ آتش بنا ہوا ہوں۔ یہ آگ میں نے سینۂ مشرق میں بھی سلگادی ہے، وہ بھی اب گل کدہ نہیں، گلخزاں بن گیا ہے

گلِ او شعلہ زار از نالۂ من!!
چو برق اندر نہادِ او فتادم!

میرے نالۂ جاں گاہ کا اثر یہ ہے کہ اب مشرق کا گلستان بھی، گلستان نہیں رہا، شعلہ زار بن گیا ہے، اس کے بدن میں میں نے وہ بجلی دوڑادی ہے جس نے اس کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کردی ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے،

مرا مثلِ نسیم آوارہ کردند!
دلم مانندِ گل صد پارہ کردند!

عشق میں میری مثال، نسیم آوارہ کی سی ہے، اور میرا دل صدمۂ فراق سے صد پارہ ہو رہا ہے۔

نگاہم را کہ پیدا ہم بیند

شہیدِ لذّتِ نظّارہ کردند

مجھے جو نگاہ دی گئی ہے وہ ایسی ہے کہ اس دنیائے آب دخاک کو نہیں دیکھ سکتی، اس کی حقیقت بھی نہیں سمجھ سکتی نہ اس کی تہہ معلوم کر سکتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ شوقِ نظّارہ بھی ودیعت کر دیا گیا ہے، وہ بھی ایسا کہ میں شہیدِ نظّارہ ہو کر رہ گیا ہوں۔

یہ باتیں کرنے کے بعد وہ پھر دوسری چیزوں کو فراموش کر کے، اور ان سے قطع نظر کر کے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالتے ہیں اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ، تو سب کچھ ہے، لیکن اپنے آپ سے غافل ہے۔ خودنگر اور خودشناس بن جا، یہ دنیا تیرے طابع اور مطیع ہو جائے گی، تجھے اس پر حکومت کرنے کا حق پھر مل جائے گا، جیسا اس سے پہلے مل چکا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

زمینِ خاک در میخانۂ ما!
فلک یک گردشِ پیمانۂ ما!

یہ زمین کیا ہے؟ — میرے میخانہ کی خاک۔
یہ آسمان کیا ہے؟ — میرے پیمانہ کی ایک گردش!

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است
جہاں دیباچۂ افسانۂ ما!

میرے سوز و ساز کا افسانہ بہت طویل ہے۔
یہ جہانِ رنگ و بو، یہ عالم ہست و بود، یہ دنیائے حسرت و

آرزو میرے افسانہ کا دیباچہ ہے! اصل افسانہ تو اس سے گزرنے
کے بعد شروع ہوتا ہے۔

خودی کا اتنا دل آویز نقش اقبال نے قائم کیا ہے جیسے جب،
اور جس طرح بھی وہ بیان کرتے ہیں۔ اس کی دل کشی اور جاذبیت میں
فرق نہیں آتا۔ یہی ان کا حاصلِ کلام ہے اور اس رباعی میں، تو انھوں
نے اپنے اعجازِ کلام سے جان ڈال دی ہے۔

---

(۵۵)

دستِ دُعا

حدیثِ جنوں میں، مسلمان کی توصیف یہ آتی ہے کہ جو کچھ اپنے لئے پسند کرے، وہی اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے بھی پسند کرے، اقبالؔ اس معیار پر ایک مردِ مسلمان کی طرح بالکل پورے اترتے ہیں۔ خدا نے انھیں عشقِ جنوں کی نعمت بخشی ہے، وہ اس نعمت کو عام کر دینا چاہتے ہیں، ان کی تمنا ہے کہ یہ نعمت ہر شخص کو مل جائے۔ عشق کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے مقصدِ وجود سے واقف ہو جائے۔ اس لئے کہ جب تک مقصدِ وجود سے واقف نہ ہو۔ وہ عشق ہی نہیں کر سکتا۔ عشق دعوت ہے، مقصد و یکتائی کی طرف، اقبالؔ چاہتے ہیں، ملّت کا ہر فرد، عاشقِ صادق بن جائے۔ اپنے مقصد سے، اپنے وجود سے، اپنے مقصدِ وجود سے، عشق کرے، تب ہی وہ ارتقاء و عروج کے مراحل طے کر سکتا ہے، تب ہی وہ کائنات کو مسخر کر سکتا ہے، تب ہی بحر و بر، شجر و حجر پر، عالم کون و مکان کی ہر چیز پر اس کی سلطانی قائم ہو سکتی ہے۔

اپنی سی کوشش تو زندگی بھر اقبالؔ کرتے رہے، اس میں کامیاب بھی ہوئے، اور ناکام بھی، لیکن کبھی کبھی ان کے دستِ دعا بھی بلند ہو جاتے ہیں اور وہ بارگاہِ رب العزت میں التجا کرتے ہیں کہ یہ عشق کی چنگاری' یہ میرا سوزِ جگر، مجھ ہی تک محدود نہ رکھ اسے عام کر دے وہ اگر چاہتے تو قدرے اس آرزو کے علاوہ ہر بات کہہ سکتے ہیں۔ وہ دعائے درازیٔ عمر و ترقیٔ "اقبال" کر سکتے تھے۔ وہ مناصبِ بلند کے لئے خدا کے حضور میں عرض و التماس کر سکتے تھے، وہ دولت و ثروت کی تمنا کا اظہار کر سکتے تھے۔ وہ ہمیشہ بیمار رہتے تھے، صحت مانگ سکتے تھے اور انسان خدا سے عام طور پر جب کچھ مانگتا ہے تو اپنے یا اپنے بیوی بچوں' اور اہل و عیال ہی کے لئے مانگتا ہے۔ ملک کے لئے، ملت کے لئے، قوم کے لئے، کچھ نہیں طلب کرتا لیکن اقبالؔ کی قلندرانہ ادا دیکھیے، وہ بارگاہِ رب العزت میں دستِ دعا بلند کئے ہوئے پہنچتے ہیں لیکن اپنے، اپنے اہل و عیال کے لئے، اپنے متعلقین کے لئے کچھ نہیں مانگتے ہیں، طلب کرتے ہیں، تو اپنی قوم کے لئے، اپنی ملت کے لئے، ان کی زندگی اگر فقر و فاقہ کی نہیں تھی، تو امیرانہ بھی نہیں تھی، ایک اوسط درجہ کے انسان کی حیثیت سے وہ اپنی زندگی کے شب و روز بسر کر رہے تھے۔ یقیناً ان کے دل میں یہ خیال آتا ہوگا کہ اپنے قلم سے اپنی صلاحیت اور استعداد سے فائدہ اٹھائیں اور روپیہ پیدا کریں۔ وہ تنہا نہیں تھے۔ صاحبِ اہل و عیال تھے، لڑکی تھی، لڑکا تھا، ان دونوں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی، لیکن مال و دولت کا نام بھی وہ اپنی زبان پر نہیں لاتے، صرف قوم کے لئے،

ملّت کے لئے بارگاہِ رب العزت میں وہ دریوزہ گری کرتے ہیں ــــــــــ
ذرا اندازِ تکلم دیکھئے:

اے کہ از خمِ خانۂ فطرت بہ جامم ریختی
زآتشِ صہبائے من بگداز مینائے مرا

اے پروردگارِ بے نیاز، تو نے میری مینائے ہستی کو شرابِ عشق و محبت سے لبریز کر دیا ہے، بس میں یہ چاہتا ہوں کہ اس آگ میں میری ہستی کو پگھلا دے۔

عشق را سرمایہ سازِ گرمیٔ فریادِ من!
شعلۂ بے باک گرداں خاکِ سینائے مرا!

میری گرمیٔ نوا کو عشق کی پونجی بنادے، میری خاک کو ایسا شعلہ بنادے کہ وہ خاشاکِ غیر اللہ کو خاکستر کر کے رکھ دے۔

---

(۵۶)

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

انسان کیا چاہتا ہے؟ ـــــ سکون دائمی، یہ نیک کام کیوں کرتا ہے۔
عبادت و ریاضت میں کیوں اپنا وقت صرف کرتا ہے؟ غریبوں اور
محتاجوں کے کام کیوں آتا ہے؟ مظلوموں کی مدد کیوں کرتا ہے؟ ان تمام حسنات
کا مقصد کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے، نیکی خود ایک مقصد ہے، نیک کام آدمی
اس لئے کرتا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیئے۔ لیکن سوچنے کا یہ انداز ہر شخص کا
نہیں ہے۔ آپ جس سے بھی پوچھیں وہی کہے گا کہ ان اچھائیوں، اور نیکیوں
سے میرا مقصد یہ ہے کہ یہ عارضی زندگی جب ختم ہو اور دائمی زندگی شروع ہو،
تو میں خسارہ میں نہ رہوں، ان نیکیوں اور اچھائیوں کا صلہ جنت کی صورت
میں مجھے مل جائے، گویا مقصد یہ قرار پایا کہ انسان نیکی اس لئے کرتا ہے،
اچھائیوں کا صدور اس لئے ہوتا ہے کہ وہ جنت حاصل کرے، ـــــ اور
جنت میں کیا ہوگا؟ حور، غلمان، فرشتے ـــــ یہ وہ مقام ہے جہاں زندگی
کو زوال آوال نہیں، جہاں کوئی تمنا ناکام نہیں رہ سکتی، جہاں ہر آرزو ہر وقت

پوری ہوسکتی ہے۔ جہاں دودھ کی نہریں ہوں گی۔ شہد کے حوض ہوں گے، حوریں ہوں گی، غلمان ہوں گے اور حیاتِ دائمی ہوگی۔

ہر مذہب نے ـــــ خواہ یہ مذاہب، اپنے تعلیمات کے لحاظ سے، ایک دوسرے سے کتنے ہی متضاد اور متخالف کیوں نہ ہوں، ـــــ اپنے پیروؤں کو حسنِ عمل کی بشارت، جنّت کی صورت میں دی ہے۔ یعنی اس دُنیا میں تکلیفیں جھیل لو، دکھ سہہ لو، آفتیں برداشت کرلو، ناکامی کا داغ سینہ پر لے لو، فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرلو، مایوسی اور حرماں نصیبی کا گلہ نہ کرو، کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب تم جنّت میں پہنچ جاؤ گے۔ ساری تکلیفیں ختم ہوجائیں گی اور تم ایک شاندار، حسبِ مدعا، اور نہ ختم ہونے والی زندگی کے مالک بن جاؤ گے۔

گویا، انسان کی معراج یہ ٹھہری کہ مرنے کے بعد وہ جنّت میں پہنچ جائے۔

لیکن ہمارا شاعر ـــــ اقبالؔ ـــــ جنّت پر راضی نہیں ہے۔ وہ جنّت کو موت سمجھتا ہے۔ قید خانہ خیال کرتا ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا، مرنے کو تیار ہے، اس کا استقبال، جوشِ مسرّت کے ساتھ کرتا ہے لیکن مرنے کے بعد، پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کا، تلاش و جستجو سے دستبردار ہوجانے کا، سکون و سکوت کی زندگی بسر کرنے کا قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک، یہ زندگی تو موت سے بھی کہیں زیادہ بدتر ہے۔

چنانچہ، یہ عاشقِ جنوں پرور، یعنی شاعرِ سخن پرور اتفاق سے کسی طرح جنّت میں پہنچ جاتا ہے، اور وہاں ایک حور سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ محبوب

کے حسن وجمال کی آخری تعریف یہ ہے کہ وہ حور پیکر ہو اور یہاں مجسم حور سامنے کھڑی ہے، لیکن شاعر اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ نہ اس کی جنت کو خیال میں لاتا ہے، حور کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ میرے تصور میں زاہدوں اور عابدوں کی راتیں بسر ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ساری زندگی عبادت وریاضت اور مجاہدہ میں اس لئے صرف کر دیتے ہیں کہ میں انہیں مل جاؤں، لیکن اس شخص کے سامنے، میں بالکل بے سپردگی کھڑی ہوں مگر یہ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، یہ کس قسم کا انسان ہے؟ کیا اس کے جسم میں دل نہیں؟ کیا یہ رہ رسم و آشنائی سے ناواقف ہے؟ کیا محبت کی لذت، عشق کے خمار، دیوانگی کے جوش اور جنون کی ہنگامہ آرائیوں میں سے اسے کچھ حصہ نہیں ملا؟ اس کی جیب بھی سلامت ہے۔ دامن بھی اور گریبان بھی، اس کا گریبان تار تار کیوں نہیں ہوتا؟ اس کی جیب پارہ پارہ کیوں نہیں ہوتی؟ آخر، میرے سوا، اسے اور چاہیے کیا؟ کیا مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہے، جس کی یہ جستجو کر سکتا ہے؟ جس کی یہ آرزو کر سکتا ہے؟

شاعر کی بے نیازی اور بے التفاتی دیکھ کر آخر حور ضبط نہیں کر سکتی، کہتی ہے،

نہ بہ بادہ میل داری، نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو نہ دانی رہ و رسم آشنائی

نہ شراب سے تجھے رغبت ہے۔ نہ میری طرف تو نظر بھر کر دیکھتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ انسان ہو کر دل بے قرار پہلو میں رکھتے ہوئے بھی

تو وہ رسمِ آشنائی سے ناواقف ہے!

شاعر، بھلا یہ طعن سُن کر، کیوں خاموش رہتا۔ اس نے جواب تو کچھ نہیں دیا۔ نغمہ سرائی شروع کر دی۔ وہی دل کی باتیں، عشق کی گھاتیں، سازِ محبت، سوزِ فراق۔ دردِ دل اور دلِ ناصبور کی حکایت، یہ نغمہ سرائی بیچاری حور کے لئے اور زیادہ تعجب انگیز ثابت ہوئی کہ یہ حضرت، ایسے تو سب کچھ جانتے ہیں۔ کھیلے کھائے معلوم ہوتے ہیں۔ تان سُنو، تو دل میں اتری جاتی ہے، نغمہ سنو، تو رُوح تڑپ جاتی ہے۔ شعر سُنو تو عالم ہی دوسرا طاری ہو جاتا ہے۔ پھر بھی انجان بنے ہوئے ہیں، گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔ معصومیت ہے کہ ٹپکی پڑتی ہے۔ اب وہ اور زیادہ سراپا حیرت بن کر کہتی ہے:

ہمہ سازِ جستجوئے، ہمہ سوزِ آرزوئے

نفسے کہ می گدازی، غزلے کہ می سرائی

اب تو تیرے حال پر مجھے اور زیادہ حیرت ہے، تو گونگا نہیں، نغمہ طرازی بھی کرتا ہے۔ تیرا سینہ دل سے خالی نہیں۔ دل کی دھڑکن میں سُن رہی ہوں، یہ جو کچھ تو نے گایا سایا معلوم ہوتا ہے کہ تو ہمہ تن سازِ جستجو اور سوزِ آرزو بنا ہوا ہے۔ کسی کی محبت میں بے تاب ہے۔ تیری غزل سرائی سے ایسا اندازہ ہوتا ہے جیسے تیری ہر سانس شعلہ دشرر ہے جو تیرے دل کو پھونکے دیتی ہے۔ اور پھر بھی یہ بے التفاتی۔ یہ کج ادائی! یہ سرد مہری؟ آخر یہ راز کیا ہے؟

شاعر اپنی غزل سرائی میں معروف ہے، اور حور اب تک اس کی نگاہِ غلط انداز سے محروم ہے، لیکن وہ شاعر کی اس ادا سے، اس سے زیادہ اس کی غزل

سرائی سے، اس کے سوز و ساز سے، اس کے درد و آہ سے، بہت زیادہ متاثر ہو چکی ہے۔ یہ کھنچتا ہے، وہ بڑھتی ہے۔ یہ پیچھے ہٹتا ہے، وہ آگے بڑھتی ہے۔ یہ دامن سمیٹتا ہے، وہ ہمہ تن سپردگی بنی ہوئی ہے۔ اس کی بے نیازی، اس کی بے التفاتی۔ اس کی بے پروائی حور کے دل میں کچھ عجیب قسم کی کسک پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی نغمہ طرازی، اس کی غزل سرائی حور کے دل میں، ایک عجیب قسم کا طوفان برپا کر دیتی ہے۔ جسے وہ سمجھ نہیں پاتی کہ کیا ہے۔ لیکن یہ وہی چیز ہے جسے دنیا والے اپنی اصطلاح میں محبت کہتے ہیں۔ وہ پہلی مرتبہ، محبت کے راز سے ناواقف ہوتے، عشق کی لذت سے ناآشنا ہوتے ہوئے شاعر کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ لیکن اظہارِ عشق نہیں کر پاتی، اس لئے نہیں کہ اظہارِ عشق کرتے جھجکتی ہے، اس لئے کہ نہیں جانتی، اظہارِ عشق کس طرح کیا جاتا ہے، وہ بیچاری تو یہ بھی نہیں جانتی، محبت ہوتی کیا چیز ہے، اگرچہ اس دام میں گرفتار ہو چکی تھی۔ آخر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرتی ہے؛

به نوائے آفریدی چہ جہاں دلِ کشائے
کہ ارم بہ چشم آید، چو طلسمِ سیمیائی

اے شاعر!

تیری نوا کے دل فریب میں یہ کیسا جادو ہے، جس نے ایک نئے، بالکل نئے عالم میں مجھے پہنچا دیا ہے، اور یہ نیا عالم، مجھے، کیسا عجیب، اور مرغوب خالی نظر آرہا ہے؟ اب تک تو میں سمجھتی تھی کہ جنت ہی سب

کچھ ہے، لیکن اب یہ ارم، یہ فردوس، یہ جنت، مجھے ایک طلسمِ سیمیائی۔ ایک ہیچ اور بے حقیقت چیز نظر آرہا ہے ــــ بتا تو کون ہے؟ تیری نوا کیا ہے؟ یہ کشش تجھ میں کہاں سے آئی؟ یہ اندازِ دل آویزی تونے کہاں سے سیکھا؟ میں تجھ سے اتنی قریب آچکی ہوں، لیکن تو مجھ سے اتنا دور کیوں ہے؟

شاعر، حور کی یہ باتیں زیرِ لب تبسم کے ساتھ سنتا ہے اور پھر کہتا ہے:

دلِ رہ رواں فریبی، بہ کلام نیش دارے
مگر ایں کہ لذتِ او نہ رسد بہ نوک خارے

جو کچھ تم نے کہا میں نے سن لیا!

مانتا ہوں، تمہاری باتوں میں دل فریبی ہے اور سادہ لوح لوگ اس فریب کا شکار بھی بن جاتے ہوں گے۔ تمہاری باتوں میں ایک طرح کی چبھن ہے، لیکن وہ چبھن کہاں جو نوکِ خار میں ہوتی ہے، اور میں تو اسی کا جویا ہوں، میرے درد کا مداوا یہ نیش دار باتیں نہیں، نوکِ خار ہے۔

شاعر جب بولنے پر آتا ہے تو رکتا نہیں۔ ایک ایک بات کا جواب دیتا ہے۔ اور پھر صاف الفاظ میں کہہ دیتا ہے، میرا تمہارا نباہ نہیں ہو سکتا۔ میں تم پر قناعت نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔ میری جستجو ہر آن ترقی پر ہے۔ اسے زوال نہیں آ سکتا۔ اور آجائے تو پھر، میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میری زندگی عبادت ہے۔ صرف تلاش و جستجو سے، تب و تاب سے، سوز و ساز

سے، ان نغموں سے میں کیونکر دستبردار ہو سکتا ہوں! نہیں یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔ میرے مزاج کے خلاف ہے، تم چاہتی ہو، میں تم پر قناعت کروں، تمہارا ہو رہوں، تلاش و جستجو اور جذبۂ آرزو سے بے نیاز ہو جاؤں۔ یہ اَن ہونی بات ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! میرا عالم تو یہ ہے:

نہ شررِ ستارہ جویم، نہ ستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

چنگاری دیکھتا ہوں تو ستارہ کی طرف میرے ہاتھ لپکتے ہیں۔ ستارہ دیکھتا ہوں تو سورج کو اسیرِ دام کرنے کی تدبیریں سوچنے لگتا ہوں، تو مجھے آسودۂ منزل بنا دینا چاہتی ہے اور میں کسی منزل پر ٹک ہی نہیں سکتا۔ کسی منزل کو منزل قرار ہی نہیں دے سکتا، منزل پر پہنچ جانے کے معنی ہیں۔ موت، آرزو اور تمنا کی موت، منزل پر پہنچ کر سب کچھ پالیا۔ اب کس کے لئے تگ و دو ہو گی؟ اب کس کے لئے تلاش و جستجو کے مرحلے طے ہوں گے؟ اب کہاں رہ نوردی اور بادیہ پیمائی کا سلسلہ جاری رہے گا یا میں ایسی منزل کا قائل نہیں، میری منزل تو وہ ہے، جو نہ ملے، کیونکہ اگر کسی جادہ کو منزل قرار دے لوں، تو موت سے ہم آغوش ہو جاؤں اس لئے کہ قرار کا نام موت ہے اور منزل کا نام قرار ہے، آج میں تیرے پاس رُک بھی جاؤں، تو کل رختِ سفر باندھنا پڑے گا مجھے، کیونکہ کسی ایک جگہ قیام کر لینا، رہروانِ بے قراری کے مذہب میں جُرم ہے۔

چو نہ بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم

غزلے دگر سرائم، بہ ہوائے نو بہارے

بہار کا موسم کسے خوش نہیں آتا؟ یہ مرغانِ ہوا، یہ جانورانِ صحرائی، یہ انسان والاشان، کسے یہ موسم پسند نہیں؟ میں بھی اسے پسند کرتا ہوں۔ یہ آتا ہے تو اس کا استقبال دل کھول کر کرتا ہوں، بادۂ ناب اور جامِ صہبا سے لطف اٹھاتا ہوں۔ لیکن، جلد ہی دل رکتا جاتا ہے اور آنے والے موسمِ بہار کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اس کی شان میں غزل سرائی کرنے لگتا ہوں۔

—— نئی بہار، نیا نغمہ

طلسم نہایت آں کہ نہایتے نہ دارد!
بہ نگاہ ناشکیبے، بہ دلِ امیدوارے!

یہ بات تجھے عجیب سی تو لگے گی، لیکن واقعہ یہی ہے کہ میں اس نہایت کا طلبگار ہوں، جس کی کوئی انتہا نہیں، میں اس منزل تک پہنچنا چاہتا ہوں جو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہے گی، میرا مقصد وہ ہے جو کبھی نہیں حاصل ہو سکتا —— یہ نگاہِ ناشکیب اور، یہ دلِ امیدوار، تیرے لئے نہیں ہے، صرف اس کے لئے ہے، جو میرے لئے بھی نامعلوم ہے اور تیرے لئے بھی۔

دلِ عاشقاں بمیرد، بہ بہشتِ جاودانے
نہ نوائے دردمندے، نہ غمے، نہ غمگسارے

یہ بہشتِ جاوداں، جہاں نہ کوئی نوائے دردمند ہے۔ نہ کسی طرح کا غم نہ فکر، نہ کوئی ہمدرد، نہ غمگسار، عاشق کے لئے مقامِ حیات نہیں مقامِ مرگ ہے —— لہٰذا اے خدا تجھے اور تیری جنت کو دور سے سلام ہو!

——————

(۵۷)

نوائے حیات

ساری زندگی اقبال نے ایک ہی کام میں بسر کردی، یعنی اپنے ملک اور اپنی قوم تک پیام خودی پہنچایا گئے، لیکن اس نوائے حیات کا وہ اثر۔۔ کم از کم ان کی زندگی میں۔ مرتب نہیں ہوا، جو ہونا چاہیے تھا۔ آخر دل شکستگی اور مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں:

بہ خاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داؤدی

سرزمینِ ہند پر نوائے حیات کارگر نہیں ہوتی اور اس نوائے حیات کے کارگر نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ نغمۂ داؤدی بھی کسی مُردہ میں زندگی پیدا نہیں کرسکتا۔

اس مایوسی کے بعد شاعر سمجھتا ہے کہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا، تب اس کی نوائے حیات کارگر آئی۔ لوگ اس کی قدر کریں گے، اس کی غزل سرائی، اور نغمہ طرازی کو یاد کریں گے، اس کی تربت پر آئیں گے،

اور پھول چڑھائیں گے۔

چنانچہ کہتا ہے:۔ حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں!

دلبراں، زہرہ وشاں، گل بدناں، سیم براں

جب تک میں زندہ رہا، میرے سخن پر کسی نے توجہ نہ کی۔ میرے پیام سے اعراض کرتے رہے، اب کہ میں مر چکا ہوں تو میری تربت کو نوحہ گراں نے گھیر رکھا ہے اور وہ بتِ طنّاز، جو کسی سے آنکھ نہیں ملاتے تھے، نوحہ و ماتم اور آہ و فغاں میں مصروف ہیں۔

درچمن قافلۂ لالۂ و گل رفت کشود!

از کجا آمدہ اند ایں ہمہ خونیں جگراں؟

چمن میں قافلۂ نسریں و نسترن، لالۂ و گل ڈیرے ڈالے پڑا ہے، میرا سینہ بھی داغدار ہے، لالۂ و گل کے سینہ پر بھی داغِ حسرت موجود ہے، یہ خونیں جگر، ہستیاں کہاں سے آکر باغ و چمن میں جمع ہو گئی ہیں؟

اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق

نہ خرد بادہ کس از کارگہِ شیشہ گراں!

اے شخص! ــــ کہ تو مدرسہ، مکتب میں، ادب، دانش، اور ذوقِ سلیم کی جستجو میں آیا ہے۔ تیری سادہ لوحی قابلِ رحم ہے۔ یہ چیزیں، اس بازار میں کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں؟ بھلا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ شیشہ گردں کی دکان سے کوئی شخص بادہ صافی خرید لائے جا کر؟

خرد افزود مرا درس حکیمانِ فرنگ!

سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

میں نے مغرب کی دانش گاہوں میں اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ صرف کیا اور یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ فائدہ بھی اٹھایا، میری عقل بڑھی، دانش میں اضافہ ہوا، لیکن دل کو ان دانش گاہوں سے کچھ نہ ملا۔ سینہ خالی ہی رہا۔ قلب و روح کے لئے جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ اہلِ دل اور اہلِ نظر بزرگوں کے فیضِ صحبت سے، یہ صحبت اگر میسر نہ آتی تو یہ دانشِ افرنگی تو مجھے لے ڈوبتی۔ لیکن اس فیضِ صحبت سے میری روح میں جلا پیدا کر دی۔ میرے خیالات روشن کر دیئے۔ میرا دل پاک کر دیا، میری نظر میں وسعت پیدا کر دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری بصیرت بڑھا دی۔ لہٰذا اصل چیز دانش نہیں، محبت اہلِ دل ہے، جو کچھ ملتا ہے یہیں سے ملتا ہے۔

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گلِ تست
اے زخود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

اگر تو بھی وہ بننا چاہتا ہے، جو میں ہوں، وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، جو میں نے حاصل کیا ہے، تو پھر اس نغمہ پر توجہ کر، جو تیرے آب و گل کا سرمایۂ حقیقی بن سکے۔ یعنی خود شناسی اور خود نگری اور خودی اور دوسروں کے نوائے بے معنی سے اپنا دامن بچا لے!

کس نہ دانست کہ من نیز بہائے دارم
آں متاعم کہ شود دست زدِ بے بصراں

میری قدر و قیمت کسی نے نہ جانی۔ میں وہ پونجی ہوں، جو اندھوں کے ہاتھ پڑ گئی ہے، جو صرف ٹٹول کر اس کی قیمت ڈھونڈتے ہیں۔ دیکھ کر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔

گریہ ساماں میں، کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
شبنم افشاں تو، کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا !
گل بداماں ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا !
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا
یوں تو روشن ہے، مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

(۵۸)

مرغ نواطراز

شاعر، کسی ایک کیفیت کا پابند نہیں ہوتا، اُس پر مختلف، متعدد اور متنوع قسم کی کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں اور ان کا وہ اپنے مخصوص و منفرد رنگ میں اظہار کرتا رہتا ہے۔ کبھی تغزّل کے رنگ پر آتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے:

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر!

لیکن ایسی کیفیتیں زیادہ دیر پا نہیں ہوتیں۔ تغزّل کا رنگ گو اقبالؔ کے ہاں چوکھا ہے۔ لیکن بہت کم ہے۔ ان کا اصل رنگ دوسرا ہے اور وہی ان کے سارے کلام پر ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ یعنی:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو رُوح کو گرما دے، جو قلب کو تڑپا دے

سر پھر کے نئے نئے طرزِ اسلوب سے، وہی ایک بات دہراتے رہتے ہیں، اس تکرار واعادہ سے نہ خود بے کیف ہوتے ہیں۔ نہ دوسروں کو بے کیف ہونے دیتے ہیں،

اقبالؔ نے، اپنی زندگی میں، اپنے کلام کا۔ کسی نہ کسی حد تک اثر دیکھ لیا اور وہ بڑی حد تک خوش گوار اور امید افزا تھا۔۔۔۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی نغمہ سرائی نے۔ ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں ایک نیا جوش ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ غلامی کی زندگی سے وہ بیزار ہو گئے، آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ وطنیت کے خلاف سب سے زیادہ شدید اور پر خراش جہاد اقبالؔ نے کیا تھا، وہ جانتے تھے اور بتاتے تھے۔

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

انھوں نے صاف اور واضح الفاظ میں مسلمانوں کو بتا دیا تھا کہ یہ وطنیت وہ چیز ہے جو،

غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے

اور مسلمانوں نے اس راز کو اچھی طرح سمجھ بھی لیا تھا۔ بے شک، ان کے ایک حصہ نے وطن کا بُت بنایا، اور اس کی پوجا شروع کر دی۔ لیکن غالب ترین حصہ وطنیت سے بیزار اور ملت کا پرستار رہا، یہی وجہ تھی کہ اس نے عالمِ اسلام کا ہند، میں غلام ہونے کے باوجود پورا پورا ساتھ دیا۔ کسی مسلمان ملک پر آفت آئی اور یہاں کے مسلمان بے قرار ہو گئے، کسی ملک میں، کسی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھا، اور

یہاں کے مسلمان اس کی خلش اپنے دل میں محسوس کرنے لگے، ترکوں پر، اتحادی حکومتوں نے پہلی جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد قیامت توڑی۔ اس دیس کے مسلمان سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے تحریکِ خلافت کے نام سے ایسی عظیم الشان تحریک چلائی، جس کی مثال ایشیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ وہ غریب تھے، لیکن انھوں نے کروڑوں روپیہ کا ڈھیر لگا دیا۔ کہ اس سے ترکوں کی اعانت کی جائے، وہ غلام تھے لیکن انھوں نے ترکوں کی تائید و حمایت میں جیل کی کوٹھڑیاں بھر دیں۔ دار و رسن کو لبیک کہا۔ اپنی اموال و املاک کو ضبط کرا دیا اور برطانوی سامراج کے قصرِ فلک پیما میں زلزلہ ڈال دیا۔ مصر پر جب کوئی ناگہانی آفت آئی یہاں کے مسلمان بے قرار ہو گئے اور اس کی امداد و اعانت میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ عراق پر جب تباہی آئی تو یہاں کے مسلمانوں نے ایسا محسوس کیا جیسے یہ تباہی انھی پر آئی ہے، فلسطین پر جب یہودیوں کی یورش ہوئی اور امریکہ، برطانیہ اور دوسری مملکتوں نے وطن الیہود کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانا چاہا اور اس سلسلہ میں کشت و خون کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ یہاں کے مسلمان ہی تھے جنھوں نے صیہونی تحریک کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دی اور اس طرح سے مسلمانانِ فلسطین کی پشت پناہی کی، شام پر جب فرانسیسی سامراج نے دستِ تعدی دراز کیا تو وہ یہاں کے مسلمان ہی تھے جنھوں نے، بے بس، بے سہارا اور غلام ہوتے ہوئے بھی، اپنی قوت اور طاقت کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ دولِ مغرب کو

سکتہ ہوگیا۔ غرض جب کبھی کوئی حادثہ عالم اسلام میں رونما ہوا مسلمان نچلے نہ بیٹھ سکے۔ انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک آزاد اور فعال قوم کر سکتی ہے، حالانکہ وہ آزاد تھے نہ فعال نہ کارگزار۔

لیکن خود عربوں کا کیا حال تھا؟

جن عربوں نے دینِ اسلام پھیلایا، جنھوں نے دنیا کو اخوت، مساوات اور انسانیت نوازی کا درس دیا، جنھوں نے سب سے پہلی مرتبہ

ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

کا نعرہ بلند کیا، جنھوں نے اپنے وطن سے نکل کر ساری دنیا میں، اپنے دین کا پرچم لہرایا اور دنیا کو باور کرا دیا کہ یہ دین کسی خاص سرزمین، کسی خاص قوم، کسی خاص نسل سے وابستہ نہیں ہے۔ یہ ایسا دین ہے جس کے حلقہ میں ہر شخص داخل ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ فرنگی ہو یا ہندی، حبشی ہو یا فرنگی، دراز قامت ہو، یا پستہ قد، اور اس حلقہ میں داخل ہونے کے بعد سب بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ پھر ان میں کوئی امتیاز تقوے کے سوا قائم نہیں رہتا۔ مساوات اور اخوت کا یہ عدیم المثال نظارہ دنیا نے صرف مسلمان قوم ہی میں دیکھا تھا۔ لیکن اب وہی عرب تھے جو اپنے دین کی اس بنیادی تعلیم کو فراموش کر چکے تھے، وہ وطنیت کے چکر میں گرفتار ہو چکے تھے۔ انھوں نے جو سبق دوسروں کو پڑھایا تھا، خود سے حرفِ غلط کی طرح، اپنے صفحۂ قلب سے مٹا چکے تھے مصر ہو یا عراق، شام ہو یا حجاز، نجد ہو یا یمن، شرقِ اردن ہو یا لبنان، ہر جگہ اب مسلمانوں کا نعرہ وطن ہی تھا، دین نہ تھا۔

اقبالؔ یہ دل خراش منظر دیکھتے تھے اور کڑھتے تھے۔ یہی کیفیت تھی، جو الفاظ کا جامہ پہن کر، شعر کی صورت میں نمایاں ہوئی۔

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت!
عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است!

یعنی عجم نے تو کسی حد تک میری بات سُنی۔ میرا پیام سمجھا لیکن عرب ہنوز میرے نغمۂ شوق سے بے خبر اور بے پروا ہے وہاں تک نہ میری آواز پہنچی ہے۔ نہ پیام، حالانکہ سب سے زیادہ ضرورت اس کی تھی کہ میرا پیام وہاں تک پہنچتا۔

اقبالؔ، اپنی شاعری سے، ایران و توران، افغانستان و ہندوستان، چین و ماچین، سمرقند و بخارا، حجاز و یمن، شام و عراق اور مصر و مغربِ اقصیٰ۔ ہر جگہ کے مسلمانوں میں وہی جوش پیدا کرنا چاہتے تھے جو آغازِ اسلام میں ان کے اندر پایا جاتا تھا اور جس نے انھیں دنیا کے بہت بڑے حصّہ کا مالک بنا دیا تھا، اور یہ سطوت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنی محکوم دنیا کو، ایک نئی اور شاندار زندگی سے آشنا کر دیا تھا، وہ جب عالمِ اسلام پر جمود کی ساری کیفیت طاری دیکھتے تھے تو بے قرار ہو جاتے تھے کہ یہ وہی قوم ہے جو کبھی آگ تھی اور اب خاکستر؟

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم!
ہو گئے خاک، انتہا یہ ہے!

مسلمان قوم اور اس کا یہ حسرت ناک انجام؛ وہ چاہتے تھے،

مسلمان پھر وہی مسلمان بن جائیں، جو پہلے تھے اور اس کی بنیادی شرط یہ تھی کہ وہ لذتِ پرواز سے آشنا ہوں اور پابندِ مقام بن کر نہ بیٹھ جائیں۔
اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ آشیاں نہ نشیمن نہ لذتِ پرواز
گہے بہ شاخِ گلم، گاہ برلبِ جویم

یعنی لذتِ پرواز نے بعد میں یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ میں پابندِ مقام ہو کر آشیانہ میں بیٹھنا ہی پسند نہیں کرتا۔ کبھی شاخِ گل پر نغمہ طرازی کرتا ہوں۔ کبھی لبِ جو، غزل سرائی،

یہی جذبہ جب زیادہ بے قرار کرتا ہے تو کہہ اُٹھتے ہیں:

خیز و نقاب برکشا پردگیانِ ساز را
نغمۂ تازہ یاد دہ، مرغِ نوا طراز را

یعنی اُٹھ اور مرغِ نوا طراز کو پھر وہی نغمہ سے مدہوش کر دے، جس نے ایک مرتبہ اس سے پہلے بھی دنیا میں ایک نیا جوش برپا کر دیا تھا۔
پھر ظاہر پرست اور تصنع کے خوگر مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔

نعرۂ تو برآورد از دلِ کافراں خراش
اے کہ دراز ترکنی پیشِ کساں نماز را

ایک زمانہ تھا کہ تیرے نعرۂ اللہ ہو نے ساری دنیا کو لرزہ براندام کر دیا تھا، اور اب یہ کیفیت ہے کہ خود، اصل جذبہ سے محروم ہو چکا ہے۔ نماز پڑھتا ہے تو دکھاوے کی، اور اس کا تصنع اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ

اور تو اور کافر تک تیرے اس سجدۂ ریائی کی حقیقت سمجھنے لگے ہیں اور اس طرح وہ تجھے سجدہ ریز دیکھ کر افسوس کرتے ہیں کہ کیوں اپنا وقت ایسے کام میں ضائع کر رہا ہے جس کا اثر، خود تیری ذات پر کس طرح کا مرتب ہوتا ہے، نہ دوسروں پر،

گرچہ متاعِ عشق را عقل بہائے کم نہد
من ندہم بہ تختِ جم، آہِ جگر گداز را

اے مسلمان!

اپنے احوال و مقامات سے آگاہ ہو، اپنی حقیقت پہچان، پھر اپنے اندر وہ آہِ جگر گداز پیدا کر، جس نے تجھے میرِ قافلہ بنا دیا تھا اور جسے کھو دینے کے بعد، تیرا شمار قافلہ کے پیچھے چلنے والوں میں نہیں رہ گیا ہے۔ مجھے دیکھ، مجھ فقیرِ بے نوا کو، مجھے یہ آہِ جگر گداز اتنی عزیز ہے کہ اسے دے کر تختِ جم بھی نہ لوں۔

وہی بات جو ابھی پہلے انھوں نے کی تھی، پھر اسے دہراتے ہیں، واردات اپنے بیان کرتے ہیں، درس قوم کو دیتے ہیں:

زمقامِ من چہ پرسی؟ بہ طلسمِ دل اسیرم
نہ نشیبِ من نشیبے، نہ فرازِ من فرازے

رہِ عاقلی رہا کن کہ بہ او تواں رسیدن
بہ دلِ نیاز مندے، بہ نگاہِ پاک بازے

بہ رہِ تو ناتمامم، ز تغافلِ تو خامم
من و جانِ نیم سوزے، تو و چشمِ نیم بازے

طلسمِ دل کی کیفیت، نشیب و فراز کے اسرار و رموز، راہِ عقل کی
ج روی، دلِ نیاز مند اور نگہ پاک باز کی اثر انگیزی، اپنی ہستی کی ناتمامی دکھائی
بانِ نیم سوز اور چشمِ نیم باز کی داستان سنانے کے بعد، اپنے مقصد
لی اور زیادہ وضاحت کرتے ہیں —— لیکن بڑے خوشنما طریقے سے

صورت نہ پرستم من، بت خانہ شکستم من
آں سیلِ سبک سیرم، ہر بند گسستم من

یعنی میں صورت پرست نہیں ہوں نہ اصنامِ سنگی کی پرستش کرتا ہوں، نہ اصنامِ خیال کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ میرا کام بت خانوں کو خواہ وہ نفس کے ہوں یا مادے کے توڑ دینا ہے، میں سیلِ سبک سیر ہوں، جو ہر بند کو، ہر رکاوٹ کو توڑ دیتا ہے، پاش پاش کر دیتا ہے۔ یہی خصوصیت کبھی مردِ مسلمان کی تھی اور آہ کہ اب اسی خصوصیت سے وہ محروم ہو چکا ہے۔

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلیٰ ترا!
اے دُرِ تابندہ! اے پروردۂ آغوشِ موج
لذّتِ طوفاں سے ناآشنا دریا ترا
اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

•

(۵۹)

رمزِ حیات

تپش، خلش، اضطراب، اضطرار ــــ یہ ہے زندگی کا، نہیں زندگی کا نہیں، زندہ رہنے اور زندہ قوم بننے کا راز! ــــ اقبال اسی راز کی نقاب کشائی کرتے ہیں، وہ بتاتے ہیں، اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو قرار و قیام نہ اختیار کرو۔ قرار و قیام کا تعلق زندگی سے نہیں موت سے ہے۔ مرنا چاہتے ہو تو ٹھہر جاؤ، رُک جاؤ، قیام اختیار کرلو۔ قرار کے خوگر ہو جاؤ، لیکن زندگی مطلوب ہے تو سیماب کی طرح۔ موجِ بے قرار کی طرح، آزاد جستجو پیدا کرو، اور ایک ایسی منزل کی طرف جس کی کوئی انتہا نہیں۔ بڑھو، بڑھے چلو، بڑھتے چلے جاؤ!

ــــ یہی درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

رمزِ حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی!
درِ قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را

رمزِ حیات معلوم کرنا چاہتے ہو تو وہ صرف یہ ہے کہ تپش اور خلش کی

زندگی اختیار کر لو، دریا کا وجود اسی وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ قلزم (سمندر) میں گرتا ہے، اپنا وجود باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنی انفرادیت قائم رکھو اور انفرادیت وہی قائم رکھتے ہیں جو زندہ ہوں، جو مر چکے ہوں، یا مرنا چاہتے ہوں انہیں انفرادیت سے کیا تعلق؟

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام داری
درماں نیافریدی آزارِ جستجو را

اے خدا ــــ!

میں خوش ہوں کہ تو نے، عاشقوں کو، سوزِ دوام کی نعمت عطا فرمائی ہے اور ان کے آزارِ جستجو کا کوئی مداوا نہیں پیدا کیا ہے۔ اگر آزارِ جستجو کا مداوا تو پیدا کر دیتا تو پھر یہ سوزِ دوام کی نعمت کہاں ملتی؟

از نالہ بر گلستاں آشوبِ محشر آور
تا دم بہ سینہ پیچد، گلزار ہائے، ہو ر

اپنے نالہ سے، اپنے شورِ جنوں انگیز سے، گلستاں میں آشوبِ محشر برپا کر دے اس لئے کہ یہاں کے لوگ بہرے ہیں سنتے نہیں، جب تک دم میں دم ہے۔ جب تک تیرے سینہ میں دل دھڑک رہا ہے اپنے شورِ جنوں انگیز، اپنے ہا ؤ ہو" وہ اپنے نعرۂ ہیہا کا نہ میں فرق نہ آنے دے کہ یہی اصل حیات ہے۔ اسی طرح تو زندہ رہ سکتا ہے۔ اسی طرح تو دوسروں میں زندگی کی حرارت اور تڑپ پیدا کر سکتا ہے۔

پھر ایک دوسرے مقام پر بتاتے ہیں کہ اگر تو نے اپنے اندر سوزِ

حیات، جذبۂ حیاتِ دوام، اور سوزِ تمام پیدا کرے، پھر تجھے کیا کرنا چاہیئے۔ آخر اس شورِ جنوں انگیز کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیئے۔ اس ہاؤ ہو کو بے مقصد تو نہ ہونا چاہیئے مانا کہ تو نے آسمان و زمین میں جنبش پیدا کردی۔ ساری دنیا کو تہ و بالا کردیا۔ لیکن حاصل؟ مقصد؟ یہ بھی تو کچھ ہونا چاہیئے۔ وہ کیا ہے؟

اقبالؔ بتاتے ہیں وہ مقصد ہے مسلکِ شبیری، اور یہ نہیں حاصل کرسکتا تو میرے قریب نہ آ

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

میرا مقصد؟

میرا مقصد تو تیر و سناں و خنجر و شمشیر ہے۔ کسی غلط کام کے لئے نہیں۔ حصولِ جاہ و اقتدار کے لئے نہیں۔ مالِ غنیمت اور جوع الارض کے لئے بھی نہیں، دوسرے لوگوں کو غلام بنانے کے لئے بھی نہیں، یہ مقصد مسلکِ شبیر کے تتبع میں، میں نے پیشِ نظر رکھا ہے حسینؑ کا مقصد اپنی سلطنت قائم کرنا نہیں تھا، اعلاء کلمۃ الحق تھا۔ دینِ اسلام کی سربلندی تھا، وہ اس وقت تیر و سناں اور خنجر و شمشیر لے کر میدانِ جہاد میں اترے تھے۔ جب اسلام کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ اسلام کے احکام پامال کئے جارہے تھے۔ اسلام کی تعلیمات دل سے محو ہو چکی تھیں، ایک غیر اسلامی، غیر الٰہی اور غیر انسانی حکومت مسلمانوں پر مسلط کردی گئی تھی۔

اسے توڑنے کے لئے۔ اسے ختم کرنے کے لئے، تلوار اٹھانے کی ضرورت تھی۔ میدانِ کربلا اس حقیقت کا مظہر ہے اور تو مسلمان ہے، تو اس حقیقت کو فراموش نہ کر۔ اس سبق کو یاد رکھ اور اگر تو یہ نہیں کرنا چاہتا تو پھر میرا راستہ اور ہے۔ تیرا راستہ اور، پھر تو میرے پاس نہ آ، پھر میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا، تو پھر مجھ سے کچھ نہیں حاصل کر سکتا۔

گفتند لب بہ بند و ز اسرارِ ما مگو
گفتم کہ خیز — نعرۂ تکبیرم آرزو است

مجھ پر قدغن ہے کہ میں اسرارِ الٰہی فاش نہ کروں، ٹھیک ہے، میں اس حکم کی پابندی کروں گا۔ لیکن تمنا صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ نعرۂ اللہ اکبر بلند کر لوں۔

اور نعرۂ اللہ اکبر بلند کرنے کے بعد پھر رہ کیا گیا جو کہا جائے۔ اللہ اکبر، یعنی اللہ سب سے بڑا ہے جس نے یہ کہہ دیا، اس نے سب کچھ کہہ دیا۔ جس نے خدا کو سب سے بڑا مان لیا، پھر وہ کسی کی بڑائی کے آگے سر جھکا سکتا ہے؟

کبھی کبھی اقبال اپنے مشرب کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں اور یہ مشرب خودی کے سوا کچھ نہیں۔

من فقیرِ بے نیازم مشربم این است و بس
مومیائی خواستن نتواں شکستن می تواں

میں ایک فقیرِ بے نیاز ہوں۔ کسی کے سامنے دریوزہ گری نہیں کرتا۔ نہ مال و دولت کی، نہ جاہ و منصب کی، نہ اقتدار و اختیار کی، نہ زندگی اور حیاتِ مستعار کی۔ مجھے مر جانا منظور ہے لیکن زخمِ دل کے علاج کے لئے کسی سے مومیائی مانگنا منظور نہیں!

پھر ایک اور مقام پر یہی بات بہ انداز دگر فرماتے ہیں۔

ناز شہاں نمی کشم زخم کرم نمی خورم
در نگر اے ہوس فریب ہمت ایں گدائے را

اس جذبہ کو اور زیادہ نمایاں، اور شاندار طور پر ایک دوسری جگہ پیش کرتے ہیں۔

نہ بہ امروز اسیرم نہ بہ فردا نہ بہ دوش
نہ نشیبے، نہ فرازے، نہ مقامے دارم!

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

پردہ برگیرم در پردہ سخن می گویم!!
تیغ خوں ریزم و خود را بہ نیامے دارم!

ایک غزل کا شعر

حدیثِ دل بہ کہ گویم کہ چہ را برگیرم!
کہ آہ بے اثر است و نگاہ بے ادبی است

(۶۰)

نوائے پریشاں

نوائے پریشاں ــــ شاعر کی فطرت ہے۔ وہ اگر اپنا موضوع نہ بدلتا رہے۔ اسلوب و انداز میں تغیر نہ کرتا رہے، تو پھر وہ شاعر کہاں رہا! ــــ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ، فکری تنوع شاعر کے پیام اور دعوت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، یہ بات نہیں ہے، پیام اور دعوت اپنی جگہ ہے لیکن فکر و خیال کا تنوع اپنے مقام پر خود ہی کہتے ہیں۔

اقبالؔ بہ سبز تر درازے کہ نہ باید گفت
تا پختہ بردی آمد از خلوتِ میخانہ!

بتائیے اس سے بڑھ کر راز اور عمیق فلسفہ کیا ہو سکتا ہے؟ ــــ ذاتِ باری تعالیٰ کو مخاطب کر کے کتنی کھری بات، کتنے سبک اور دل نشین الفاظ میں فرماتے ہیں۔

بے تو از خوابِ عدم دیدہ کشودن نتواں
بے تو بودن نتواں، با تو نبودن نتواں!

اتنا گہرا خیال، اتنے مختصر اور بلیغ الفاظ میں صرف اقبالؔ ہی ادا کر سکتے تھے۔ فرماتے ہیں،

اے خدا، اگر تو نہ ہوتا، تو خوابِ عدم سے، ہماری آنکھ کیسے کھلتی؟ ہم کیونکر عالمِ وجود میں آ سکتے تھے؟ ہماری ہستی تیرے وجود کی سب سے بڑی اور ناقابلِ شکست دلیل ہے، تو نہ ہو تو کسی ہستی کا عالمِ وجود میں آنا ناممکن اور قطعاً ناممکن تو ہوا در ہست و وجود کی کارفرمائی نہ ہو، یہ اس سے زیادہ اَن ہونی اور ناممکن بات ہے۔

در جہاں است دل ما کہ جہاں در دل ماست
سب خرد بند کہ ایں عقدہ کشودن نہ تواں

یہ سوال کہ یہ دنیا سیمیا کی سی ہستی رکھتی ہے۔ یا حقیقتہً اس کا کوئی وجود ہے؟ یہ وجود، خارج میں ہے، یا ہمارے تصوّر کی کرشمہ سازی ہے، جیسا کہ غالبؔ نے کہا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

یا خود اقبالؔ، بعض مواقع پر، محض "اندازِ بیاں" سے تعبیر کر چکے ہیں۔ بہر حال یہ بات کہ ہم دنیا میں ہیں یا دنیا ہم میں ہے، بڑی نازک اور پیچیدہ بات ہے۔ یہ ایسی گتھی ہے جو سلجھ نہیں سکتی ایسا معمہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا۔ ایسی گرہ ہے جو کسی کے کھولے کھل نہیں سکتی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس مسئلہ پر جنبشِ لب سے کام نہ لیا جائے۔

جانتے ہیں یہ باتیں اتنی گہری ہیں کہ ہر شخص کی ان تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

دلِ یاراں ز نواہائے پریشانم سوخت
من ازاں نغمہ تپیدم کہ سرودن نتواں

دوستوں اور ساتھیوں کے دل میری نوائے پریشاں سے تنگ آ چکے ہیں اور وہ مجبور بھی ہیں۔ بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ میں وہ نغمہ الاپ رہا ہوں جو پاتیدِ سرود نہیں ہو سکتا۔ یعنی گایا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن وہ نغمہ کیا ہے؟ وہ بھی سن لیجیے:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

یعنی میرے دشتِ جنوں میں جبریلؑ ایک صیدِ زبوں ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اے ہمتِ مردانہ، تو جو چاہے، تو یزداں کو گرفتار کمند کر سکتی ہے، یعنی جو خدا کا ہو رہتا ہے، وہ پھر صفاتِ خداوندی حاصل کر لیتا ہے۔

مردانِ خدا، خدا نہ باشند!
لیکن ز خدا، جدا نہ باشند!

اقبالؒ نے اس شعر میں جو کچھ کہا ہے، وہ درحقیقت اسلام کی اصل روح اور اصل تعلیم ہے۔ مسلمان جب تک خدا سے دُور رہیں گے، خوار اور رسوا ہوتے رہیں گے اور جب وہ خدا کے رنگ میں رنگ جائیں گے پھر وہی قوت بن جائیں گے جس نے نہ صرف روما کا بلکہ دنیا کا تختہ اُلٹ

دیا تھا۔ اقبال کے یہ افکار، از روئے تخیل نئے نہیں ہیں۔ یہی بات مولانا روم بھی

فرشتہ صید و پیغمبر شکار و یزداں گیر

فرما چکے ہیں۔ لیکن اندازِ بیان زیادہ بلند ہے اور نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے عام طور پر بہتر ہوتا ہی ہے۔

دل بہ حق بند و گشا اے ز سلاطین طلب
کہ جبیں بر درِ ایں بت کدہ سودن نہ تواں

اگر تو سچا مسلمان ہے تو پھر تیرا ماتھا، صرف خدا کے سامنے جھکنا چاہیئے۔ یہ سلاطینِ جہاں تجھے کیا دیں گے؟ اور کہاں تک دیں گے؟ یہ تو خود محتاج ہیں، ان کا یہ جاہ و جلال بھی اس وقت تک ہے جب تک خدا کو منظور ہے۔ تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء جسے چاہتا ہے حکومت اور ملک عطا فرما دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے حکومت اور ملک چھین لیتا ہے۔ تاریخ کے صفحات ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں کہ جو سلطان ذی فرمان تھے وہ گلیوں میں بھیک مانگنے لگے، اور جو فقیر رہ نشین تھے وہ تختِ بادشاہت پر متمکن ہو کر حکومت کرنے لگے۔ لہٰذا مسلمان کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ درِ سلطان پر دریوزہ گری کرے اور خدائے بزرگ و برتر کو فراموش کر دے۔ اس کے بتکدہ پر سر کو جھکائے، انسانیت کی توہین ہے، بلکہ انسانیت کیا چیز ہے۔ خالق ارض و سما کی توہین ہے۔ جس کے دل میں شمہ برابر بھی ایمان ہو، وہ بادشاہوں

اور سلطانوں کے در پر سر نہیں جھکا سکتا۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ جو توحید کے خلاف ہو۔ جس سے توحید کے عقیدہ پر زد آتی ہو۔ ضرب پڑتی ہو۔ توحید کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ انسان ماسوا اللہ کے یکسر بے نیاز اور بے پروا ہو جائے اور صرف خدا کا ہو رہے۔

اور یہی شاعر جو اتنی اونچی، اتنی گہری، اور اتنی ٹھوس باتیں کرتا ہے، جب غزل سرائی پر آتا ہے تو بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتا۔ سب سے آگے نکل جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے، موسم بہار کی جنوں پرور کیفیت بیان کرتے ہوئے کس طرح دعوتِ سیرِ گل دیتا ہے،

برخیز کہ فرور دیں افروخت چراغ گل
برخیز دمے بہ نشیں با لالۂ صحرائی

اے دوست!

اٹھ کہ بہار کا جان پرور موسم آگیا، چمن کے چپہ چپہ پر پھولوں کے چراغ روشن ہو گئے، یہ وقت گوشۂ عزلت میں بیٹھنے کا نہیں، اٹھ اور سیر گل کر، لالۂ صحرائی کے ساتھ کچھ وقت گزار، اس لئے کہ اس میں اور تجھ میں مناسبت ہے۔ وہ بھی عشق پیشہ ہے اور تو بھی، عاشق ہرجائی! اس کا سینہ بھی داغدار ہے اور تو بھی اپنے سینہ میں یہ پونجی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چھپائے ہوئے ہے۔

عشق است و ہزار افسوں، حسن است و ہزار آئیں
نے من بہ شمار آیم، نے تو بہ شمار آئی

عشق کے ہزاروں انداز ہیں، حسن کی ہزاروں ادائیں ہیں، نہ ان کا شمار

کیا جا سکتا ہے نہ یہ شمار میں آسکتی ہیں۔

اور یہی سیرِ چمن اور مشاہدۂ گل کی دعوت دینے والا شاعر، جب حکیمانہ باتوں پر آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے نہ گل سے غرض ہے نہ لالۂ صحرائی سے، نہ یہ رنگین مزاج ہے، نہ اس سلسلہ میں رعنائی خیال ہے، یہ صرف ایک انقلابی ہے جس کے الفاظ میں خروش ہے۔ رعنائی نہیں جس کے انداز میں طنطنہ ہے، جمال نہیں، جس کے تیور میں دہشت ہے، ملاطفت نہیں ــــ کتنے ذوق اور کتنے جوش کے ساتھ کہتا ہے۔

وائے آں قافلہ کز دونیٔ ہمت می خواست
رہ گزارے کہ درو ہیچ خطر پیدا نیست

اس قافلہ سے زیادہ قابلِ افسوس بات اور کس کی ہوگی، جو اپنی دونی ہمت کے باعث ایسا راستہ تلاش کرتا ہے جو خطرہ سے خالی ہو، حالانکہ زندگی خطرات ہی میں پوشیدہ ہے، حضرت علیؓ نے کتنی بلیغ بات فرمائی ہے۔

"میری موت میری محافظ ہے۔"

جو شخص، موت کو اپنا محافظ قرار دیتا ہو، وہ خطرات سے نہ گھبرا سکتا ہے، نہ پریشان ہو سکتا ہے، نہ انہیں خیال میں لا سکتا ہے۔ یہ بات فاتح خیبر ہی کی زبان کو زیب دیتی تھی، لیکن اس فاتح خیبر کی قوم آج پست ہمتی کا شکار ہے اور خوف و ہراس نے اس کی ہمت چھین لی ہے۔

بگذر از عقل و درآویز بہ موجِ یم عشق
کہ درآں جوئے تنگ مایہ گہر پیدا نیست

پھر درسِ حیات ان حیات افروز الفاظ میں دیتے ہیں کہ عقل کی دُور اندیشیوں سے کنارہ کشی اختیار کر، عشق کے بحرِ بیکراں میں کود پڑ۔ گوہرِ مقصود وہیں ملے گا، یہاں نہیں، موتی سمندر میں ہوتے ہیں تو جوئے تنک مایہ میں تلاش کرنے چلا ہے؟

تھا جنھیں ذوقِ تماشا، وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے
ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا!

●

مقامِ اقبالؔ

شعلہ بودیم، شکستیم و شرر گردیدیم!
صاحبِ ذوق و تمنّا و نظر گردیدیم!

•

اقبالؔ کے پیام اور شاعری کا مقام بڑی آسانی سے متعین کیا جاسکتا ہے، گو وہ اس کے شاکی ہیں کہ:

گریۂ ما بے اثر، نالۂ ما نارسا است
حاصلِ ایں سوز و ساز یک دلِ خونیں نوا ست

لیکن، اپنے گریۂ بے اثر اور نالۂ نارسا سے وہ مایوس نہیں ہیں، اپنے دلِ خونیں نوا پر انہیں ناز ہے، فرماتے ہیں:

در طلبش دل تپید دیر و حرم آفرید
ما بہ تمنّائے او، او بہ تماشائے ماست

ہم اگر اس کے جویا ہیں، تو وہ بھی ہم سے غافل نہیں ہے۔ ہم اس کے لئے

تڑپتے ہیں۔ اس نے ہمارے لئے دیر و حرم پیدا کرکے سجدہ ریزی کا سامان کر دیا، ہمیں اس کی تمنا ہے۔ وہ خدا ہمارا مشتاق ہے۔

اسی لئے اقبال نے اپنی منزل جو تعین کی ہے وہ مقامِ کبریا ہے۔

شعلۂ در گیر زد بر خس و خاشاکِ من
مرشدِ رومی کہ گفت "منزلِ کبریاست"

اور اس منزل کو متعین کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقبال سراپا عشق و اضطراب بن کر رہ گئے۔ انھوں نے دین، اور دین کے پیامبر کو منتہائے نظر، حاصلِ حیات، اور مقصودِ فکر قرار دے لیا۔

اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار میں اقبال نے، اپنی اس کیفیت کو اثر انگیز اور دلآویز طور پر بیان کیا ہے۔ کہیں وہ فرماتے ہیں:

سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

کہیں ارشاد ہوتا ہے:

بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

کبھی کہتے ہیں:

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

کبھی اس پر فخر کرتے ہیں:

زادۂ مرا آشنائے روم و تبریز است

کبھی جوش و خروش، فخر و انبساط اور ناز و نیاز کے جذبات سے بے قرار

ہو کر صاف، اور واضح الفاظ میں، اپنی حیثیت اور اپنے مقام کو، خود اس طرح متعین کرتے ہیں۔

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است
ز خاکِ پاک و بخارا و کابل و تبریز

یعنی، گو میں، خود ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میری آنکھوں کا نور، اور دل کا سرور، بخارا، کابل اور تبریز کی خاک پاک سے وابستہ ہے، بصیرت میں نے وہیں سے حاصل کی ہے۔ روح کی سرخوشی میں نے وہیں سے پائی ہے۔ کشاد قلب و نظر جسے کہتے ہیں یہ چیز مجھے انہی مقاماتِ عالیہ سے ملی ہے۔

ایک جگہ، اپنی نوا کو نوائے غیب قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

نوا ز پردۂ غیب است اے مقام شناس
نہ از گلوئے غزل خواں، نہ از رگِ ساز است

یہ میری نوا جو تو سن رہا ہے۔ یہ پردۂ غیب سے نمودار ہوتی ہے۔ یہ گلوئے غزل خواں کا نتیجہ ہے۔ نہ رگِ ساز سے پیدا ہوئی ہے۔ مطلب یہ کہ اس میں جو سوز و ساز پایا جاتا ہے، وہ حقیقی ہے۔ مصنوعی نہیں ہے۔ اس میں آمد ہے، آورد نہیں۔

اپنے بارے میں ایک اور جگہ کس مزے میں کہتے

ہیں۔

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر!
دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

میرا یہ جسم خاکی، تو بے شک خیابانِ جنّت کشمیر کا ہے۔
لیکن میرا دل، حریمِ حجاز کا محرمِ اسرا ہے اور میری نوا، نوائے شیراز ہے۔

(۶۲)

پیش گوئی

شاعر، اگر مفکر اور حکیم ہو، تو وہ آنے والے دور کا اندازہ اپنی بصیرت سے کر لیتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ مستقبل کے پردہ میں کیا پنہاں ہے؟ عام لوگ آنے والے دور کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ شاعر اس دور کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور جو لوگ اس کی سنتے ہیں انہیں بتا بھی دیتا ہے اور پھر بعد میں آنے والے واقعات اس کی تائید و تصدیق بھی کر دیتے ہیں۔

اقبالؔ کا زمانہ کشمکش کا زمانہ تھا۔ جوع الارض کا زمانہ تھا، تحریک حریت و استقلال کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں بڑی اور طاقتور قومیں اپنے آلاتِ جنگ اور ساز و سامان سے مسلح ہو کر، کمزور اور غریب ملکوں میں لوٹ کھسوٹ مچا رہی تھیں۔ دوسروں کی زمینوں پر قبضہ کر رہی تھیں۔ دوسری قوموں اور ملتوں کو غلام بنا رہی تھیں۔ بڑی طاقت کا مقابلہ، چھوٹی طاقت نہیں کر سکتی۔ تلوار

کے مقابلہ میں چھری، بندوق کے مقابلہ میں لاٹھی، توپ کے مقابلہ میں
طمانچہ کام نہیں دے سکتا۔ جو قومیں کمزور تھیں، بے مایہ تھیں۔ نہتی تھیں
وہ غلامی قبول کرنے پر مجبور تھیں، لیکن اس کے یہ معنٰی نہیں تھے کہ وہ
غلامی پر رضامند بھی تھیں۔ انہیں غلامی سے اتنی ہی نفرت تھی جتنی امریکہ
کے آزاد باشندوں کو ہے۔ جس طرح کوئی انگریز، کوئی روسی، کوئی فرانسیسی،
کوئی جرمن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے ملک پر کوئی دوسری قوم قبضہ کر لے
اور اسے غلام بنا لے۔ اسی طرح یہ غلام مشرقی ممالک کے لوگ بھی اسے
پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے گلے میں غلامی کا طوق پہنا دیا جائے،
لیکن جس طرح دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد
آزادوں کو غلام بننا پڑا ——— فرانس پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ روس
کے کئی شہروں پر جرمن فوجیں قابض ہو گئیں۔ اطالیہ اتحادیوں کی تحویل
میں آ گیا، جرمنی کچھ عرصہ پہلے تک، فرانس، برطانیہ، امریکہ اور روس
کا غلام تھا اور اب بھی آدھا جرمنی روس کے قبضہ میں ہے ———
اور وہ کچھ نہ کر سکے اس لئے کہ مزاحمت اور مقاومت کی قوت
سے محروم تھے، تندآور فوجوں کا مقابلہ کرنے کی ان میں سکت
نہ تھی۔ اسی طرح یہ مغربی ممالک کے غلام مشرقی ممالک تھے۔ انھوں
نے آزاد رہنے کی کوشش کی، لیکن آزاد نہ رہ سکے۔ برطانیہ اور فرانس
کی قوتوں کے سامنے انھیں سر جھکانا پڑا، غلامی قبول کرنی پڑی مگر اس
کے باوجود ان کے دل غلامی سے بیزار تھے، نفرت کرتے تھے غلامی

سے، اور ان کا وہ طبقہ جو نسبتہً زیادہ باہمت تھا، برابر آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اقبالؔ یہ سارے مناظر دیکھ رہے تھے، اور محسوس کر رہے تھے کہ ظلم کی ناؤ زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی، ایک دن قصرِ استعمار سرنگوں ہوگا اور غلام آزاد ہوں گے۔ اور

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

اقبالؔ کو خدا نے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی دی تھی۔ وہ مردِ مسلمان تھے۔ تدبر کے ساتھ فراستِ مومن بھی انہیں عطا ہوئی تھی۔ وہ مستقبل کے مناظر کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا، یہ دورِ استعمار ختم ہوگا اور غلاموں کو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کا موقعہ ملے گا۔ چنانچہ وہ صاف الفاظ میں بشارت دیتے ہیں۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است!
زندگی درپئے تعمیرِ جہانِ دگر است!

آنکھ کھول اور اگر تو صاحبِ نظر ہے تو دیکھ لے زندگی ایک نیا جہان آرزو تعمیر کرنے پر آمادہ ہو چکی ہے۔

لیکن اقبالؔ جانتے تھے . ں ملک میں صاحبِ نظر کم ہیں۔ کم نظر بہت ہیں۔ لہٰذا وہ خود اپنی نظر اور اپنی بصیرت و فراست کے نتائج سے اپنی قوم کو مطلع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

من دریں خاک کہن گوہر جاں می بینم!
چشمِ ہر ذرّہ چوں انجم نگراں می بینم!

اس دنیائے کہن میں میری آنکھیں ایک نئی تڑپ دیکھ رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ویرانی دُور ہو جائے گی، یہ شکستگی رفع ہو جائے گی۔ یہ دَور ختم ہو جائے گا۔ نئی زندگی جنم لے گی، نیا عہد ابھرے گا۔ نیا دور نمایاں ہوگا اور جو مایوسی۔ بددلی اور پریشانی آج نظر آ رہی ہے۔ کل وہ قائم نہیں رہے گی۔ اس کے بجائے، زندگی نمودار ہوگی اور اس کے ساتھ، خوشی، انبساط اور نشاط کی کارفرمائی ہوگی۔

دانہ را کہ بہ آغوشِ زمین است ہنوز را
شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم

جو دانہ، ابھی آغوشِ زمین میں مستور ہے، جس نے ابھی زمین کے پردہ سے سَر باہر نہیں نکالا ہے، نہ جس کی کونپلیں پھوٹی ہیں، نہ برگ و بار آئے ہیں، میں اس دانہ کو دیکھ رہا ہوں، اس کی قوتِ نمو کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کی زندگی کو دیکھ رہا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ ابھرا، پھولا، بڑھا، پھیلا، اس کی شاخیں دُور دُور تک وسیع ہو گئیں۔ وہ پھل لایا، اس نے استحکام حاصل کر لیا، وہ ایک درخت بن گیا، جس سے خلقت فائدہ اٹھانے لگی۔

کوہ را مثلِ پرِ کاہ سبک می یابم!!
پرِ کاہ صفتِ کوہِ گراں می بینم

پہاڑ مجھے گھاس کا تنکا نظر آ رہا ہے۔ گھاس کے تنکے سے زیادہ سبک، ہیچ، اور ہیچ اور گھاس کے تنکے کو، میں پہاڑ کی طرح، باوقار، بلند و بالا، اور عظیم

وجلیل دیکھ رہا ہوں۔

کوہ کا دور ختم ہو رہا ہے۔ یعنی ملوکیت دم توڑ رہی ہے۔ سرمایہ داری کا نام ونشان مٹنے والا ہے، سامراج، استعمار، ہوس جوع الارض، ملوکیت، غلبہ وتسلط، استدراب، یہ ساری چیزیں جو طاقتوروں نے کمزوروں کو ہڑپ کرنے کے لئے بنائی تھیں ایک ایک کرکے ختم ہوں گی، ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ اس طرح مٹ جائیں گی جس طرح بادِ صرصر، ریت کے تودے کو اڑا لے جاتی ہے۔

اور یہ پرکاہ، یعنی یہ مزدور، یہ سادہ لوح کاشتکار، یہ متوسط طبقہ، جس کی کوئی بات نہیں پوچھتا، جسے کوئی منہ نہیں لگاتا، جس کے بارے میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ صرف اس لئے ہے کہ ظلم سہے۔ غلامی کی زندگی بسر کرے۔ مار کھائے اور اُف نہ کرے۔ لوٹا جائے، اور فریاد نہ کرے۔ تباہ کیا جائے اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ عروج حاصل کرے گا، ترقی کرے گا۔ پارلیمنٹ اس کے دوٹوں سے بنے گی، حکومت کی تشکیل میں اس کا ہاتھ ہوگا، وہی حکومتیں قائم رہیں گی جو عوام کے میلان ورجحان کی پابند ہوں گی۔ وہ حکومتیں ٹوٹ جائیں گی جو عوام سے ٹکرائیں گی۔ وہ نظام نافذ ہوگا، جو عوام کا منظور کیا ہوا ہو۔ وہ نظام مسترد کردیا جائے گا جسے عوام کی منظوری نہ حاصل ہو۔ وہ دستورِ حیات بحال ہوگا، جو عوام کا ہو۔ عوام کے لئے ہو، عوام نے بنایا ہو اور وہ دستورِ حیات بے وقعت ہوگا جسے عوام کی خوشنودی نہ حاصل ہو۔

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیرِ افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

میں آنے والے انقلاب کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ انقلاب، جس کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جس کے بارے میں سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ ہمہ گیر ہوگا ـــــ بہت خون ریز ہوگا۔ اس کے نتائج و ثمرات اور اثرات کیا ہوں گے؟ اور میں تو خود اس کی بشارت دے رہا ہوں۔ اسے بر افگندہ نقاب دیکھ رہا ہوں۔ اس کی پیشین گوئی کر رہا ہوں۔ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیسا ہوگا۔ ہاں الفاظ مجھے نہیں ملتے جو میرے مفہوم کو واضح کر سکیں۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ اقبال نے جس انقلاب کی بشارت دی تھی وہ نمودار نہیں ہوا؟ اس نے کیا کچھ اس انقلاب کے باعث نہ دیکھا؟ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، ترکی، یونان، شام، لبنان، عراق، ایران، ہندوستان، افغانستان، مصر، روم، البانیہ، الجزائر، مغربِ اقصیٰ، اسپین، کہاں اس انقلاب کے قدم نہیں پہنچے؟ کہاں اس نے قیامت نہیں برپا کی؟ کہاں اس نے خون کی ہولی نہیں کھیلی؟

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

خوش قسمت ہے وہ شخص، جو اس گرد و غبار کے طوفان میں، حقیقت کا جلوہ دیکھ لے۔ جو تاروں کے لرزنے سے اندازہ لگا لے،

کہ نغمہ کیا ہوگا، کیسا ہوگا؟

تو اگر خود دار ہے منت کش ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر
خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
ہاں! اسی شاخِ کہن پر پھر بنا لے آشیاں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر!
اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

•

درسِ حیات

شاعر، خودی کا پیامبر ہے، خودی کا رمز شناس ہے۔ خودی کا منبع اور داعی ہے۔ وہ اس زندگی کو زندگی سمجھتا ہے، جو خودی سے ہمکنار ہو۔ اس زندگی کو وہ موت قرار دیتا ہے، جو خودی سے محروم ہو۔ وہ نئی نئی تشبیہوں، نئے نئے استعاروں، اور نئے نئے طریقوں سے اس مفہوم کو واضح کرتا ہے۔

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات

وہ چاہتا ہے، ملّتِ اسلامیہ، خودی کی رمز شناس بن جائے، اور ایک مرتبہ پھر وہ مقام حاصل کرلے جو اسے آغاز میں حاصل تھا۔ وہ ایسے مسلمان کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا، جو مسلمان ہو اور غلام ہو، مسلمان ہو اور ذلیل ہو، مسلمان ہو اور دُنیا میں اس کی حیثیت فرماں روا یا نہ نہ ہو۔ شیر اس لئے نہیں پیدا ہوتا کہ بیل گاڑی میں جوتا جائے۔ بجلی اس لئے نہیں ہوتی کہ اس سے ہاتھ تاپے جائیں۔ سمندر اس لئے نہیں ہوتا کہ اس

سے گھر کے برتن دھوئے جائیں۔ اسی طرح مسلمان اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ غلامی کی زندگی بسر کرے۔ دوسروں کے آگے سر جھکائے، دوسروں کے در پر دریوزہ گر بن جائے۔ خود اس کے پاس کیا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے پاس جائے، اور ان سے اپنے درد کا درماں چاہتا ہے؟

یہی بات ہے، جسے اقبال نے، مجاز کے پردہ میں یوں کہا ہے:

خاکیم و تند سیر مثالِ ستارہ ایم!
در نیلگوں یمے، بہ تلاشِ کنارہ ایم

ہم بندۂ خاکی ہیں لیکن ستارے کی طرح گرم سیر بھی ہیں۔ ہماری خودی ہمیں ہر وقت رواں دواں رکھتی ہے۔ یہ بحرِ نیلگوں (سمندر) جس کا کوئی اور چھور نہیں، ہم اس کا کنارہ تلاش کرتے نکلے ہیں۔ ہماری خودی اگر زندہ ہے، ہمارا جذبۂ کار اگر باقی ہے۔ ہمتِ مردانہ سے اگر ہم محروم نہیں ہوئے ہیں تو اس ناممکن کو ممکن کر دکھائیں گے۔

بود و نبودِ ماست زیک شعلۂ حیات
از لذتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم

ہماری ہست و بود، ایک صلۂ حیات کی رہینِ منت ہے، صرف اسی ایک شعلہ سے وابستہ ہے، لیکن شرر کی طرح چنگاری کے مانند ہمیں پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے جو تم دیکھ رہے ہو یہ ہماری انفرادیت کا جذبہ ہے۔ یہ ہماری خودی ہے جس نے ہمیں شعلہ سے ہٹا کر شرر بننے اور شرر کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

یا نوریاں بگو کہ زعقل بلند است!
یا خاکیاں بدوش ثریا سوارہ ایم!

فرشتوں سے کہہ دو کہ عقل بلند است کی کرشمہ سازی سے ہم خاکی دوشِ ثریا پر سوار ہیں —— یہ فرشتے صرف تسبیح و تحلیل کرتے ہیں۔ ذکر و شغل ہی ان کا مشغلہ ہے۔ لیکن ہمیں خدا نے وہ قوت عطا کی ہے کہ یہ ساری کائنات ہم نے مسخر کر لی ہے۔ یہ بحر و بر، یہ شجر و حجر، یہ نور و نار، یہ کوہ و دامن، سب کچھ ہمارے قبضہ میں ہے۔ ہمارے تصرف میں ہے۔

وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا

جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ ہمارا ہے۔ ہمارے لئے ہے۔ ہمارے قبضہ اور تصرف میں ہے۔

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح
در کارِ زندگی صفتِ سنگ خارہ ایم

ہم مسلمان، حق و صداقت کے معاملہ میں، غنچے کی طرح نرم و نازک ہیں، غنچۂ نازک کی طرح، جو بادِ صبح کے جھونکوں سے لرزنے اور کانپنے لگتا ہے، لیکن کارزارِ حیات میں .... سعی و کوشش کے راستہ میں۔ ہم سنگِ خارا کی طرح سخت ہیں جسے توڑا نہیں جا سکتا، جس میں لچک نہیں پیدا کی جا سکتی۔

نکلتا ہوا سورج

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی!
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

(۶۴)

تپشِ زندگانی

عرب ہو یا عجم، اسلام سب کے لئے ہے، اسلام کی نعمت عام ہے۔ عرب میں بھی مسلمان بستے ہیں اور عجم میں بھی مسلمان آباد ہیں، لیکن نہ عرب کے مسلمان اسلام کی روح سے واقف ہیں نہ عجم کے مسلمانوں میں اسلام کی تڑپ ہے، دونوں اسلام کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں، دونوں کے نام مسلمان ہیں۔ لیکن اسلام سے اس کی روح سے۔ اس کے فلسفۂ حیات سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔

اقبال کی تمنا ہے کہ مسلمان بھولا ہوا سبق پھر سے یاد کرلیں۔ اپنی وہ خصوصیتیں پھر بحال کرلیں، جنھوں نے اقوامِ عالم کی صف میں انہیں ممتاز اور سربلند کردیا تھا۔ لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہیں ہوتی، ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ آخر وہ خدائے کارساز سے دعا کرتے ہیں۔

عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا!
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا!

اے خدا!

میرے سرشکِ خون سے، عرب کی لالہ زار میں زار کر دے۔
میرے دیدۂ تر سے جو آنسو ٹپکتے ہیں ان سے چمنِ عجم کی آبیاری کر، اور ایک مرتبہ پھر عرب و عجم کو وہ نعمت عطا کر وہ جو ان سے چھن چکی ہے، جس سے وہ محروم ہو چکے ہیں۔

تپش است زندگانی، تپش است جاودانی!
ہمہ ذرّہ ہائے قائم۔ دلِ بے قرار بادا

اے خدا!

میں جانتا ہوں، اور تو ہی ہے جس نے یہ راز مجھ پر آشکار کیا ہے کہ زندگی کی اصل حقیقت تپش اور صرف تپش ہے۔ ہر چیز فنا ہو جائے گی، مٹ جائے گی۔ باقی رہنے والی، ابدی اور جاودانی چیز بس یہی ہے۔ لہٰذا، میری آرزو ہے کہ میری خاک کے ہر ذرّہ کو، دلِ بے قرار بنا دے، تاکہ وہ تپش کی نعمت سے ہمکنار ہو جائے۔

نہ بہ جادۂ قرارش نہ بہ منزلے مقامش
دلِ من مسافرِ من کہ خدائش یار بادا

یہ میرا دل ــــ اسے نہ کسی جادہ پر قرار آ سکتا ہے نہ کسی منزل پر پہنچ کر یہ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ قیام ہو یا قرار یہ دونوں چیزیں طلب و جستجو کو ختم کر دیتی ہیں۔ ذوقِ تپش پھر قائم نہیں رہتا اور، ایسی زندگی کا دوسرا نام موت ہی ہے۔ لہٰذا میرے دلِ مسافر کی، تو ہی حفاظت کر۔

اے خدا!

میرا دل، میرا مسافر ہے تو اس کی حفاظت کر، اس کا ساتھ دے۔
اسے قرار عطا فرما، اسے تپش اور خلش کی نعمت سے ہمیشہ بہرہ ور رکھ۔

حذر از خرد بند و ہمہ نقش نامرادی!
دلِ ما برد بہ سازے کہ گسستہ تار بادا

یہ عقل — اس سے حذر واجب ہے۔ اس سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے، نامرادی اور ناکامی کا ہر نقش جو قائم ہوتا ہے اسی کی نام نہاد دور اندیشی اور چالاکی سے۔

میں تو اپنے دل کا دیوانہ ہوں۔ میرا دل، عقل سے، چالاکی سے، ہوش مندی سے مجھے دور رکھتا ہے۔ ان چیزوں کو میرے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔ وہ مجھے اس سازِ بے خودی کی طرف لے جاتا ہے جو ٹوٹا ہوا ہے اور جس کی شکستگی ہی اس کی اصل قیمت ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

میں اسی کو پسند کرتا ہوں، مجھے یہ شکستگی ہی مرغوب ہے۔

تو جوان خام سوزے سخنم تمام سوزے
غزلے کہ می سرایم، بہ تو سازگار بادا

اے ملت کے نوجوان!
اے ملتِ اسلامیہ کے نونہال سربلند،

تو ابھی خام سوز ہے، لالہ، دانش و بینش کامل ہو لیکن ابھی تجھ میں پختگی نہیں آئی۔ ابھی ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ لڑکھڑا سکتا ہے، گر سکتا ہے۔ مبتلائے فریب ہو سکتا ہے۔ اسیرِ دام ہو سکتا ہے۔ تیری عقل میں اتنی رسائی نہیں کہ میرے سخن سوز آفریں کو سمجھ سکے۔ اسے گرہ میں باندھ سکے اس کے مفہوم اور معنی کو اپنے دل پر نقش کر سکے۔

تیرے لئے میں دعا کرتا ہوں کہ یہ نغمہ جو میں گا رہا ہوں جو میری روح کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے۔ نہیں، جو میری روح ہے، میری زندگی ہے۔ میری زندگی کا حاصل ہے تجھے راس آئے، تو اسے سمجھ لے، تو اس پر عمل کرے تو اس کی معنویت، واقعیت اور حقیقت کو جان لے۔

چو بجان من درآئی دگر آرزو نہ بینی
مگر این کہ شبنم تو یم بے کنار بادا

میرے بچے!
میری قوم کے فرزند
اگر نگاہِ غور سے تو مجھے دیکھے گا، میرے پیام اور کلام کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، تو صرف ایک ہی آرزو میرے سینہ میں پائے گا۔ اور وہ آرزو یہ ہے کہ تو شبنم ہے۔ بحرِ بے پایاں ہو جا تو محدود ہے، لامحدود بن جا تو قطرہ ہے۔ سمندر کی وسعت اختیار کرلے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب تو اپنی حقیقت کو پہچان لے۔ رازِ خودی سے واقف ہو جائے۔ اسرارِ بے خودی تیری سمجھ میں آجائیں۔ جب تک تو اپنے آپ سے، اپنی خودی سے۔ اپنے

وجود سے واقف نہیں ہوتا۔ تو شبنم بے مایہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔
اس وقت تک تو صرف قطرۂ ناچیز ہی رہے گا۔

نہ شود نصیب جانت کہ دمے قرار گیرد
تب و تابِ زندگانی بہ تو آشکار بادا

میں خدا سے دعا کرتا ہوں اے ___ کہ تجھے کبھی قرار و سکون میسر نہ آئے۔
ایک لمحہ کے لئے بھی قرار تیرے قریب نہ پھٹکنے پائے۔ تب و تابِ زندگی کا
راز تجھ پر منکشف ہو جائے اور تو ساری زندگی۔ اس تب و تاب میں گزار دے
کہ یہی سر بلندی ہے۔ یہی رفعت ہے۔ یہی حاصل حیات ہے۔

نورِ توحید کا اتمام

چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو ضرورت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

●

(۶۵)

لعلِ گراں

اقبال نے زندگی بھر خودی کی تعلیم دی۔ اس لئے کہ وہ خود بھی خودی کا پیکر تھے، خودنگر تھے۔ خودشناس تھے۔ وہ اہلیت اور استعداد سے واقف تھے۔ اپنی قوم کی گریز پائی۔ اور تغافل کیشی کے محرمِ اسرار تھے۔ ان کے سینہ میں آگ دہکتی تھی وہ چاہتے تھے یہ آگ قوم کے سینہ میں منتقل کردیں، لیکن کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے سر میں، قوم و ملت کی سربلندی اور سرفرازی کا سودا تھا۔ لیکن قوم اپنے ادبار وانحطاط سے خوش تھی۔ ان کا دل عزم و حوصلہ، جوش و ولولہ اور ثبات و استقامت سے معمور تھا، لیکن قوم اس جوہر سے محروم تھی۔ وہ چاہتے تھے۔ ماضی کو حال بنادیں لیکن قوم کے حال اور اس کے ماضی میں، بعد المشرقین پیدا ہوگیا تھا۔ ان کی تمنا تھی، اس قوم میں پھر سلمان و بوذر پیدا ہوں۔ خالد و جراح منظر عام پر آئیں۔ لیکن قوم وقت کے میر جعفر اور میر صادق پیدا کررہی تھی، ان کی آرزو تھی مسلمان، پھر وہ مسلمان بن جائے جس نے عرب کے تنگنائے سے نکل کر، دنیا میں تلاطم برپا

کردیا تھا، کہ مسلمان سرمستِ غفلت تھا، ان کی زندگی کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا، کہ مسلمان اس نظام حیات کو پھر اپنالیں جسے ایک مرتبہ اپنا کر وہ بحر و بر کے مالک بن گئے تھے لیکن مسلمانوں کو اپنے دوسرے اہم، مصروفیات کے باعث اس معمولی سے مقصد پر توجہ کرنے کی فرصت تک نہیں ملتی تھی۔ اقبالؔ اس چیز کو محسوس کرتے تھے، اپنا جوش اور قوم کی سرد مہری دیکھتے تھے اور ایک آہِ سرد کے ساتھ کہہ اٹھتے تھے۔

آں زمینے کہ برد گریۂ خونیں زدہ ام
اشکِ من در جگرش لعلِ گراں خواہد بود!

واحسرتا کہ اقبالؔ کی زندگی میں، اس کے گریۂ خونیں سے لعلِ گراں نہ پیدا ہو سکا۔ وہ دیکھتا تھا، اور کڑھتا تھا کہ لوگ اس کے کلام کو، کلام کے مغز و معنی کو، دعوت اور پیام کو، روح اور مقصد کو نہیں سمجھتے۔ یہ بات نہیں کہ سمجھ نہ سکتے ہوں، بات صرف یہ تھی کہ سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اسے بھی وہ دوسرے شاعروں کی طرح سمجھتے تھے، حالانکہ وہ سب کچھ تھا مگر "شاعر" نہیں تھا۔ اس سے بڑھ کر اس پر تہمت نہیں ہو سکتی کہ اسے "شاعر" سمجھا جائے۔ وہ شاعر کہاں تھا؟ وہ حکیم تھا، وہ مفکر تھا، وہ شعلہ نوا واعظ تھا۔ وہ آتش مقال ناصح تھا وہ رمز آشنائے روم و تبریز تھا، وہ ملتِ اسلامیہ کے عروج و ارتقا کا نقیب تھا، اسے شاعروں کے اس گروہ سے کیا تعلق جو داستانِ ہجر و وصل بیان کرتا ہے؟ جو رندی اور ہوسناکی کے افسانے سناتا ہے۔ جو حسن جالستاں اور جمالِ ترکانہ کے آگے سربسجود ہوتا ہے جو غمزۂ خونیں،

اور عشوۂ جاں سوز کے قصیدے پڑھتا ہے، جو ادائے دل بری، اور
اندازِ معشوقانہ کے گیت گاتا ہے۔ ان لغویتوں کے لئے اس کے پاس
وقت نہ تھا۔ نہ دماغ،

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

اقبال، ان ترقی پسند، تمام نام نہاد ترقی پسند، درحقیقت جاہل
اور کم مایہ شعراء میں بھی نہیں تھا، جو اپنی داستانِ ہوس کو انتقامِ فرنگ
قرار دے کر، سرخ رُو بننے کی کوشش کرتے ہیں، جو ردیف و قافیہ کو رد
دناں کو ٹھکراتے ہیں۔ لیکن اس کا سبب اجتہاد نہیں جہالت ہے،
جو غیر زبانوں کے شاعروں کی چیزیں، بے سلیقگی اور بھونڈے پن سے
چراتے ہیں۔ جو مزدور کا نوحہ پڑھتے ہیں، لیکن اپنے دفتر کے چپراسی، اور گھر
کے ملازم سے آمرانہ اور فرعونی سلوک کرتے ہیں، جو عورت کی مظلومی،
طوائف کی بے بسی۔ فاحشہ کی بلندیٔ فطرت کے ترانے گاتے ہیں لیکن
عورت پر ظلم بھی کرتے ہیں، طوائف سے کھیلتے بھی ہیں۔ فاحشہ سے
بھی جی بہلاتے ہیں، بھلا ان پستیوں میں اقبال کا گزر کہاں ہو سکتا تھا؟
وہ دوسری دنیا کا آدمی تھا، ان عاصیوں میں وہ برگزیدہ اور فرشتوں میں وہ
انسان تھا، اونچا، برتر اور بہتر انسان!

ہمرہانِ راہ، رفیقانِ کارواں، اور بندگانِ مکر و زور کا بے رنگ
رنگ دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا، اور بے ساختہ کہہ اٹھتا تھا۔
بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا تھا۔

نقدِ شاعر در خورِ بازار نیست!!
تا بہ سیم نسترن نتواں خرید!

ہاں، یہ سچ تھا۔ واقعی، نقدِ شاعر، در خورِ بازار نہ تھا، لیکن لوگ اس کی زندگی میں نسترن کی "چاندنی" سے روٹی خریدنے کی کوشش کرتے رہے۔

زبورِ عجم اقبالؔ کی ایک معرکہ آرا کتاب ہے، اقبالؔ کو اس کتاب پر فخر تھا، کہتے ہیں۔

اگر ہے ذوق تو فرصت میں پڑھ زبورِ عجم
نوائے نیم شبی بے نوائے راز نہیں

اور واقعی یہ کتاب اسرارِ حیات، اور رموزِ زندگی سے معمور ہے، شروع ہی میں فرماتے ہیں۔

ز بردنِ در گزشتم ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

یعنی میں نے کائنات کے اندر بھی جو کچھ دیکھا تھا اور باہر کے مظاہر پر بھی نظر ڈالی، ان حقائق کو جو دیکھ لیتے تھے، وہ بھی تابِ تکلم سے محروم تھے۔ لب کشائی کرتے ہوئے جھجکتے اور ہچکچاتے تھے۔ محرمِ اسرار ہونے کے باوجود، راز کی بات زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ لیکن میں نے ہر راز بے نقاب کر دیا۔ میں نے اسرار و رموز پر سے پردہ اٹھا دیا۔ قلندرانہ شان سے وہ باتیں کہہ دیں، جن کو زبان پر لانے کی

کوئی ہمت نہ کر سکا تھا۔ کون ہے جو ان باتوں کو سُنے؟ سمجھے؟ اور ان پر غور کرے؟ میں نے اپنی پونجی قوم کو دے دی جو کچھ میرے پاس تھا۔ قوم کے حوالے کر دیا۔ اب یہ قوم کا فرض ہے کہ میری باتوں سے، میرے پیام سے، میری دعوت سے، اپنے مستقبل کی، اپنی قسمت کی۔ اپنی حیاتِ نَو کی تعمیر کرے۔ اگر اب بھی وہ مست مے غفلت رہتی ہے۔ ہوش میں نہیں آتی۔ آمادۂ عمل بھی نہیں ہوتی۔ عزم و استقامت کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ اپنی چھپی ہوئی صلاحیت اور استعداد کو بروئے کار نہیں لاتی۔ ماضی کے نقوش تازہ نہیں کرتی۔ اپنے ماضی اور حال میں رشتہ قائم نہیں کرتی۔ اور اس رشتہ پر اپنے مستقبل کی تعمیر نہیں کرتی تو پھر، اس کی ذمہ داری، اس کی محرومی اور خودکشی کی ذمہ داری اس پر ہے۔ مجھ پر نہیں۔ کیونکہ میں تو اپنا فرض ادا کر چکا۔

ایک دوسرے موقع پر اپنے حالِ دروں کا نقشہ کیسے پر سوز اور اثر انگیز الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

درونِ سینۂ ما سوزِ آرزو ز کجاست؟
سبو زماست ولے بادہ در سبو ز کجاست؟

میرے سینہ میں یہ سوزِ آرزو کہاں سے آیا؟ یہ سوز کس نے پیدا کیا؟ کیوں پیدا کیا؟ اس کا آغاز کیا ہے؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟

گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ما کفِ خاکیم
بہ ذرّہ ذرّۂ ما دردِ جستجو ز کجاست

میری نگاہ کہکشاں کے دامان وگریباں تک پہنچی ہوئی ہے۔ میں اس خاکِ بدامانِ عالم کا رہنے والا، لیکن میری رسائی عالمِ بالا تک کیسے ہوگئی۔ میرا خاکی جسم زمین پر، میری رُوح، عالمِ بالا پر، آخر پست و بلند میں یہ ربط کیسے پیدا ہوگیا۔ بلند سے ملنے کے لئے۔ اس سے واصل ہونے کے لئے اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے خاکِ ناتواں میں یہ شور انگیز جذبہ۔ یہ شور ہائے ہو، کیسے پیدا ہوا؟ کس نے پیدا کیا؟ یہ جذبہ کس طرح نمودار ہوا؟ کس طرح پروان چڑھا، کیونکر اسے فروغ عطا ہوا؟

اقبالؔ اس بات پر بہت کڑھتے ہیں کہ وہ تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر، قوم کا حالِ زار دیکھ کر آہ و فغاں کرتے ہیں، نالہ و دماغ میں مصروف رہتے ہیں، لیکن لوگ، جو اپنے ذوقِ سلیم کے مدعی ہیں انہیں شاعر قرار دیتے ہیں، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہو سکتا ہے؟

جز نالہ نمی دانم گویند غزل خوانم!
ایں چیست کہ چوں شبنم بر سینۂ من

مجھے آہ و نالہ کے سوا کچھ نہیں آتا، اور لوگ، میری آہ کو غزل سرائی اور نالہ کو نغمہ طرازی سمجھتے ہیں۔

اگر واقعی یہی بات ہے کہ میں نالہ سنج نہیں غزل سرا ہوں، تو پھر آسانی سے شبنم کی طرح میرے سینہ پر انوار و تجلیات کی، بارش کیوں ہوتی رہتی ہے؟ میرے کلام میں "سخن با زناں" (غزل) کیوں نہیں ہے۔ سوز و ساز کیوں ہے؟ آہ و نالہ کیوں ہے؟ شیون، اور فغاں کیوں ہے؟

اور پھر اپنے خدا سے کہتے ہیں :

بہ ضمیرم آں چناں کن کہ ز شعلۂ نوائے
دل خاکیاں فروزم، دلِ نوریاں گدازم

خدایا! میرے دل کو ایسا بنا دے کہ میری شعلۂ نوا سے، خاکیوں (انسانوں) کے دل روشن ہو جائیں اور نوریوں (فرشتوں) کے دلوں میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

---

(۶۶)

شوخئ افکار

زبورِ عجم میں، ایک مقام پر اقبالؔ نے اپنے لئے خدائے قادر و توانا سے دعا مانگی ہے اور وہی کچھ مانگا ہے، جو اقبالؔ جیسے دل و دماغ کا شخص مانگ سکتا ہے۔ اس دعا میں سوز بھی ہے اور ساز بھی، تاثر بھی اور گداز بھی۔ خیال کی بلندی بھی۔ اور نگاہ کی وسعت بھی، دعا کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے،

این بندہ را کہ با نفسِ دیگراں نزیست
یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ!

اے خدا!

تیرا یہ بندہ — اقبالؔ — اپنے مزاج و طبیعت اور خیال و نظر کی انفرادیت کے باعث عام لوگوں کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ وہ کسی اور طرح سوچتے ہیں۔ ان کا اندازِ فکر کچھ اور ہے۔ وہ کسی اور طرح دیکھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر دوسرا ہے۔ اس کی تمنا یہ ہے کہ اسے وہ آہِ خانہ زاد مرحمت

فرما، جو سحر کی طرح روشن اور پاکیزہ ہو اور جس میں وہ طاقت ہو کہ ربع
مسکوں کو اپنے جوش اثر سے ہلا دے۔

سیلم مرا بہ جوئے تنک مایہ میچ!
جولاں گہے بہ وادی و کوہ و کمر بدہ!

میرے سیلِ رواں کو، جوئے تنک مایہ سے نہ الجھنے دے۔ اس
طرح میرے ولولے اور حوصلے پست ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کی روانی
کے لئے وادی و کوہ کی وسعت عطا فرما۔

سازی اگر حریف یم بے کراں مرا!
با اضطرابِ موج، سکونِ گہر بدہ

اگر تو یہ چاہتا ہے کہ مجھے بحرِ بے پایاں کا حریف بنا دے، مجھ میں
وہ وسعت، وہ روانی اور وہ کیفیت پیدا ہو جائے، جس کے سامنے
سمندر بھی شرمائے تو پھر اے میرے خدا، اضطرابِ موج کے ساتھ،
مجھے سکونِ گہر بھی عطا کر۔ سمندر کا تلاطم بھی دے اور سمندر کی تہ میں جو
سکون ہوتا ہے۔ جہاں قطرۂ ناچیز، گوہرِ تابندہ بن جاتا ہے۔ وہ سکون
بھی مرحمت فرما۔

اپنی اس انفرادیت کو، بار بار، مختلف طریقوں اور پہلوؤں سے
اقبالؔ بیان کرتے ہیں۔ ہر انداز میں ایک لطف ہے۔ ہر بات میں ایک
بات ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

نوائے من از آں پر سوز و بیباک و غم انگیز است

بخاشاکم شرر افتاد و بادِ صبح دم تیز است

بادِ صبح دم، یعنی فیضِ عشق نے میری خاشاک میں شرار پیدا کر دیا ہے۔ سوزِ آرزو پیدا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری نوا، پرسوز بھی ہے بیباک بھی، اور غم انگیز بھی۔

بہ پیستاں جلوہ دادم آتشِ داغِ جدائی را
نسیمش تیز تر می سازد و شبنم غلط ریز دست

میں نے اہلِ چمن میں داغِ جدائی کا احساس پیدا کیا ہے کہ تم اپنے مقصد سے، اپنی نیابت سے، اپنی غایت سے جدا ہو۔ بادِ نسیم اس آگ پر عشق پر تیل کا کام کرتی ہے۔ لیکن شبنم، یعنی فکرِ غلط اندیش اس کے لئے پانی بن جاتی ہے۔ اسے بجھا دیتی ہے۔

اشارت ہائے پنہاں خانماں برہم زند لیکن!
مرا آں غمزہ می باید کہ بیباک است خوں ریز دست

جانتا ہوں، محبوب کا اشارۂ پنہاں، برہم کن ہوش و ہواس، بلکہ خانماں برباد تک ہو جاتا ہے، میں اس اشارۂ پنہاں سے لطف ہی لیتا ہوں۔ لیکن میری تشنگی اس سے دُور نہیں ہوتی۔ مجھے تو وہ چاہیئے جو بیباک ہونے کے ساتھ ساتھ خوں ریز بھی ہو۔

پھر فرماتے ہیں، اور کتنے حسین دل فریب انداز میں فرماتے ہیں۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی!
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

لوگو ــــــ مجھے دیکھو، ہندوستان میں کوئی دوسرا مجھ سا نہیں پاؤ گے۔ میں برہمن زادہ ہوں، میرے ماں باپ نہ عرب سے آئے تھے۔ نہ فارس سے، میں یہیں کا رہنے والا ہوں۔ ایک بت پرست خاندان کا چشم وچراغ۔

آبا مرے لاتی ومناتی۔

لیکن، یہ عشق ہی کا فیضان تو ہے۔ جس نے مجھے روم وتبریز کا رمز آشنا بنا دیا ہے۔ ورنہ کہاں میں، کہاں روم کی دنیائے حقائق، کہاں میں، کہاں تبریز کے معارف؛ یہی عشق ہے کہ جس نے مجھے، آہ ونالہ پر مجبور کر دیا ہے۔ مصروفِ فغاں کر رکھا ہے۔

غزلے زدم کہ شاید بہ نوا قرار آید
تپ شعلہ کم نہ گردد ز گسستنِ شرارہ

میں غزل سرائی کرتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید اس طرح، دل کا سوز اور روح کی تپش کچھ کم ہو جائے۔ لیکن یہ میری غلط بینی ہے۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کہ دو چار چنگاریوں کے جھڑ جانے سے شعلہ کی تب وتاب گرمی اور تپش کم ہو جائے؟

دلِ زندہ کہ دادی بہ حجاب در نہ سازد
نگہے بدہ کہ بیند شررے بہ سنگِ خارا

اے خدا تو نے مجھے وہ دل مرحمت فرمایا ہے، جو پابندِ حجاب نہیں رہ سکتا۔ حجاب کے پردے اٹھا دینا چاہتا ہے۔ مجھے وہ نگاہ مرحمت فرما، جو سنگِ خارا کا سینہ، اس کی تپش، اس کے شرر اور اس کی خلش کا نظارہ کر سکے۔

بہ کشد سفینہ کس بہ سپے بلند موجے!
خطرے کہ عشق بیند بہ سلامت کنارہ

پرشور، متلاطم، اور طوفانی سمندر سے، ہلتی ڈولتی، کشتی بھی وہ خطرہ محسوس نہیں کر سکتی جو عشق کو، ساحل کی آسودگی میں نظر آتا ہے۔ آسودگی ساحل مرگ آفریں ہے اور سمندر کا تلاطم، خروش اور تموج حیات آفریں مجھے زندگی چاہیئے، موت نہیں۔

بہ شکوہ بے نیازی زخدا نگاہ گزشتم
صفت مہ تمامے کہ گزشت بر ستارہ

اور یہی وجہ ہے کہ خداوندانِ دنیا کو، میں خاطر میں نہیں لاتا۔ شکوۂ بے نیازی کے ساتھ ان پر حقارت کی نظر ڈالتا گذر جاتا ہوں۔ جس طرح چاند، ستاروں کو خاطر میں نہیں لاتا، ان سے بے نیاز اور بے پروا رہتا ہے۔ ان کے پاس صرف سیم و زر ہے۔ میرے پاس خیالات کے موتی ہیں۔ نگاہ کے جواہر ہیں۔ عشق کا داغ، یعنی لعل گراں ہے۔ میں ان سلاطین و ملوک کو کیا خیال میں لا سکتا ہوں۔ یہ تو خزف ریزے ہیں۔

لیکن ملوک و سلاطین سے اس بے نیازی اور انفرادیت کی اس شان و رفعت کے باوجود ایک مصیبت کی طرف، ایک دوسری غزل میں اشارہ کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

تا بِ گفتار اگر ہست شناسائے نیست
وائے آں بندہ کہ در سینۂ او رازے ہست

خدا نے مجھے طاقتِ گفتار تو عطا فرما دی ہے، جو کچھ محسوس کرتا ہوں۔ جو کچھ دیکھتا ہوں جو کچھ پاتا ہوں، اسے بیان تو کر سکتا ہوں لیکن وہ لوگ کہاں سے لاؤں، جو میرے احساس کو محسوس کر سکیں، جو میرے نظارہ کا نظارہ کر سکیں، جو اپنے دامن میں وہ لے سکیں۔ جو میرے پاس ہے؟ اس شخص سے بھی زیادہ بدقسمت اور پر حسرت کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ جو اپنے سینہ میں رازِ عشق پوشیدہ رکھتا ہو۔ لیکن وہ شناسا اور دوست نہ رکھتا ہو جو اس کے محرمِ راز بن سکیں جو اس کی کیفیتِ بیتابی کو محسوس کر سکیں۔ کیا یہ بدقسمتی کی انتہا نہیں ہے؟

مردہ خاکیم و سزاوار دلِ زندہ شدیم
ایں دلِ زندہ ما کارِ خدا سازے ہست

میری حیثیت اور بساط کیا ہے؟ ایک مشتِ خاک اور خاک بھی کیسی خاکِ مردہ، لیکن اس کے باوجود اس ہیچ میرزی اور کم مائگی کے باوجود، عزت یہ بخشی گئی ہے کہ دلِ زندہ کا سزاوار قرار پایا ہوں، دل وہ عطا ہوا ہے، جو زندہ ہے، جو اضطراب و خلش کی لذت آشنا ہے۔ جو درد اور کسک کی لطف فرمائیوں سے واقف ہے، جو جلتا ہے، تڑپتا ہے، مضطرب رہتا ہے، ایک طرف تنِ مردہ۔ دوسری جانب دلِ زندہ، کہاں مشتِ خاک، کہاں دلِ بے قرار، یہ اَن ہونی بات۔ صرف خدائے کارساز کا عطیہ ہے اور بس، ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ نعمتِ جاوید؟

شعلۂ سینۂ من خانہ فروز است دلے
شعلۂ ہست کہ ہم خانہ بر اندازے ہست

اور یہ شعلہ، جو میرے سینہ میں بھڑک رہا ہے، یہ آگ، جو میرے دل میں روشن ہے، یہ طوفان جس نے میری کائنات تہ و بالا کر رکھی ہے۔ یہ عجب طرح کا طوفان ہے۔ ایسا طوفان جس کے پاس تخریب بھی ہے اور تعمیر بھی۔ یہ آگ عجب طرح کی آگ ہے۔ یہ خانہ افروز بھی ہے اور خانہ برانداز بھی۔ گھر میں روشنی بھی پیدا کرتی ہے۔ اور گھر کو اجاڑ بھی دیتی ہے۔ روشنی پیدا کر کے آرزو پیدا کرتی ہے اور یہ آرزو، خانہ برانداز بن کر، خود میرے ہاتھوں میرا گھر ڈھا دیتی ہے۔ مجھے دشت پیمائی اور صحرا نوردی پر مجبور کر دیتی ہے۔

اور پھر جب اپنے عشق کو نمایاں، اپنے عشق کی آگ کو روشن، اپنے طوفان کو تند جولاں اپنی خودی کو درخشاں اور اپنے "انا" کو بے پایاں، محسوس کرتے ہیں تو (ایک دوسری جگہ) کس جوش و خروش کے ساتھ نعرہ لگاتے ہیں۔

این جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است
جلوہ گرو دیدۂ بیدارِ من است

یہ جہانِ رنگ و بو کیا ہے؟ صرف میرے پندار کا صنم خانہ۔ اس کی یہ رونق، اس کی یہ شان۔ اس کی یہ ہوش ربائی، یہ سب چیزیں میرے بنائے ہوئے کھلونے ہیں۔ میرے صنم خانۂ پندار کی زینت، ان کا وجود میرے دم سے قائم ہے۔ میں ہوں تو یہ بھی ہیں۔ میں نہیں تو یہ بھی نہیں۔ سب کچھ میرے دم کا ظہور ہے۔ یہ ساری جلوہ آرائیاں میرے دیدۂ بیدار کی رہینِ منت ہیں۔

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من
چہ زمان و چہ مکاں، شوخیٔ افکارِ من است

یہ ہستی کیا ہے؟
یہ نیستی کیا ہے؟
کچھ نہیں ـــــ میں دیکھوں تو "ہست" ہے۔ میں نہ دیکھوں تو "نیست"!
اس لئے کہ سب کچھ میں ہی ہوں۔ میرا ہی وجود ہے جس نے ان سب کو بنایا ہے۔ میری ہی آنکھ ہے، جس نے ان سب کو جلوہ طرازی بخشی ہے۔ میرا ہی ذہن ہے جس نے یہ دنیا بسائی ہے۔ میری آنکھ سے باہر۔ میرے ذہن سے باہر، میری روح سے باہر کچھ نہیں۔

اور

یہ زماں کیا ہے؟
یہ مکاں کیا ہے؟
یہ بھی کچھ نہیں، ہیچ، لاشئے محض، یہ زمان و مکان بھی اپنا کوئی معبود نہیں رکھتے۔ یہ سب اعتباری اور اتفاقی چیزیں ہیں۔ محض میرے ذہن کی پیداوار۔ میری چشمِ اخلاق کی مخلوق۔ میری شوخیٔ انکار کی نمود ـــــ اس کے سوا کچھ نہیں۔

اسی مضمون کو اور زیادہ دل فریب انداز میں بیان کرتے ہیں۔

ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے اور اا
حلقۂ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است

اور یہ آفاق، یہ جہانِ رنگ و بو، یہ دنیائے حسرت و آرزو، یہ عالمِ کیف و کم، جو نگاہ کے مجلس میں اسیر ہے، کیا ہے؟ ـــــ یا صرف ایک

حلقہ، جو میری گردشِ پیکار کا زائیدہ ہے۔ اور زیادہ وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

از فسوں کاریٔ دل سیر و سکوں غیب و خود
ایں کہ غماز و کشائندۂ اسرار من است

یہ حرکت جو نظر آتی ہے۔ یہ سکون جو نظر آتا ہے، یہ غیب، جسے ہم نہیں دیکھتے، یہ خودی، جو ہمارا مشاہدہ ہے۔ یہ سب کیا ہے ——— ان کی حقیقت بھی صرف "لا" ہے۔ یہ سارا آفاق، یہ ساری دنیا۔ یہ ساری کائنات، محض ایک مفروضہ ہے۔ محض ایک وہم ہے، محض ایک اعتبار ہے، جو ہم نے قائم کرلیا ہے، محض ایک احساس ہے، جو ہماری حس نے پیدا کرلیا ہے۔ ورنہ ان میں سے کسی چیز کا خارج میں وجود نہیں ہے۔ ہے تو صرف میرے ذہن میں

اور شعر تو یہ ہے:

اے من از فیضِ تو پائندہ نشانِ تو کجا است
ایں دو گیتی اثرِ ماست۔ جہانِ تو کجا است

اے خدا، اے ربِ کائنات!

میں تیرا پروردہ ہوں، تیرے فیض نے، مجھے پائندگی بخشی ہے، تو نے ہی مجھے نیست سے ہست کیا ہے، تو نے ہی میرے ذہن کی۔ یہ خلاقی بخشی ہے کہ جو نہیں ہے۔ اسے محسوس کروں، تو یہ سب کچھ، یہ کوہ و دشت، دریا و صحرا، یہ شجر و حجر،

یہ گلِ صد رنگ، یہ شاخِ نشیمن، یہ رعنائی چمن، یہ لوائے بلبل، یہ صدائے ہائے وہو، یہ رنگا رنگی، یہ بوقلمونی میری ہی نگاہِ کرشمہ کار، اور میرے ہی ذہنِ بیدار کی پیداوار ہے —— لیکن تو کہ جس نے مجھے پیدا کیا تیرا نشان کہاں ہے؟ یہ گیتی۔ یہ آفاق، میری نگاہ کا کرشمہ، میرے دل کی تڑپ، میرے ذہن کی زائیدہ ہے، تیرا جہان کیا ہے؟ تیری دنیا کہاں ہے؟

---

(۶۷)

نقش و نگار

اقبالؔ نے اپنی ملت کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس سے لیا کچھ نہیں، اس نے بے مزد صلہ اپنی قوم میں نئی زندگی پیدا کی۔ اسے اکابرِ سلف سے روشناس کرایا۔ جہالت، غیر اسلامی ماحول اور دانشِ مغرب نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو، اسلام سے اسلام کے فلسفہ سے، اسلام کی تعلیمات سے بیگانہ اور نا آشنا کر دیا تھا۔ انہیں دانش ورانِ فرنگ کے نام از بر تھے، لیکن اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں سے یہ ناواقف تھے۔ انہیں یہ معلوم تھا، یورپ نے دنیا کو سائنس، دریافت، تحقیق اور علم کے سلسلہ میں کچھ دیا ہے۔ لیکن انہیں یہ بالکل نہیں معلوم تھا کہ ان کے بزرگوں نے یورپ کے عہدِ حیات میں، جسے بجا طور پر دورِ تاریکی کہا جا سکتا ہے۔ کس طرح، علم کی شمع روشن کی تھی۔ انھوں نے اپنے دشمنوں سے سُن کر یہ یقین کر لیا، کہ مسلمان ابتدا سے انتہا تک، آغاز سے انجام تک شروع سے آج تک کچھ نہ

تھے اور اگر تھے تو متعصب، تنگ دل، فاتح کی حیثیت سے ظالم، عالم کی حیثیت سے مقلّد، واعظ کی حیثیت سے جاہل، رہنما کی حیثیت سے گم کردہ راہ حکمراں کی حیثیت سے ناکام، شاعر کی حیثیت سے لغو گو، ادیب اور انشا طراز کی حیثیت سے لفاظ، طبیب کی حیثیت سے اناڑی اور عطائی مبلغ کی حیثیت سے تنگ دل، تر مزاج، درشت گو، انھوں نے غیروں کے دانش کدوں میں جو کچھ پڑھا تھا، جو کچھ سیکھا تھا، جو کچھ حاصل کیا تھا۔ اس کی روشنی میں اپنے اسلاف کا حال بیان کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ اسلاف کا نام سُن کر ناک بھوں چڑھا لیتے تھے۔ دوسروں کی محفل میں ذکر آنے نہیں دیتے تھے اور اگر کسی طرح آجاتا تھا تو اس سے کترانے کی کوشش کرتے تھے، لیکن انھوں نے اتنی زحمت کبھی نہیں گوارا فرمائی کہ خود اپنی تاریخ کے اوراق کھنگالتے، اس کا مطالعہ کرتے اور اس کی روشنی میں رائے قائم کرتے، انھوں نے اپنے بزرگوں کو بڑا اس وقت مانا۔ جب یورپ نے ان میں سے کسی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا۔ لیکن جسے یورپ کی بارگاہ سے سندِ قبول مل نہ سکی۔ وہ ان کے دل و دماغ کو متأثر نہ کر سکا۔

ان حالات میں اقبال نے اپنی نوائے پریشاں سے اپنے کام۔ اپنے مقصد کا آغاز کیا۔ شروع میں یہ آواز مانوس سی محسوس ہوئی لیکن اس میں زور تھا، قوت تھی، دلائل تھے، پختگی تھی، صحت تھی، توانائی تھی۔ زیادہ

عرصہ تک مزاحمت اور مقاومت نہ کی جا سکی۔ آخر یہ آواز سننی پڑی۔ اس پر توجہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے وزن، زور، اور سچائی کو ماننا پڑا۔ بلا شبہ یہ انقلاب جو اقبالؔ نے پیدا کیا بہت بڑا تھا۔ لیکن اتنا بڑا نہ تھا کہ وہ خود اس سے مطمئن ہو سکے۔ ان کے معیار سے یہ بہت کم تھا۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان کا معیار تھا کہ آج کا مسلمان، پھر وہ مردِ مسلمان اور بندۂ مومن ہو جائے، جسے دنیا کی تاریخ نے عظمت کے ساتھ اپنے اوراقِ سینہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ مقصد کی اس نارسائی کو دیکھ کر وہ سوچنے لگتے ہیں۔ میں کہاں پیدا ہو گیا؟ میں کچھ ہوں، یہ کچھ ہیں۔ جو میں کہتا ہوں۔ وہ ان کے لئے درخورِ التفات نہیں، جو یہ کہتے ہیں وہ میرے نزدیک بے معنی ہے۔ انہی تاثرات کے عالم میں وہ اپنے خدا سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔

بادِ بہار را بگو پے بہ خیال من برد
وادی و دشت را دہد نقش و نگارِ ایں چنیں

اے خدا!

بادِ بہار کو حکم دے کہ وہ مجھے سمجھے اور اپنی روح میں مجھے جذب کر لے تاکہ پھر اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ دنیا کو انہی نقش و نگار سے مزین کر سکے، جو میرے نگار خانۂ آرزو میں ڈھلتے اور بنتے رہتے ہیں۔

زادۂ باغ و راغ را از نفسم طرا دتے
در چمنِ تو زیستم، با گل و خارِ ایں چنیں!

اس دنیا میں جو کوئی بھی ہے۔ خواہ وہ پروردۂ باغ و چمن ہو، یا زائیدہ دشت و صحرا، اپنے خیالات میں نے اس حد تک ضرور پہنچا لیے ہیں۔ میں تیری دنیا میں رہا۔ وہاں میں نے زندگی بسر کی۔ لیکن یہ نہیں کیا کہ خار سے دامن بچایا ہو۔ اور پھول کو گلے لگا یا ہو۔

میری دونوں سے آشنائی تھی

میں نے سب کے ساتھ گزر کیا، سب کو اپنے نفس سے تر و تازہ رکھنے کی کوشش کی، کسی کو آزار نہیں پہنچایا ہے، کسی کے در پے اذیت نہیں ہوا۔ کسی کے زیاں کا خواہاں نہیں ہوا۔ سب کے ساتھ گزر کرتا، اور اپنے نفسِ گرم کی گرمی ان تک پہنچاتا رہا۔

دل بہ کسے نہ یافتہ، با دو جہاں نہ ساختہ

من بہ حضورِ تو رسم روزِ شمار ایں چنیں

میں نے اپنا دل اس دنیا کے دروں میں کسی سے نہیں اٹکایا۔ دو جہان کی ہستی سے ربط و تعلق نہیں پیدا کیا۔ روزِ شمار، یعنی قیامت کے دن تیرے حضور میں پہنچا تو اس طرح کہ سب سے بیگانہ تھا ــــــ تیرے سوا، لو لگی تھی تو تیری، خیال تھا تو تیرا۔

فاختۂ کہن صفیر، نالہ من شنید و گفت

کس نہ سرود، در چمن نغمۂ یار ایں چنیں

اس دنیا میں، جب تک زندہ رہا، ایک ہی کام کرتا رہا۔
یعنی تیرا نغمہ گاتا رہا۔ تیرے نیک اور مقبول بندوں کا نقیب بنا
رہا۔ تیرے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی لوگوں کو تلقین کرتا رہا۔
میرے نالۂ نارسا کو سن کر فاختہ کہن صفیر بھی چلا اٹھی۔
کس نہ سرود در چمن نغمۂ یار ایں چنیں
یعنی کسی نے آج تک، اس چمن میں اسلاف و اکابر کا نغمہ اس لئے
اور اس دھن میں نہیں گایا تھا۔

---

(۶۸)

واردات

اقبالؔ جب اپنے واردات بیان کرتے ہیں، تو ان میں عجیب لطف ہوتا ہے، شکوہ الفاظ بھی اور جلالِ معنی بھی، زبان کی دل کشی بھی، اور مفہوم کی گیرائی بھی، بیان کی حلاوت بھی اور خیال کی رعنائی بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ اقبالؔ فن اور آرٹ کی خاطر شاعری نہیں کرتے۔ نہ عشق و ہوس کی کیفیت —— جو سراسر مصنوعی ہوتی ہے۔ اپنے اوپر طاری کر کے بلاکشانِ محبت میں اپنا نام لکھانا —— چاہتے ہیں۔ وہ تو صرف وہی کہتے ہیں۔ جس کا ان پر القا ہوتا ہے۔ یعنی وارداتِ قلب، یہ واردات اگر کسی کے لئے بالیدگیٔ رُوح کا سبب ہیں تو ٹھیک، اور انقباضِ طبع کا موجب ہیں تو پروا نہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا!
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

زبورِ عجم کی ایک غزل میں، فقر، جو اقبالؔ کی ایک مخصوص اصطلاح ہے،

یعنی جو عبارت ہے مرد مومن اور مرد کامل سے ــــ کی تعریف کرتے ہیں۔
اور بڑے والہانہ انداز میں کہتے ہیں۔

آں فقر کہ بے تیغے صد کشور دل گیرد
از شوکتِ دارا بہ از فرّ فریدوں بہ

وہ فقر، جو تیغ و سناں کا سہارا لئے بغیر دلوں، پر حکومت کرتا ہے۔ دارا کی دارائی اور فرّ فریدوں سے کہیں بہتر ہے، تلوار کے زور سے اگر تاجِ شہریاری پہنا تو کیا پہنا۔ بات تو جب ہے کہ جب تیغ و سناں کی طرف نظر بھی نہ ڈالی جائے اور سر جھکنے لگیں۔ دل پابوسی کے لئے خود بڑھنے لگیں۔

اس طرح کی متعدد کیفیتیں بیان کرنے کے بعد اقبال اپنی جوئے معرفت کی طرف آتے ہیں، اور بڑی خود اعتمادی کے ساتھ کہتے ہیں۔

در جوئے رواں ما بے منّتِ طوفانے
یک موج اگر خیزد، آں موج ز جیحوں بہ

جس طرح فقر، بے منّتِ تیغ و سناں، دلوں پر حکومت کرتا ہے، اسی طرح میرے جوئے رواں، جو معرفت اور حقیقت کا سمندر ہے۔ اس کی ایک معمولی سی موج بھی، تو وہ سارے دریائے جیحوں سے بہتر اور برتر ہے۔ جیحوں کی موج، صرف آس پاس تک پہنچتی ہے لیکن میری جوئے معرفت کی موج وہاں کے شہر، دریا، اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

سیلے کہ تو آوردی، در شہر نمی گنجد

این خامہ براۂ رازے درخلوت باموں بہ

اب اقبالؔ اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں، حقائق و معارف کا یہ سیلِ بے پناہ جو اپنے جلو میں لایا ہے۔ یہ شہر کے تنگنائے میں نہیں سما سکتا۔ اس کے لئے تو وسعتِ صحرا درکار ہے۔ شہروں کی کشادگی، تو صرف ندیوں، نہروں اور نالوں کی متحمل ہو سکتی ہے۔ میرے سیلِ رواں کی تاب نہیں لا سکتی۔ اس کے لئے بے حد نہایت صحرا چاہیئے۔ جس طرح میرے خیالات کی کوئی تھا نہیں، اسی طرح میرے خیالات کا نشیمن بھی ایسا ہونا چاہیئے۔ جس کا کوئی اور چھوڑ نہ ہو۔

چلئے! — اقبالؔ کے ساتھ چلتے رہیئے۔ آپ تھکیں گے نہیں۔ گھبرائیں گے نہیں۔ بددل اور مایوس بھی نہیں ہوں گے۔ اقبالؔ شاعر نہیں مخبرِ طریقت ہے۔ اس کے نقشِ قدم پر چلئے یا اس کے ساتھ ساتھ چلئے۔ یا اس کے پیچھے پیچھے چلئے۔ آپ کی آنکھیں کھلتی جائیں گی، آپ کے اس دل پر انوار و تجلیات کی بارش ہوتی رہے گی۔ آپ نئے نئے مقامات سے گزریں گے، آپ پر نئے نئے احوال طاری ہوں گے۔ آپ کے نہاں خانۂ دل میں، ایسے ایسے تخیلات آئیں گے، جو رفعت میں جبریلِ امین کے ہمسر ہو گے۔ آپ کا ذہن ایسی ایسی حقیقتوں کو محسوس کرے گا، جن کا آپ کو کبھی وہم و گمان بھی نہیں ہوا ہو گا، آپ ایسے ایسے کیفیات سے دوچار ہوں گے، جو آپ کے لئے بھی عجیب ہوں گے اور دل کش بھی۔ آپ کی آنکھیں وہ مناظر دیکھیں گی جن کی آپ اکیلے ہوتے، تنہا ہوتے، تو تاب بھی نہیں لا سکتے تھے۔ آپ کا دل نئے افکار کا آماجگاہ

بن جائے گا۔ آپ کی شوخئ افکار خود آپ کو حیران و ششدر کر دے گی۔ آپ کا جی چاہے گا، یہ راستہ کبھی ختم ہو گا۔ یہ زمین اپنی گردش بھول جائے۔ یہ فلک کج رفتار ساکت ہو جائے اور آپ چلتے رہیں۔ اقبال کے ساتھ ساتھ اقبال کے پیچھے پیچھے۔

وہ دیکھیے شاعر ـــ اقبال ـــ اپنے کنج عزلت سے نکلا۔ آنکھیں خمار آلود ہیں، ماتھے پر غور و فکر کی شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ انداز میں بے پروائی بھی ہے اور استغنا بھی ـــ کچھ آپ کو معلوم بھی ہے، اقبال کہاں جا رہا ہے؟ وہ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہے اور کہہ رہا ہے۔

یا جہانے تازۂ یا امتحانِ تازۂ
می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں
یا چناں کن یا چنیں

یعنی، یا تو ایک نئی دنیا پیدا کر، یا اپنے امتحان کا انداز و اسلوب بدل دے۔ دنیا بھی وہی پرانی ہے۔ امتحان و ابتلا کی کیفیتوں میں بھی کوئی ندرت نہیں۔ وہی حق و باطل کی آویزش، وہی خار و گل کی کشمکش، وہی سیاہی اور سفیدی کی چشمک، وہی تاریکی اور روشنی کی کشاکش،

ان دونوں میں سے ایک چیز بدل دے یا نئی دنیا، یا نیا امتحان۔

فقر بخشی؟ با شکوہ خسرو پرویز بخش
یا عطا فرما خرد، با فطرت روح الامیں
یا چناں کن یا چنیں

اگر تو فقر عطا فرمانا چاہتا ہے تو سبحان اللہ اس سے بڑھ کر نعمت اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن وہ فقر نہیں، جو عبارت ہے۔ فاقہ کشی، زبوں حالی، اور گرسنگی سے، وہ فقر چاہیئے جس کے ساتھ شکوہ پرویزی ہو، جسے دیکھ کر دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ جس کی تاب سلاطین و ملوک نہ لا سکیں، جس میں دبدبہ ہو، طنطنہ ہو، غلبہ ہو، تسلط ہو، کارفرمائی ہو۔

اور اگر وہ فقر نہیں دیتا جو شکوہ پرویز کا حامل ہو، تو پھر وہ خرد عطا فرما، جو فطرت روح الامین سے ساز رکھتی ہو۔ ایک چیز نہیں ملتی، نہ ملے، لیکن دوسری جو چیز ملتی ہے اس میں کچھ شانِ تجمّل تو ہو۔

یا بکش در سینۂ من آرزوے انقلاب

یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یا چناں کن یا چنیں

یہ میرے سینہ میں آرزوؤں کا جو طوفان اٹھ رہا ہے، یا تو اسے ختم کر دے اور یہ نہیں کرتا تو پھر اس زمین و زمان کی نہاد بدل دے، یہ نہیں ہو سکتا کہ زمان و زمان کی نہاد بھی قائم رہے اور میرا سینہ محشرستانِ آرزو بھی بنا رہے، دونوں میں سے ایک رہے گی، ورنہ

یا مرا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

ایسی باتیں اقبال کے سوا کون کہہ سکتا ہے؟ یہ باتیں اسی کو زیب دیتی ہیں۔ وہی کہہ سکتا ہے اُسی پر اچھی لگتی ہیں۔ ہر بات ہر شخص نہیں کہہ سکتا۔ کہنے والا بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے، جیسی بات،

اقبالؔ نے بڑے شوق سے فلسفہ وحکمت کی تکمیل کی تھی، لیکن اتنا کچھ پڑھ لینے اور حاصل کر لینے اور کامل ہو جانے کے باوجود انھوں نے محسوس کیا کہ وہ نہیں ملا جس کی دل کو طلب تھی۔ لہٰذا وہ دانشِ افرنگ اور فلسفۂ مغرب سے متنفر اور بیزار ہو گئے۔ فرماتے ہیں:

حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا
خضرِ من! از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

نہ یہ حکمت میرے کام آئی، نہ یہ فلسفہ میرے درد کا درماں بنا۔ بلکہ الٹے ان چیزوں نے مجھے گراں خیز پر تکلف اور آرام طلب بنا دیا۔ لہٰذا، اے خدا، اس بارِ گراں کو ہٹا لے۔ میں تو وہ ہوں، جو زمین سے آسمان پر، دنیا سے جنت میں، پستی سے بلندی تک پہنچنا چاہتا ہوں، لیکن یہ حکمت میرے پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ یہ فلسفہ میرا عناں گیر ہو جاتا ہے۔

اے بیک دانۂ گندم بہ زمینم انداخت
تو بیک جرعۂ آب آنسوئے افلاک انداز

ابو البشر آدم نے ایک دانۂ گندم کے باعث مجھے آسمان سے زمین کا مکین بنا دیا، تو اپنی شرابِ معرفت کا ایک جرعہ مجھے پلا اور اپنے قرب کی نعمت عطا فرما دے! میں اس پستی سے بلندی تک پہنچنا چاہتا ہوں تو میری دستگیری کر، میری مدد فرما، مجھے اپنا بنا لے۔

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

بسمل کی تڑپ

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا!
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا!
اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا
پھول بے پروا ہیں، تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو!
کارواں بے حس ہے، آوازِ درا ہو یا نہ ہو!

●

(۶۹)

پرواز

"چو حسن از موج ہر بادے کہ می آید زجا رفتم
دلِ من از گمانہا در خروش آمد، یقینے دہ

•

بہ جانم آرزو با بود و نابودِ شرر دارد
شبم را تو کسے از آرزوئے دل نشینے دہ

•

بہ دستم خامہ داری کہ نقشِ خسروی بندد
رقم کش ایں چنینم کردہ لوحِ جبینے دہ

•

ہوا کا ہر جھونکا ایک تنکے کی طرح مجھے ادھر سے ادھر کردیتا ہے۔
یعنی وساوس کی ہر لہر میرے اعتقاد و یقین کی دنیا متزلزل کردیتی ہے۔ دل
ہے کہ ظن و تخمین کی کثرت سے، محشرستان بنا ہوا ہے — اے خدا،

اس دلِ ناتواں کو یقین و ایمان کی قوت سے مستحکم کر دے، تاکہ وساوس کا طوفانِ تند جولاں بھی اسے اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکے۔

اے خدا!

میری زندگی گہوارۂ حسرت و آرزو بنی ہوئی ہے لیکن آرزو کاہے کی؟ ناپائیدار اور نامحکم چیزوں کی، یہ آرزو مجھے پسند نہیں۔ مجھے تو وہ قوی اور محکم آرزو چاہیئے جو میری رات کی تاریکی میں کوکبِ امید بن کر چمکے۔

خدایا!

تو نے میرے ہاتھ میں وہ قلم دیا ہے کہ اس سے جو نقش ابھرتے ہیں وہ خسروی اور شہریاری کے نقوش ہوتے ہیں تو پھر اے خدا، وہ لوحِ جبیں بھی عطا فرما، جس پر یہ نقوش مرتسم کر سکوں۔

مردانِ خدا

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیّاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری
زمانہ لے جسے آفتاب کرتا ہے
انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

۷۰

ہمہ ازاوست

ہمہ افکارِ من از تست چہ در دل چہ بہ لب
گہر از بحر برآری، نہ برآری از تست

من ہماں مشتِ غبارم کہ بجائے نہ رسد
لالہ از تست و نمِ ابرِ بہاری از تست

گلہ ہا داشتم از دل بہ زبانم نہ رسید
مہرِ بے مہری و عیاری و یاری از تست

یہ میرے افکار، خواہ دل کے نشیمن میں روپوش ہوں، یا زبان پر آکر افشاں ہوں ــــ تیری مرضی اور اشارہ کے پابند ہیں۔
اپنے خیالات کے موتی، فکر کے سمندر سے اگر نکال سکتا ہو تو، اور

نہیں نکال سکتا، تو، سب کچھ تیری مرضی اور تیرے اشارے پر منحصر ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

•

میری حیثیت کیا ہے؟ بس ایک مشتِ غبار، اور یہ مشتِ غبار کیا ہوتا ہے؟ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اپنی جگہ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

لیکن میرا سینہ اگر گلِ لالہ کی طرح داغِ محبت کا آئینہ دار ہے۔ اور میرے تنِ بے جان میں اگر عشق و تفکر کی رُوح کارفرما ہے ـــ تو یہ صرف تیرا اور صرف تیرا فیض ہے۔

•

یہ دنیا والے!

میں انہیں جانتا ہوں یہ کیا ہیں یا ان کی مہر و محبت غرض سے خالی نہیں۔ ان کی بے مہری اور بے رحمی، پندار و نخوت کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی عیّاری ہوس اور خودغرضی کا نمونہ ہے، ان کی یاری صرف غرض ہے اور بس۔

لیکن میں یہ کیا کہہ گیا مجھے اور مجھے کیا ساری دنیا کو جو کچھ ملتا ہے وہ تیری ہی طرف سے تو ـــ پھر شکوہ کس لئے اور شکایت کیوں؟ ـــ میں خاموش ہوا جاتا ہوں

(۱۷)

مسافر

ازل تاب و تبِ پیشینۂ من!
ابد از ذوق و شوقِ انتظارم

•

میں راہِ عشق کا رہرو ہوں، نہ منزل کی جستجو نہ گھر کی آرزو ــــــــ کبھی سرِ راہ بیٹھ جاتا ہوں۔
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں
کبھی جہاں گشتی اور بادیہ پیمائی اختیار کر لیتا ہوں۔ آج یہاں، کل وہاں۔ کبھی اس شہر میں، کبھی دوسرے شہر میں۔ یہاں بھی مسافر، وہاں بھی غریب الوطن۔

•

"ہوائے خانہ و منزل نہ دارم
سرِ راہم، غریبِ ہر دیارم!

•

زچشم اشکِ چوں شبنم فرو ریخت
کہ من ہم خاکم و راہِ گزارم!

•

اپنی حیثیت پر غور کرتا ہوں تو آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہو جاتی ہے۔
میری بساط اس کے سوا کیا ہے کہ مشتِ خاک ہوں اور رہگذر میں پڑا ہوں۔ جو چاہے
ٹھوکر لگائے۔ جو چاہے پامال کر دے۔ ذرا سی ہوا چلے، اور میرے اجزائے حیات
منتشر ہو جائیں۔

•

لیکن اتنا کچھ نہ ہونے پر بھی بہت کچھ ہوں۔
ازل میری ہی تب و تاب کا نام ہے اور ابد میرے ہی ذوق و شوقِ انتظار سے

عبارت ہے،

اُمتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں!
اور محرومِ ثمر بھی ہیں خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں کاہیدہ بھی بالیدہ بھی ہیں
سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں
نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

•

(۷۲)

رمزِ عشقِ تو بہ اربابِ ہوس نتواں گفت
سخن از تاب و تبِ شعلہ بخس نتواں گفت

•

تو مرا ذوقِ بیاں دادی و گفتی کہ بگوئے
ہست در سینۂ من آنچہ بکس نتواں گفت

•

از نہاں خانۂ دل خوش غزلے می خیزد!
سرِ شاخے ہمہ گویم، بہ قفس نتواں گفت

•

میرے رب!
تو نے مجھے اپنے عشق سے نوازا ہے، لیکن یہ رازِ اربابِ
ہوس پر میں فاش نہیں کر سکتا، کہیں تنکے سے شعلہ و شرر کی

داستان بھی کہی جا سکتی ہے؟ کیا وہ تاب لا سکتا ہے، اس داستان خانہ براندازکے سُننے کی؟ —— نہیں، ہرگز نہیں!

تو نے مجھے قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے۔ تیرے اس احسان کا شکر کِس زبان سے ادا کروں؟ لیکن میرے مولا، میرے سینہ میں جو طوفان مچل رہا ہے اسے نا اہل لوگوں کے سامنے کیونکر واشگاف کردوں۔

•

دل کے نہاں خانہ سے، خیالاتِ بلند و جمیل کا تانتا لگا ہوا ہے، لیکن، یہ باتیں، شاخِ شجر پر بیٹھ کر کی جا سکتی ہیں، قفس میں نہیں، آزادی ہو تو زبان پر ہر حرفِ راز آ سکتا ہے، غلامی میں تو زباں بندی رہتی ہے۔

چھوٹا سا طور ذرا سا کلیم

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں؟
یہ جانِ بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟
کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا!
پھونکا ہوا ہے کیا تری برقِ نگاہ کا؟

آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا
شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہے کیا
گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذتِ سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے

---

(۲۳)

تغزّل

اقبال کی شاعری، مقصد کی شاعری تھی، اظہارِ مقاصد کا ایک ذریعہ، لیکن جب کبھی غزل سرائی پر آتے ہیں، تو بھی انفرادیت کی پوری شان کے ساتھ، — چند شعر سُن لیجیے۔

یاد آیامے کہ خوردم بادہا با چنگ و نے
جامِ مے در دستِ من مینائے مے در دستِ دے

وہ بھی کیا دن تھے جب، میں اپنے محبوب کے ساتھ بیٹھ کر، چنگ و نے کے ہجوم، بادہ نوشی کرتا تھا، کیفیت یہ ہوتی تھی کہ شراب کا جام میرے ہاتھ میں اور شراب کی بوتل اس کے ہاتھ میں — میں بادہ نوش، وہ ساقی!

در کنار آئی خزانِ ما زند رنگِ بہار
گر نیائی فرودیں افسردہ تر گردد ز دے

تو اگر آغوش میں ہو، تو خزاں بھی بہار ہے اور، تو پاس نہ ہو،

تو پھر بہار بھی خزاں سے بدتر ہے۔

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟
یک چمن گل، یکسانیستاں نالہ یک غمخانہ مے!

میں بزم شوق میں کیا کچھ لے کر آیا ہوں معلوم ہے؟
ایک چمن کے برابر پھول —— ایک جنگل کی بانسریوں کی وسعت کا نالہ وآہ —— ایک پورا میخانہ! کیا اس کے بعد بھی کسی چیز کی ضرورت ہے۔

(۴۷)

نغمہ کجا و من کجا

یوں تو اقبال نے، اپنی شاعری کے مقصد، اور منہاج کو متعدد مواقع پر، اشاریت اور رمزیت کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسے موقع بھی آتے ہیں جب وہ واشگاف اور غیر مبہم الفاظ میں بتاتے ہیں کہ میری شاعری کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کی غرض کیا ہے؟ زبورِ عجم میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

نغمہ کجا و من کجا؛ سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

بھلا مجھے نغمہ سرائی سے کیا سروکار؛ کہاں میں کہاں شوقِ سرود۔
میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

بات یہ ہے کہ میری شاعری ایک بہانہ ہے، ناقۂ بے زمام کے لئے۔ اس طرح اسے میں قطار سے نکلنے نہیں دیتا شریکِ جماعت رکھتا ہوں۔

اونٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ نغمہ سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ راستہ دشوار گزار، مسافت بعید ہو۔ منزل پیچیدہ اور تعب ہو۔ تو ساربان حدی خوانی شروع کر دیتا ہے، تاکہ اس نغمہ سرائی سے متاثر ہو کر وہ گرانی نہ محسوس کرے اور روانی کے ساتھ چلتا رہے۔ عرفی کا شعر ہے:

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

آگے چل کر فرماتے ہیں:

وقتِ برہنہ گفتن دستِ من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ہم نفسانِ خام را؟

وقت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف فاش اور بر ملا کہہ دوں، لیکن

گوشِ سخن شنو کجا دیدۂ اعتبار کو؟

لہٰذا رنگِ محفل دیکھ کر بات کرنی پڑتی ہے، برہنہ گفتاری سے کام نہیں لیتا۔ کنایہ میں باتیں کرتا ہوں، اس لئے کہ جو لوگ میرے مخاطب ہیں۔ وہ پختہ کار نہیں خام کار ہیں۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوائے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن!
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

•

(۷۵)

آشوب

دو عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

•

مخور ناداں غم از تاریکیِ شبہا کہ می آید
کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم

•

ندیم خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم
نہ داری تابِ آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

•

میری بوتل میں جو شراب ہے وہ چشم کشا ہے، جس سے ہر دو عالم کا نظارہ کر لیا جا سکتا ہے۔ ان کی حقیقت اور کمیت و کیفیت معلوم کر لی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ آنکھ

کہاں کہ وہ دیکھ سکے جو میں دیکھ رہا ہوں۔

•

تجھے تاریکیٔ شب سے ڈر کیوں لگ رہا ہے؟ میں تو تیرے ساتھ ہوں اور تیری پیشانی پر جو داغ ہے وہ ستارے کی طرح چمک رہا ہے۔ اس روشنی میں تو بھٹک نہیں سکتا۔ اپنا رستہ دیکھ، اپنی راہ چل۔

•

تو نے مجھے اپنا ندیم اور رفیقِ راہ تو بنا لیا، اور میں بھی بن گیا۔
لیکن مجھے ایک اندیشہ بھی ہے!
وہ یہ کہ میں اپنے اندر جو آشوبِ غوغا نہاں رکھتا ہوں، کیا تو اس کی تاب لا سکے گا
— میں تو تیرا ندیم بن گیا، کیا تو بھی میرا ندیم بن سکے گا؟

اے مسلمان

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

---

(۷۶)

مسلمان

ز سلطاں کنم آرزوئے نگاہے!
مسلمانم از گل نہ سازم الٰہے

•

دلِ بے نیازے کہ در سینہ دارم!
گدارا دہد شیوۂ پادشاہے!

•

بہ آں آب و تابِ کہ فطرت بہ بخشد
درخشم چو ابرے بہ ابرِ سیاہے

•

رہ و رسم فرماں روایاں شناسم
خراں بر سرِ بام و یوسف بہ چاہے

•

مجھے جو کچھ لینا ہے، اپنے رب اور اپنے مولا سے لوں گا۔
میں مسلماں ہوں۔ مٹی کے بت بنا کر نہیں پوجتا۔

•

خدا کا شکر ہے دلِ بے نیاز کا مالک ہے اور یہ وہ چیز ہے جو گدا کو سلطان بنا دیتی ہے۔

•

فطرت (خدا) نے مجھے وہ آب و تاب بخشی ہے کہ گمراہوں کو راستہ دکھاتا ہوں، جیسے ابر تیرہ و تار کے اندر سے بجلی چمکتی، اور بھٹکوں ہوؤں کو راستہ دکھاتی ہے۔

•

وقت کے ملوک و سلاطین کی حقیقت اور حیثیت خوب جانتا ہوں اور ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی گدھے کو بر سرِ بام بٹھا دیا جائے اور یوسف کے نصیب میں چاہِ تاریک آئے۔

موت

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

•

(۷۷)

غبار

"زمیں بہ پشتِ خداوند و بے ستوں دارد!
غبارِ ماست کہ بر دوشِ او گراں بود است!

•

غلط نگر اتی، ما نیز لذتے دارد!
خوشم کہ منزلِ ما دور و راہ خم بہ خم است

•

مرا اگرچہ بہ بت خانہ پرورش دادند
چکید از لبِ من آنچہ در دلِ حرم است

•

یہ زمین! — اتنی مضبوط پیٹھ رکھتی ہے کہ الوند، بے ستون (اور ہمالہ) جیسے پہاڑوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے، لیکن میرا مشتِ غبار اٹھائے ہوئے اس کی کمر ٹوٹتی ہے۔

•

میں غلط خرام ہوں ـــــ غلط رو بھی ہوں، لیکن میں اس کیفیت سے دل برداشتہ نہیں ہوتا لطف اندوز ہوتا ہوں، میری منزل دور ہے اور راستہ پیچ در پیچ جتنی ٹھوکریں کھاؤں گا اتنا ہی سنبھلوں گا ـــــ تو یہ خوشی کا مقام ہے یا افسوس کا؟

•

میں نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ یکسر اور سراسر اسلامی تھا، میں نے مغرب کے دانش کدوں میں عمر گزاری، دانش دانِ فرنگ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا، جو کچھ پایا ان سے پایا، جو کچھ سیکھا ان سے سیکھا، لیکن فطرتِ سلیم نے مجھے راستہ پر ڈال دیا۔ میرے لب پر جو بات آتی ہے وہ اسلام کی ترجمان ہوتی ہے۔

پیام

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دَور
خالی ہے جیبِ گل زرِ کاملِ عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملّت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

•

(۷۸)

مردِ خود آگاہ

"عشق اندازِ تپیدن ز دلِ ما آموخت
شررِ ماست کہ بر جست و بہ پروانہ رسید

دردِ من گیر کہ در میکدہ ما پیدا نیست!
پیرِ مردے کہ مئے تند و جوانے دارد

•

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

•

عشق نے یہ بے قراری کس سے سیکھی ہے؟ میرے دل سے!
یہ میرا شرارِ آرزو ہے، جو پروانہ تک پہنچا ہے اور جس نے پروانہ کو پروانہ بنا دیا ہے،
اور اس میں جل مرنے کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔

•

تو نے بہت سے میکدوں کی خاک چھانی ہوگی، اور خوب خوب قدح نوشی کی ہوگی، جام و سبو کا کیا ذکر مے خانے کے مے خانے خالی کر دیئے ہوں لیکن ذرا میری شراب تند کی تلچھٹ سے اپنے کام و دہن کو لذت آشنا کر، میں بوڑھا ہوں لیکن میری مے تند و جواں کا نمونہ تجھے کہیں اور کسی جگہ نہیں مل سکتا!

•

ایک دن میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا، میرے بعد لوگ میرے کلام کا مطالعہ کریں گے، پڑھیں گے، سر دھنیں گے، اور اس اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ ہاں، یہ شخص شاعر نہیں تھا، یہ ایک مرد خود آگاہ تھا جس نے سارے جہان کو دگرگوں کر کے رکھ دیا، سوزِ آرزو سے آشنا کر دیا۔

•

جامِ زندگی

تا بہ ویرانے کی سودائے محبت کی تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

•

(۷۹)

نور و نار

"من ندانم نور یا نار است اندر سینہ ام
ایں قدر دانم بیاضِ او بہ مہتابے زند

•

در آستانۂ سلطاں کنارہ می گیرم!
نہ کافرم کہ پرستم خدائے بے توفیق!

•

صورت گری را از من بیاموز!
شاید کہ خود را، باز آفرینی

•

مئے جواں کہ بہ پیمانۂ تو می ریزم!
ز را و ستے است کہ جام و سبو گداخت مرا

•

میں نہیں جانتا کہ میرے سینہ میں نور کی تجلی ہے یا نار کی سوزش، اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو کچھ میرے سینہ میں ہے وہ روشن اور تابناک ہے، اور اپنی درخشانی میں ماہِ نیم ماہ سے چشمک زنی کر رہی ہے۔ چاند کی چاندنی اس کے سامنے بے حقیقت ہے!

•

شاہ و سلطان کے در سے مجھے کوئی مطلب نہیں، میں گدائے فاقہ مست نہیں کہ بادشاہوں کی دربارداری کروں، اور امیروں کی ڈیوڑھی پر حاضری دوں، نہ کافر ہوں کہ خدائے بے توفیق یعنی بتوں کی پرستش کروں، جو در حقیقت مجھ سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔

•

یہ نقش و نگار کیا دیکھتا ہے؟ یہ بے رنگ ہیں، ان میں تڑپ نہیں، زندگی نہیں، زندگی کی حرارت نہیں، میرے پاس آ، میں تجھے صورت گری کا فن سکھاؤں، تاکہ تو اپنے آپ کو دیکھنے لگے، اپنے آپ کو پہچان لے، اپنی خودی سے واقف ہو جائے۔

•

تیرے پیمانہ میں، جو شراب (معرفت) میں انڈیل رہا ہوں، یہ شراب انگوری نہیں، یہ اس صراحی کی ہے جس نے میرے جام و سبو کو پگھلا دیا ہے۔ مجھ میں وہ سوز پیدا کر دیا ہے، جس نے مجھے خاکستر کر کے رکھ دیا ہے۔

---

(۸۰)

مری شاعری کیا ہے

"مثلِ شرر، ذرّہ را تن بہ تپیدن دہم!
تن بہ تپیدن دہم، بالِ پریدن دہم

•

سوزِ نوائم نگر، ریزۂ الماس را!
قطرۂ شبنم کنم، جوئے چکیدن دہم!

•

یوسفِ گم گشتہ را باز کشودم نقاب!
تا بہ تنک مائیگاں ذوقِ خریدن دہم!

•

لوگ میری شاعری کا مطلب اور مقصد نہیں جانتے۔ میں بتاتا ہوں، میری شاعری یعنی میرے دل کی آواز ہے جس نے ذرّہ بے مایہ میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دی ہے۔ اور وہ اڑنے لگا ہے۔ ذوقِ نمو اور شوقِ ظہور سے بیتاب ہوا جا رہا ہے۔

اگر تو میری نوا کے سوز سے واقف ہونا چاہتا ہے، تو پارہ سنگ کو دیکھ۔ اپنی نوا کی گرمی سے میں نے اسے قطرۂ شبنم بنا دیا ہے، اس میں لطافت اور لچک پیدا کر دی ہے۔ تو کتنا ہی بے حس ہو، تیرے سینہ میں دل کے بجائے پتھر ہی کیوں نہ ہو، میرے سوزِ نوا سے تو بھی پیکرِ سوز و گداز بن جائے گا۔ تجھ میں بھی تڑپ اور خلش پیدا ہو جائے گی۔

•

میں نے یوسفِ گم گشتہ کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا ہے۔ تیری خودی بے نقاب کر دی ہے، تا کہ تجھ جیسے تنک مایہ لوگوں میں خودی پیدا ہو۔ وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ راستہ کا پیچ و خم انہیں گمراہ نہ کر دے۔

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

•

(۸۱)

اے جوانانِ عجم

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم ، جانِ من و جانِ شما

•

مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پرویں گزشت
ریختم طرحِ حرم ، در کافرستانِ شما

•

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند!
دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما!

•

حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل!
آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما!

•

عجم کے نوجوانو!

تمہارے باغ و چمن میں چراغِ لالہ کی طرح میں سلگ رہا ہوں۔ مجھے پہچانو۔
میری سنو! میں تمہیں وہ باتیں بتا رہا ہوں جو حیات آفریں ہیں، جنھیں سن کر جن پر عمل کر کے تم اپنی زندگی سنوار سکتے ہو۔ زندوں میں شمار ہو سکتے ہو۔ غیر فانی کارنامے انجام دے سکتے ہو۔

•

میں نے مہر و مہ کا نظارہ کیا۔ میں سورج تک پہنچ گیا۔ میں نے چاند تک رسائی حاصل کر لی۔ میں پروین کی بلندی سے دور بہت دور، اونچا، بہت اونچا نکل گیا۔ لیکن میرے عزیزو! میں نے کسی کو شایانِ آرزو نہ دیکھا، کسی میں وہ بات نہیں جو تم میں ہے، تم میری امیدوں کا حاصل ہو، میں جانتا ہوں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اس لئے میں نے سب سے قطع نظر کر کے تمہارے کافرستان میں حرم ڈالی ہے۔
جانتا ہوں یہ تحمل تمہارے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ تم ہی ہو جو مستقبل کے امام ہو۔
جانتا ہوں، تم غلام ہو اور غلامی نے تمہارے حوصلے پست کر رکھے ہیں۔ تم جو کہنا چاہتے ہو نہیں کہہ سکتے، جو کرنا چاہتے ہو نہیں کر سکتے، تم پا بہ زنجیر ہو اور مہر بہ لب ہو۔
لیکن یہ دور ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ تمہاری دیوارِ زنداں میں شگاف پڑ چکا ہے۔ یہ دیوار ٹوٹنے والی ہے۔ گرنے والی ہے۔ وہ مردِ کار جلد نمودار ہوگا۔ جب تمہاری غلامی کی بیڑیاں کٹ جائیں گی۔ تم آزاد ہو جاؤ گے۔ اپنی خودی کی تعمیر میں آزاد ہو گے اپنا مستقبل اپنی لوحِ جبیں پر خود اپنے ہاتھ سے اپنے قلم سے لکھو گے، اپنی زندگی، زندگی کے احوال شب و روز کے تم مالک ہو، جس سانچہ میں چاہو ڈھال لو، جو وضع اختیار کرنا

چاہو کرلو، تم آزاد ہو گے۔ اور آزاد مردوں کی طرح اپنے قول و فعل کی بجاآوری میں کسی کے پابند نہیں ہو گے۔ تمہاری مرضی تمہاری رضا ہو گی۔ تمہارا ضمیر تمہارا قافلہ سالار ہو گا۔ تمہارا حوصلہ تمہارا رفیقِ راہ ہو گا۔ اور تم کامیابی کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ گوہرِ آرزو حاصل کر لو گے۔

اے پیکرانِ آب و گل۔

آؤ میرے گرد اکٹھے ہو جاؤ، اب

میں کوئی بات نہیں کہتا، وہی کہتا ہوں جو بزرگوں سے سنی ہیں۔ اسلاف سے پائی ہیں۔ اکابر سے سیکھی ہیں۔ ان میں تمہارے لئے زندگی کا پیام ہے۔ اس پیام کو نہ ٹھکراؤ۔ اسے سنو اس کی قدر کرو، اسے اپنالو!

بندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

●

(۸۵)

زبورِ عجم

زبورِ عجم اقبالؔ کے افکارِ بلند کا بڑا دل آویز مجموعہ ہے۔ خود اقبالؔ بھی اس کی رفعت اور بلندی کے قائل ہیں۔ اپنے قارئین کو متعدد مواقع پر انھوں نے دعوت دی ہے کہ زبورِ عجم کا مطالعہ کریں۔ میرے پیام کی غرض و غایت تب ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اسی کتاب میں انھوں نے اپنے مقام و منصب اپنی ذات و شخصیت اور اپنے پیام و دعوت کے بارے میں بھی بتایا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ میرے خیال میں زبورِ عجم کے سوا، اقبالؔ کا کوئی اور مجموعہ کلام ایسا نہیں ہے جس میں اس شرح و بسط، اس تفصیل و اعناب اور اس وضاحت کے ساتھ رعنائی و زیبائی، دلکشی اور جمال کی تمام خوبیوں کو سمو کر اپنے کلام سے متعلق اگل افشانی کی ہو۔

اقبالؔ کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ اسلام کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ انھوں نے سارا زورِ کلام اس بات پر صرف کیا ہے کہ مسلمان پھر مسلمان بن جائیں اس لئے کہ انھیں یقین ہے

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا

وہ چاہتے ہیں۔ اس گئی گزری حالت میں بھی اس انحطاط وادبار کے ہوتے ہوئے بھی، اگر اسلام کا نام لے کر، دنیا میں کوئی قوم اٹھ سکتی ہے۔ اور ربع مسکون کو ہلا سکتی ہے۔ تو وہ صرف ملتِ اسلامیہ ہے۔ آج یہ راستہ سے بھٹکی ہوئی ہے، اپنے آپ کو، اپنے ماضی کو، اپنے اسلاف کو فراموش کر چکی ہے۔ لیکن اس میں خصوصیتیں اب بھی وہی ہیں، جو پہلے تھیں۔ اس کی سرشت نہیں بدلی ہے۔ اس کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ صرف خود فراموشی کا عالم طاری ہو گیا ہے اس پر، سو یہ کوئی ایسا مرض نہیں جس کا مداوا نہ ہو سکے، اقبال کا کلام، درحقیقت اسی مرض کا مداوا ہے۔ وہ مردِ مسلمان کو ابھارتے ہیں، اکساتے ہیں، حوصلہ دلاتے ہیں اور اس میں وہ روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کبھی اس کی خصوصیت تھی اور جس نے اسے ثریٰ سے ثریا تک پہنچا دیا تھا۔ آسمان اس کی رفعت اور بلندی کے سامنے جھکتا تھا۔ ستارے اس کی پیشوائی کو بڑھتے تھے۔ چاند اور سورج اس کے جلال اور دبدبہ کے سامنے۔ ایک ذرۂ حقیر معلوم ہوتے تھے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ وہ گزرا ہوا زمانہ پھر واپس آجائے۔ دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ صرف سعی و کوشش اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اقبال اپنی اسلامیت پر شرماتے نہیں، نہ اپنے مسلمان ہونے پر معذرت کرتے ہیں، نہ وہ آفاقی شاعر ہونے کے بجائے، قومی شاعر ہونے پر کسی قسم کی ندامت محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک زندہ قوم کے نقیب ہیں۔ وہ ایک پائندہ پیام کے امین ہیں۔ وہ ایک تابندہ دین کے پرستار ہیں۔ انہیں اپنے مذہب پر، اپنی قوم پر، اپنے ماضی پر فخر ہے۔ اور وہ یہ فخر اپنی قوم کی پود میں منتقل کر دینا چاہتے ہیں۔

اپنی قوم کو بار بار بتاتے ہیں، دیکھ میں کون ہوں، سن میں کیا کہہ رہا ہوں، محسوس کر کس طرف میں تیری توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں۔ میں کیا کر چکا ہوں۔ اور مجھے کیا کرنا ہے۔ وہ اس حقیقت کے چہرے سے بھی نقاب اٹھاتے ہیں کہ یہ جو آج چمن کا ماحول بدلا ہوا ہے۔ فضا میں تبدیلی نظر آ رہی ہے۔ بھٹکا ہوا آہو پھر سوئے حرم رواں دواں ہے۔ اس میں پھر سوزِ آرزو پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا سینہ پھر کشرستانِ تمنا بن گیا ہے۔ اس میں پھر وہی حوصلہ اور ولولہ تڑپنے لگا ہے جس نے کبھی اسے دنیا کی قسمت کا مالک بنا دیا تھا، تو یہ سب میری ہی نوا سنجی کا اثر ہے۔ میں نے ہی اس ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار کھینچا ہے۔ میں نے ہی اس خود فراموش اور فراموش کار کے سامنے یوسفِ گم گشتہ (خودی) کو بے نقاب کیا ہے۔ میں نے ہی اسے بتایا ہے کہ وہ صحرا نشین کیسے جہاں بان، اور جہاں دار تھے۔ کس شان سے انھوں نے تاجِ سردارا چھینا تھا اور کس تحمل سے انھوں نے پہنائے عالم پر اپنا پرچم لہرایا تھا۔ تو ان سب باتوں کو بھول گیا تھا۔ میں نے ہی تجھے بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ تو محوِ عیش ہے۔ میں رات بھر جاگتا ہوں۔ دن بھر کڑھتا ہوں، تو سوتا ہے، میں جاگتا ہوں، تو بھولتا ہے، میں یاد دلاتا ہوں، تو غلط راستہ پر ہو لیتا ہے۔ میں تیرا دامن پکڑ لیتا ہوں۔ اور صراطِ مستقیم کی طرف تیری رہنمائی کرتا ہوں۔ تو اگر کچھ بن سکتا ہے تو میری دعوت قبول کر کے میرے پیام پر عمل کر کے میری بات مان لے ورنہ تو بھٹکا ہوا راہی رہے گا۔ اپنے آبا سے تجھے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ سیارہ تھے تو ٹوٹا ہوا ستارہ ہے۔

چنانچہ ایک موقع پر، وہ اپنے مقام و منصب پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دم مرا صفت باد فرودیں کردند
گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند

یعنی، میرا نفس، اہلِ چمن کے لئے بادِ بہار ہے! ــــ میں جمود اور تعطل کی دعوت نہیں دیتا۔ نمو اور نمود کی دعوت دیتا ہوں، جس سے زندگی کے مرجھائے ہوئے پھول پھر کھلنے لگتے ہیں۔ جس سے خزاں رسیدہ چمن میں پھر سے بہار آجاتی ہے۔ جس سے سوئے ہوئے پھر جاگ جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ نیند کے ماتے ہوشیار ہو جاتے ہیں بلکہ جن پر موت کا سناٹا چھا چکا ہے وہ بھی زندگی کی امنگ سے آشنا ہو جاتے ہیں۔

اور اے میرے مخاطب! اے میری قوم کے گل سرسبد، تو بہر حال انسان ہے۔ دل رکھتا ہے کہ محسوس کرے، کان رکھتا ہے کہ سنے، زبان رکھتا ہے کہ کہے لیکن مجھے تو خدا نے وہ کمال مرحمت فرمایا ہے کہ میں صرف انسانی مخلوق ہی پر نہیں، جامد اور بے جان اور غیر حساس چیزوں پر بھی اثر انداز ہوں ــــ یہ گھاس، یہ گیاہ خودرو کیا ہے؟ کیا اس میں جان ہے، کیا یہ احساس کی دولت سے مالا مال ہے؟ نہیں، یہ تو صرف اس لئے ہے کہ روندی جائے۔ اس کا مقصدِ حیات اس کے سوا کیا ہے کہ ذرا دیر کے لئے زمین کے نہاں خانے سے جھانکے اور پھر جانوروں کے کام آئے۔ وہ اسے چریں، کھائیں، پامال کریں اور اس کے ننھے سے نفقی نمو کو کام و دہن کا لقمہ بنا لیں۔ بس اس سے زیادہ تو سبزۂ خودرو کی کوئی حیثیت نہیں، لیکن میری

طرف دیکھ اور پھر چمن پر ایک نظر ڈال، یہ گل یاسمین جو تجھے نظر آتا ہے کیا ہے؟ یہ گھاس کا ایک تنکا تھا جسے میرے آنسوؤں نے سینچا اور گل یاسمین بنا دیا۔

بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں!
ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند!

میں بلند بال ہوں، میری رفعت کا نظارہ کرنے کے لئے، آنکھ چاہیئے۔ میری بلند پائی کی یہ کیفیت ہے کہ سپہر بریں کی نورانی مخلوق، یعنی فرشتے بھی مجھ پر رشک کرتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا اسیر بن جاؤں۔ وہ مجھے اپنا بنالیں۔ لیکن یہ بات میرے رتبہ سے فروتر ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں خدا کا طالب ہوں، حق سے میں نے لو لگائی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی مخلوق سے خواہ وہ نوری ہی کیوں نہ ہو دل لگاؤں؟
یہ کیونکر ممکن ہے؟

نمودِ لالۂ صحرا نشیں ز خونابم!
چنانچہ بادۂ لالہ بہ ساتگیں کردند

اور یہ لالۂ صحرائی، جو تمہیں نظر آتا ہے، جسے دیکھ کر آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ماہیت کیا ہے؟
جس طرح گھاس میرے آنسوؤں سے سیراب ہو کر گل یاسمین

بن گئی۔ اسی طرح۔ میرے خونِ جگر کی تراوش نے لالۂ صحرا نشین کو سرخ روئی بخشی اور وہ ایسا بن گیا جیسے پیالہ میں شرابِ سرخ رکھی ہوئی ہوا۔ بات یہ ہے کہ وہ گل یاسمین ہو، یا لالۂ صحرا نشیں، یہ سب ہماری ہی نگاہوں کی تجلی ہمارے ہی خیال کا کرشمہ، اور ہمارے ہی ذوقِ حسن کی نمود ہے۔
غالب نے یہی بات ایک دوسرے لیکن نہایت دل آویز اور لطیف پیرایہ میں بیان کی ہے۔

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ہم حسن یعنی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور یہ حسن و جمیل، نظر فریب، اور دل کشا مظاہر ہماری نگاہِ حسن کی مخلوق ہیں۔ خدا نے ہمیں پیدا کیا اور ہم نے ان چیزوں کو آب و رنگ عطا کیا۔

(۸۴)

بزمِ خموشاں

اقبالؔ، مسلمانوں کی انجمن کو "بزمِ خموشاں" سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں، اور ان کا یہ خیال غلط نہیں کہ مسلمانوں پر افسردگی طاری ہو چکی ہے۔ وہ اضمحلال کے عادی بن چکے ہیں۔ جمود ان کی سرشت ہے، خوابِ غفلت ان کا مزاج، خود فراموشی، ان کی زندگی، یہ تاریخ کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ قوم، جو کردارِ عمل کے لحاظ سے اپنا جواب نہ رکھتی ہو جس نے اپنے عزم واستقامت کے وہ نمونے دنیا کے سامنے پیش کئے ہوں جن پر دشمن بھی عش عش کر اٹھتے ہوں اور انگشت بدنداں رہ گئے ہوں۔ اب صرف ایک بزمِ خموشاں ہے جس میں کوئی ہنگامہ نہیں۔ کوئی آشوب نہیں، کوئی غوغا نہیں۔ حالانکہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے۔ جب یہی قوم تھی جس کی ہنگامہ خیزیوں نے سمندر کو کھنگال ڈالا تھا۔ آسمان کے ستاروں پر کمند ڈالی تھی اور انھیں اپنا اسیر کر لیا تھا۔

لیکن ——!

لیکن جب میں نمودار ہوا تو عشق کے زور سے میں نے یہ دنیا بدل دی۔ یہی بزمِ خموشاں، آشوب اور ہنگامہ کی دنیا بن گئی۔ میں نے اپنا سوز آرزوؤں میں منتقل کر دیا اور اسے تڑپ، تپش اور خلش عطا کر دی۔

زبورِ عجم کی ایک غزل میں، اقبال نے یہی بات بڑے دلکش انداز میں کہی ہے۔

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نہ داشت

میرے عشق کی کارفرمائیوں نے نئے نئے آشوب اور ہنگامے پیدا کئے، ورنہ اس بزمِ خموشاں میں تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ حرکت، نہ حرارت، نہ زندگی، نہ جوشش، نہ آرزو، نہ تمنا۔

ایک دوسری غزل میں، اسی مضمون کو اور زیادہ خروش اور ہمہمہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ہنگامۂ ایں محفل از گردشِ جامِ من!
ایں کوکبِ شامِ من، ایں ماہِ تمامِ من

اس "بزمِ خموشاں" میں یہ ہنگامہ آرائی۔ یہ آشوب و خروش جو نظر آرہا ہے یہ میرے جام کی گردش کا نمونہ ہے۔ میں اپنے جنونِ عشق کا مظاہرہ نہ کرتا تو یہ ہنگامہ برپا نہ ہوتا، وہی خموشی چھائی رہتی۔ بزمِ خموشاں کی بے رنگی اور بے لطفی میں کوئی فرق نہ آیا اور سچ پوچھو تو یہی ہنگامہ میری زندگی ہے۔ میری کائنات ہے۔ یہ میرا کوکبِ شام ہے جس کی روشنی میں قطعِ مسافت کرتا ہوں۔

یہ میرا ماو تمام ہے۔ جس کی نوا سے میں اپنی منزل کا سراغ لگاتا ہوں۔ یہ نہ ہوتی تو میں بھی نہ رہوں۔ اس کے دم سے میں ہوں۔ میری نوا کے دم بدم یہ میرا ہنگامہ اور خروش ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اے عالم رنگ و بو ایں صحبت ما تا چند
مرگ است دوام تو عشق است دوام من

" عالم رنگ و بو" یعنی دنیائے دوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ تو میرے ساتھ کیوں لگا ہوا ہے؟ میرا تیرا میل کیا؟ تیری حقیقت کچھ اور ہے۔ میری حقیقت کچھ اور میرے اور تیرے درمیان کوئی وجہ اشتراک نہیں۔ ہم دونوں کی منزل الگ الگ ہے۔ ہم دونوں ایک ندی کے دو ایسے کنارے ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے۔ جن میں بُعد تو بڑھ سکتا ہے لیکن قرب پیدا نہیں ہو سکتا ــــ کیونکہ تو فانی ہے اور ہمیں عشق نے غیر فانی بنا دیا ہے۔ تو باقی رہنے والا نہیں اور ہم باقی ہیں۔ تیرا انجام مرگِ دوام اور ہمارا انجام (عشق کی بدولت) زندگی جاوید۔

(۸۴)

گلشنِ رازِ جدید

علامہ محمود شبستری کی معروفِ انام اور یگانۂ روزگار کتاب "گلشنِ راز" آج سے کم و بیش آٹھ سو سال پہلے منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب وحدۃ الوجود کی شارح اور غماز ہے۔ بڑے دقیق مسائل بڑے لطیف پیرایہ میں بیان فرمائے ہیں۔ اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک صاحب کے سترہ سوالات جو غامض ترین فلسفہ کی پیداوار، اور نازک ترین مسائلِ خودی و خدا سے متعلق تھے پیش کئے۔ شبستری نے انہی کا جواب لکھ کر، خود غیر فانی شہرت حاصل کرلی۔ اور کتاب بھی اس موضوع پر حیرت آفرین تھی۔

اقبال کا زمانہ شبستری سے زیادہ نازک اور پیچیدہ معاملات و مسائل کا دَور تھا۔ انھوں نے نئے رنگ میں، لیکن بنیادی طور پر علامہ محمود شبستری کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو کر لکھی ہے۔ شبستری نے دنیا کا بہت بڑا فتنہ آشوب چنگیز کی صورت میں دیکھا تھا۔ چنگیز کی ہلاکت سامانیاں سفاکیاں

درندگی اور شقاوت کے مظاہرے، وحشت اور بربریت کے نمونے انسانی خون کی ارزانی، مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور ہلاکت۔ یہ سب کچھ دیکھ کر شبستری نے مسلمانوں کو تلقین کی تھی کہ وہ اپنی حقیقت کو سمجھیں ـــ اپنے دین پر غور کریں اور وہی بن جائیں جو ان کا رب چاہتا ہے۔

اقبال کا دور بھی بڑا ہنگامہ پرور تھا۔ شبستری نے اگر آشوب چنگیز کا نظارہ کیا تو اقبال کے حصہ میں آشوب فرنگ آیا جس نے مسلمانوں کے فکر و عقائد کی بنیادیں متزلزل کر کے رکھ دیں۔

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافرادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟

اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ غمزۂ خوں ریز، کافر مغرب کا تھا۔

چنگیز نے صرف گردنیں ـــ کاٹی تھیں۔ عمارتیں ڈھائی تھیں۔ جان و تن کا رشتہ منقطع کیا تھا۔ کھیتوں میں آگ لگائی تھی، شہروں کو کھنڈر بنا دیا تھا، آبادیوں کو بن میں منتقل کر دیا تھا۔ تہذیب و تمدن اور ثقافت کے نقوش نوک خنجر سے کھرچ دیئے تھے۔ لیکن یہ سب وہ نقصانات تھے جن کی تلافی ممکن تھی۔ اور یہ امکان عمل میں بھی آیا۔ یعنی بے شک مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔ لیکن وہ فنا نہیں ہوئے۔ باقی رہے درخت کی شاخیں اور پتیاں کاٹ دی جائیں تو کچھ عرصہ بعد وہ اور زیادہ ہرا بھرا اور بارآور ہو جاتا ہے۔ مسلمان بھی آشوب چنگیز کے گرداب میں پھنس کر تباہ ہوئے لیکن پھر ابھرے۔ پھر بڑھے۔ پھر دنیا میں انھوں نے اپنا مقام حاصل کر لیا، اور ایسا معلوم ہوا،

جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ جیسے کسی طرح کا نقصان پہنچا ہی نہیں تھا مسلمان جب گر کر سنبھلتا ہے تو بہت اچھی طرح چوکس ہو کر سنبھلتا، اور میدانِ حیات میں قدم رکھتا ہے۔ یہی صورت ہنگامۂ چنگیز کے بعد رونما ہوئی۔

لیکن اقبال نے، جو فتنۂ فرنگ دیکھا۔ وہ ہنگامۂ چنگیز کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تباہ کن، ہلاکت خیز، مرگ آفریں اور ہولناک تھا، اس انقلاب نے اتنا بڑا ستم کیا جو کبھی نہ کیا تھا۔

دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اس فتنہ نے مسلمانوں کی گردنیں کاٹیں۔ اور ان کی فکر و نظر پر بھی تلوار چلائی۔ اس انقلاب نے مسلمانوں کے تخت و تاج بھی چھینے اور ان کی متاعِ دین و دانش پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس آشوب نے مسلمانوں کے شہر بھی ویران کیے اور ان کی دنیائے دل بھی تاراج کر دی۔ اس سیلِ سبک سیر و زمین گیر نے مسلمانوں کی دولت و سطوت بھی لوٹی اور اعتقاد و یقین پر بھی چھاپا مارا۔ اس عفریتِ فرنگ نے مسلمانوں کی صحیح تاریخ کو دریا برد کر دیا غلط تاریخ لکھی، پڑھائی، ازبر کرائی، اور اسے ایک صحیفہ کا درجہ دے دیا۔ اس ابلیسِ فرنگ نے مسلمانوں کو غلام بنایا، لیکن تن کے ساتھ ساتھ من کی دنیا پر بھی اپنا سکہ چلایا۔ چنگیز حیوانوں کو غلام بناتا تھا۔ ساحرِ فرنگ نے بچوں کو بھی نہ چھوڑا۔ اس نے مدرسے کھولے۔ کالج کھولے۔ یونیورسٹیاں قائم کیں اور نئی پود ایسی تیار کی جو اپنے آبا سے منحرف ہو گئے۔ اپنے اسلاف کو بُرا سمجھنے لگی۔ اپنے اکابر پر طعن کرنے لگی۔ اپنے اپنے اسلاف کا مذاق اڑانے لگی،

اپنے ماضی کو بے کیف اور بے رنگ سمجھنے لگی۔ اپنے علمی سائنسی اور تاریخی کارناموں کو افسانہ اور داستان سمجھنے لگی۔ اپنے آپ سے غافل ہو گئی۔ اپنی خودی سے محروم ہو گئی۔ اس نے اپنا دین، اپنا ایمان، اپنا عقیدہ، اپنا یقین، اپنا علم، اپنی دانش ہر چیز جلوۂ فرنگ کی نذر کر دی۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی آشوب ہو سکتا تھا؟

عروج و زوال، ادبار و انحطاط، عارضی اور وقتی چیز ہے۔ قومیں ابھرتی ہیں اور گرتی ہیں اٹھتی ہیں اور گر پڑتی ہیں، ٹھوکر کھاتی ہیں اور سنبھلتی ہیں، یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر ماتم کیا جائے اور نوحہ خوانی کی جائے۔ اقبال نے ایسے ہی موقعہ پر کہا تھا۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے

ایران مٹ جائے، کوئی پروا نہیں، تیرا مسکن ساری دنیا ہے۔ تو کہیں اور کامکین ہو جائے گا، اور اپنا ایران بنا لے گا۔ لیکن اگر ایران رہ گیا لیکن تو مٹ گیا تو کیا ہوگا؟ مقصود تو ہے یا ایران و اصفہان؟ پاکستان اور افغانستان؟ نہیں یہ زمین کے ٹکڑے مقصد نہیں ہو سکتے۔ مقصود تو ہے۔ تجھے زندہ رہنا چاہیے۔ تجھے آفات و حوادث سے محفوظ رہنا چاہیے۔ تیری آن، اور تیری خودی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ ساحر فرنگ نے دوہری چال چلی۔ اس نے ایران کو بھی مٹایا اور تجھے بھی۔ عراق کو بھی پامال کیا اور تجھے بھی۔ شام و لبنان کو بھی کچلا اور تجھے بھی۔ جبرائیل و مغرب الاقصیٰ اور طرابلس الغرب کو بھی خون کا غسل دیا اور تجھے بھی۔ تیرے فکر و نظر کو بھی۔ تیرے ایمان،

عقیدے اور یقین کو بھی۔ تیرے قلب، روح اور خودی کو بھی۔ بخارا اور ترکستان تو نے بسائے تھے۔ آذر بائیجان اور خراساں کو تو نے رونق بخشی تھی۔ ترکمان اور کوہِ قاف کی زینت تیرے دم سے تھی۔ آج یہ سب موجود ہیں لیکن تو کہاں ہے؟ تو کیوں نہیں ہے؟

اس تاریخ کی سب سے بڑی اور ہولناک ٹریجڈی نے اقبال کو مجبور کیا کہ وہ ایک نئی، "گلشنِ راز" لکھیں۔ رنگ وہی ہو، بات کا انداز بدلا ہوا ہو۔ اصول وہی ہو۔ پیرایہ دوسرا ہو، بنیاد وہی ہو، لیکن طرز کچھ اور ہو۔

اس جذبہ کے ماتحت اقبال نے مثنوی گلشنِ رازِ جدید لکھی، اور کوئی شبہ نہیں، اس مختصر سے کتابچہ کو وہ مقام حاصل ہے جو بڑے بڑے فکری، صحیفوں کو بھی حاصل نہیں ہے۔ یہ بھی اقبال کا کمال ہے۔ اور بہت بڑا کمال۔

ہمارے موضوع سے، مثنوی گلشنِ رازِ جدید کے مباحث و مسائل خارج ہیں۔ اس لئے کہ اس کتاب میں، ہم اقبال کے فلسفہ اور پیام سے بحث نہیں کر رہے ہیں، صرف اقبال کو تلاش کر رہے ہیں۔ کہ اپنے اشعار کے آئینہ میں وہ کیسا نظر آتا ہے؟ اس کے خدوخال کیسے ہیں؟ اس کا چہرہ مہرہ کیسا ہے؟ اس کی جبیں پرشکن، اور چشمِ جہاں بین کی کیا کیفیت ہے؟ اور یہ کہ وہ خود اپنے بارے میں ــــ تعلّی اور خودستائی سے ہٹ کر ــــ کیا رائے رکھتا ہے؟ کن الفاظ میں اظہارِ خیال کرتا ہے؟

اگر ہم اقبال کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھ لیں تو اس کے پیام اور

فلسفہ کو سمجھنے میں ذرا دیر بھی نہیں لگے گی۔ پھر تمام اسرار منکشف ہو جائیں گے۔ تمام گرہیں کھل جائیں گی۔ تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

لیکن کسی شخصیت کا سمجھنا آسان نہیں ہے جب کہ وہ شخصیت معمولی نہ ہو، بلکہ اقبالؔ جیسی ہمہ جہتی شخصیت ہو۔ جو فلسفی بھی ہے اور حکیم بھی۔ شاعر بھی ہے اور صوفی بھی، مفکر بھی ہے اور واعظ بھی۔ رند بھی ہے اور شیخِ حرم بھی۔ عالم بھی ہے اور ناصح بھی۔ غازی بھی ہے، اور مجاہد بھی زندہ بھی ہے اور شہید بھی۔ اس کی ذات رنگا رنگیوں اور بوقلمونیوں کا مجموعہ ہے۔ ان رنگینیوں کے ان کے صحیح مقام پر رکھنا۔ انہیں صحیح زاویہ سے دیکھنا انہیں ان کی حقیقت کے اندر محبوس اور مقید ہو کر سمجھنا نہ آسان ہے، نہ ہر شخص کے بس میں ہے۔ اس کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم خود اقبالؔ سے پوچھیں، کہیئے اپنے بارے میں بغیر کسی تکلف اور خود ستائی کے آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟ کیونکہ قاعدہ ہے۔

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

آپ خود ہی اپنی تحقیق ہیں۔ دوسروں کے مقابلہ میں اپنی شرح و تفسیر زیادہ خوبی اور سچائی سے کر سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ جو کچھ اپنے بارے میں ارشاد فرمائیں گے وہی صحیح اور درست ہو گا۔ کیونکہ ہم آپ کے بارے میں یقین رکھتے ہیں۔

مستند ہے تیرا فرمایا ہوا،

اس سوال کے جواب میں۔ جو کچھ اقبالؔ نے کہا ہے اس کا کچھ حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں، اور وہ اقبالؔ کو سمجھنے کے لئے بہت کافی ہے۔ کیونکہ اقبالؔ اپنے بارے میں فرماتے ہیں۔

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں نہیں جھوٹ ہے واللہ نہیں ہے

لیکن معاف کیجیے گا!
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

اقبالؔ سے بڑھ کر اقبالؔ کا اداشناس، مزاج داں اور شناسا کون دوسرا ہو سکتا ہے؛ وہ خود اپنا بہترین مفسر اور بہترین شارح ہے!

فرماتے ہیں،

گزشت از پیشِ آں دانائے تبریز!!
قیامت ہا کہ است از تشت چنگیز!!

دانائے تبریز (علامہ محمد شبستری) کی آنکھوں کے سامنے وہ خوں چکاں قیامت گزری جسے فتنۂ چنگیز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

نگاہم انقلابے دیگرے دید!
طلوعِ آفتابے دیگرے دید!

لیکن میری نگاہ بھی، ایک بہت بڑا اور خوفناک اور ہلاکت خیز انقلاب دیکھ چکی ہے جو اپنی نوعیت اور نتیجہ کے اعتبار سے آشوبِ چنگیز کے مقابلہ میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ میں نے بھی ایک دوسرے سورج کی چمک دمک دیکھی ہے جو تن بدن کو جھلسائے دیتی ہے۔

کشودم از رخِ معنی نقابے!
بدستِ ذرّہ دادم آفتابے!

میں بھی اب ضبط نہیں کر سکتا، اور شبستری کی طرح مردِ معنی کو بے نقاب کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میں بہت بڑا کام کر رہا ہوں۔ ذرّۂ بے مقدار کے ہاتھ میں سورج کی شمع دے رہا ہوں کہ

لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان
کیا اس کی روشنی میں بھی وہ اپنا جادہ اپنی منزل نہیں دیکھ سکے گا؟

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم!
مثالِ شاعراں، افسانہ بستم!

یہ خیال کرنا کہ بغیر پیئے مست ہوں اور عام شاعروں کی طرح افسانہ طرازی میں مصروف ہوں۔ میں حقیقت بیان کرتا ہوں، برہنہ اور عریاں حقیقت!

نہ بینی خیز ازاں مردِ فرودست
کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست!

اس آدمی سے کسی سچائی کی توقع نہ رکھنا جو مجھ پر شعر و سخن کی تہمت رکھتا ہے، یعنی یہ کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں الفاظ سے کھیلنے والا شاعر ہوں۔

بہ کوئے دلبراں کارے ندارم!
دلِ زارے، غمِ یارے ندارم!

دلبروں، زہرہ وشوں اور ماہ جبینوں کے کوچے سے مجھے کیا کام! میں عشقِ مجازی کا قائل نہیں، عشقِ حقیقی کا نام لیوا ہوں۔

نہ خاکِ من غبارِ رہ گزارے!
نہ در خاکم دلِ بے اختیارے!

میں والا مقام، اور بلند بام ہوں۔ میری خاک رہ گزار کے لئے نہیں ہے۔ نہ میں ایسے دل کا مالک ہوں کہ جہاں چاہے پھسل جائے، اور میں اس کے سامنے بے بس ہو جاؤں۔

بہ جبریلِ امین ہم داستانم!
رقیب و قاصد و دربان ندانم!

میں جبریلِ امین کا ہم زبان اور ہم نفس ہوں۔ نہ میرا کوئی رقیب ہے جس سے مجھے اندیشہ ہو۔ نہ میں کوئی قاصد رکھتا ہوں کہ اسے نامہ بر بنا کر کسی معشوقِ ہرجائی کے پاس بھیجوں، اور اشک و آہ معنوی کی سوغات روانہ کروں۔

سوزِ فغاں جنبشِ دیوار و در غلط

میں ان سب باتوں سے بے نیاز ہوں۔

مرا با فقر سامانِ کلیم است!
فرِ شاہنشہی زیرِ گلیم است!

اگرچہ میں مردِ فقیر ہوں، لیکن سامانِ کلیم سے بہرہ ور ہوں۔ کمبل اوڑھتا ہوں لیکن فرِ شہنشاہی داب سلطانی اور رعبِ شہریاری میرے کمبل کے نیچے دبا رہتا ہے۔ یہ چیزیں مجھ پر حکومت نہیں کر سکتیں۔ میں ان پر حاکم اور ان کا کارفرما ہوں۔ اس لئے کہ اسلام کا فقیر رو باہی نہیں سکھاتا۔ اس میں شان ہوتی ہے،

جلال ہوتا ہے۔ دبدبہ ہوتا ہے۔ قوت ہوتی ہے۔ وہ دنیا والوں سے نہیں ڈرتا۔
ملوک و سلاطین کی پروا نہیں کرتا۔ امرا کے در کا طواف اس کا شعار نہیں۔
وہ خود ایک طاقت ہے اور اتنی بڑی طاقت کہ بادشاہ اسے خراج دیتے ہیں۔ اور
سلاطینِ عالم اس کے در پر حاضری دیتے ہیں۔

اگر قائم بہ صحرائے نہ گنجم!
اگر آبم بہ دریائے نہ گنجم!

اگر خاک ہوں تو بھی ایسی خاک، جو صحرا کی وسعت میں نہیں سما سکتی
اور اگر قطرہ ہوں، تو بھی ایسا جیسے سمندر کی پنہائی بھی کافی نہیں ہے۔

دل سنگ از زجاجِ من بہ لرزد
یم افکارِ من ساحل ندارد

میں شیشہ ہوں، لیکن ایسا شیشہ جس سے پتھر کا دل لرزتا ہے۔
میرے افکار کا سمندر اتنا گہرا، اتنا چوڑا، اتنا بے کراں ہے کہ اس کا ساحل
ہی نہیں ہے۔

نہاں تقدیر ہا در پردۂ من!
قیامت ہا بغل پروردۂ من!

میرے پردہ میں تقدیریں پوشیدہ ہوں۔ قیامتیں ہنگامے،
طوفان، آشوب، ان سب کو میرے ہی دامن میں تو تربیت
عطا ہوتی ہے۔ ورنہ ہنگامہ سکون بن جائے، آشوب موت
بن جائے، طوفان جامد ہو جائے۔

دلے در خویشتن خلوت گزیدم
جہانے لازوالے آفریدم

جب کبھی، خود اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بیٹھتا ہوں تو یہ وقت بھی رائگاں نہیں جاتا، میری حکومت میں لازوال، زمانے ڈھلتے ہیں! میری کارگاہِ فکر میں نئی نئی دنیائیں تعمیر ہوتی ہیں۔

نہ جانم رزم مرگ و زندگانی است
نگاہم بر حیاتِ جاودانی است

میں مرگ و حیات کے اسرار سے واقف ہوں، میری نگاہ حیاتِ جاوداں کی راز آشنا ہے۔

زجان خاکِ ترا بیگانہ دیدم!
باندامِ تو جاں خود دمیدم!

تیری خاک کو زندگی کی حرارت سے بیگانہ دیکھتا ہوں۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ تیرے تنِ ناتواں میں اپنی رُوح پھونک دوں تاکہ تو بھی وہی ہو جائے جو میں ہوں۔ تیرے سینہ میں بھی وہی جذبہ مچلنے لگے جس نے مجھے بے قرار کر رکھا ہے۔

ازاں نارے کہ دارم داغ داغم
شبِ خود را بیفروز از چراغم!

یہ میرے دل کے داغ، آخر کس کام آئیں گے، میرے اس چراغ سے تو اپنی شبِ تاریک کیوں نہیں روشن کر لیتا؟

بہ خاکِ من دلے چوں دانہ کشتند!
بہ لوحِ من خطِ دیگر نوشتند!

جس طرح کھیت میں دانہ گندم ڈالا جاتا ہے اور اس کی کاشت ہوتی ہے۔ اسی طرح میری خاک سے دلوں کی کھیتی ہوتی ہے۔ لوح میری ہے، تقدیر دوسروں کی۔

اسرارِ حیات

رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو، گلشن میں مثلِ جو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا
زندگی قطرے کو سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

(۸۵)

معنیِ تازہ

مسلمان کی نارسائی، اور ناکامی کے اسباب و عوامل کیا ہیں؟ — ان کے خواص، عام مسلمانوں میں مذہب پر کٹ مرنے کا جذبہ ہے، لیکن رہنما انہیں دھوکہ دیتے ہیں. فریب میں مبتلا رکھتے ہیں۔ صوفی انہیں اسیرِ دام کرتا ہے ملا ان سے حقائق کو چھپاتا ہے، عالم انہیں جاہل سمجھتا ہے۔ یہ لوگ اگر راستہ سے ہٹ جائیں تو مسلمان پنپ سکتا ہے، یا یہ لوگ خود سدھر جائیں تو عوام کو بھی سدھار سکتے ہیں؟

اقبال مردِ مسلمان کو مشورہ دیتے ہیں کہ تو ان سب کو چھوڑ، خود اپنے آپ کو پہچان، خود اپنے ضمیر سے فتویٰ لے۔ خود اپنی رائے پر عمل کر اور خود اپنے رستے پر چل — اس لئے کہ جن لوگوں سے تو نے آس لگائی ہے یہ تجھے کبھی بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ یہ خود گم کردہ راہ ہو چکے ہیں۔

سب سے پہلے بے ثباتیِ عالم پر اظہارِ خیال کرتے ہیں:

ایں گل و لالہ تو گوئی کہ مقیم اند ہمہ!
راہ پیما صفتِ موجِ نسیم اند ہمہ!

•

یہ گل ولالہ یعنی یہ جاہ وجلال، یہ شان شکوہ، یہ اقتدار واختیار، یہ فرمانروائی اور جہاں کشائی، یہ کار فرمائی، اور دولت و ثروت، کیا تو انہیں مستقل بغیر فانی، اور ابدی سمجھتا ہے؟

نہیں، یہ تیری غلط فہمی ہے، ان سب کو فنا ہونا ہے، اور موجِ نسیم کی طرح، یہ فنا کی منزل کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

یہ بیان کر چکنے کے بعد وہ مسجد و مکتب کی طرف رُخ کرتے ہیں۔

معنی تازہ کہ جوئم و نیابم کجا است؟
مسجد و مکتب و مے خانہ عقیم اند ہمہ

میں زندگی کے نئے معنی تلاش کرتا ہوں مگر کہیں نہیں پاتا۔ مسجد میں جاتا ہوں، تو وہاں وہی مُلا کی کم نظری۔ خانقاہ کا رُخ کرتا ہوں تو وہاں وہی صوفی کی کم نگاہی۔ مے خانے پہنچتا ہوں تو وہاں وہی، رہنماؤں اور رہبروں کی چنگ زرگری۔

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ سارے ادارے بانجھ ہو چکے ہیں۔ نہ ان میں شوخئ انکار ہے، نہ فکر و تعمق، نہ سعی و جہد۔ نہ ذوقِ اجتہاد۔ ہے کیا؟ صرف جمود، قدامت، یہ لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ واقعات اور حقائق سے

آنکھیں چراتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس طرح آنکھیں بند کر لینے سے وہ ٹھوس حقائق، وہ اہم مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ یہ ان کی سادگی ہے، حقیقت سے کہیں نظر چرائی جا سکتی ہے؟

حقیقت آپ منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

غرض ان مقامات پر صلاح و فلاح کی امید لے کر جانا حماقت ہے۔

اس مایوسی کے بعد وہ امید کا چراغ روشن کرتے ہیں اور خود اعتمادی کا پیام دیتے ہیں۔

حرف از خویشتن آزمو ز دداں حرف پر سوز

کہ دریں خانقاہ بے سوز و کلیم اند ہمہ

لہٰذا، تقاضائے دانش و مصلحت یہ ہے کہ تو ان سے الگ ہو جا۔ خود غور و فکر کی عادت ڈال، اپنی عقل و فہم سے کام لے۔ اپنے ضمیر کو رہنما بنا۔ یہ خانقاہوں میں رہنے والے وہ لوگ ہیں جو سوز سے محروم ہیں۔ جانتے ہی نہیں سوز و تپش کی لذت کیا ہوتی ہے؟ انہیں جو کچھ معلوم ہے وہ صرف یہ کہ دوا اور دو چار روٹیاں، یا پھر بیکار یا ہمی، اس سے فرصت ملے تو یا، ہمی تکفیر

کار کافر فکر و تدبیر جہاد!

کار ملا فی سبیل اللہ فساد!

لہٰذا، تو خود اپنا رہنما بن، ان رہزنوں سے آس نہ لگا۔

از صفا کوشی ایں تشیناں کم گوئے

موئے ژولیدہ ما شستہ گلیم اند ہمہ

ان تکیہ نشینوں، ان پیروں، ان نام نہاد فقیروں کے دام ہمرنگ زمین کا شکار نہ ہو، یہ صرف اسلاف کے مجاور بن کر بیٹھے ہیں اور اس کی روٹی کھا رہے ہیں۔ یہ خود کچھ نہیں ہیں۔ نہ ان کے پاس علم ہے نہ معرفت، نہ نگاہ، نہ خود شناسی۔ نہ خود نگری۔ نہ خود اعتمادی، نہ ایمان، نہ یقین۔ یہ اپنے قیاس سے، اپنے اقوال سے۔ اپنی چرب زبانی سے کام لے کر تیرے اوپر مسلّط ہو گئے ہیں اور تجھے اپنا آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں۔ تو ان کے چنگل میں کیوں پھنسا ہوا ہے۔ اٹھ اپنی منزل آپ تلاش کر ـــــ وہ مل جائے گی ضرور مل جائے گی۔

چہ حرم ہا کہ درو حرم ساختہ اند!

اہلِ توحید یک اندیش و دو دیم اند ہمہ

یہ شعر نہیں، حقائق و معارف کا ایک دفتر ہے!

دریا بہ حباب اندر

اسی کو کہتے ہیں۔ واقعی اقبال نے اس ایک شعر میں مندر سمو دیا ہے۔

یہ موجودہ دَور کے علمائے ـــــ ان کی حقیقت کیا ہے؟ چند مستثنیات سے قطع نظر کر کے عام طور پر ان کے حالات کیا ہیں؟ یہ ہیں کہ نہ ان کے پاس علم ہے، نہ ان کے پاس نظر ہے، علم حاصل کرنا گناہ سمجھتے ہیں، لیکن عالم بنے ہوئے ہیں، خدا نے بار بار، اپنے قرآنِ کریم میں غور و تفکر کی دعوت دی ہے، مگر یہ غور و فکر تو کارِ بے کاراں سمجھتے ہیں۔ اسلام، ایک زندہ متحرک اور فعال مذہب ہے، لیکن انہوں نے اسے جامد بنا دیا ہے۔ اسلام کا حکم

مسلمان کے لئے یہ ہے کہ وہ سارے آفاق کو تسخیر کرلے، لیکن یہ مسلمان بے دلی، ادو بے حسی پیدا کررہے ہیں اور خود ان کا یہ حال ہے کہ اپنے نفس کو بھی تسخیر نہیں کر سکتے۔ انہیں صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ اسلام پر کیا گزر رہی ہے۔ ملتِ اسلامیہ پر آفات و مصائب کا کس طرح نزول ہو رہا ہے؟ ان مسائل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں اگر کچھ دلچسپی ہے تو فرقہ بندی سے۔ انھوں نے حرم کے اندر اور بہت سے حرم بنا رکھے ہیں۔ کوئی کسی جماعت سے وابستہ ہے کوئی کسی مسلک سے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو کافر سمجھتا ہے، جو اسے کافر نہ مانے اسے کافر قرار دیتا ہے۔ سود مرکب کی طرح اس کا فتوائے کفر بھی مرکب ہے۔ ایک آدمی سے شروع ہوتا ہے اور پھر سارے خاندان تک سارے حلقۂ احباب تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کا کام یہ تھا کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے۔ اسلام کی تبلیغ کرتے۔ اسلام کے حقائق دنیا کے سامنے پیش کرتے، دنیا کو اسلام سے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کرتے مسلمانوں کی اصلاح کرتے۔ ان میں غیر مذہبی رسوم و عادات جو پیدا ہو گئے ہیں، انہیں دور کرانے کی کوشش کرتے۔ مسلمانوں کو قرآن کریم سکھاتے۔ قرآن کریم کے حقائق سے آشنا کرتے۔ اسوۂ نبی کو ان کے سامنے پیش کرتے۔ اور ان کے کردار کو مسلم اور مستحکم بنا دیتے۔ اسلاف کے کارنامے ان کے علم میں لاتے اور ان میں یہ جذبہ پیدا کر دیتے کہ وہ اپنے اکابر پر، اپنے اسلاف پر، اپنے ماضی پر فخر کرینگے۔

لیکن یہ کچھ نہیں کرتے، ایسا کام جس سے مسلمان سر بلند ہوں۔ اپنے

دین کو پہچانیں۔ اپنی حقیقت سے واقف ہوں۔ ان کے نزدیک ایک معیوب ہے۔
قابلِ ملامت ہے۔ ان کا محبوب مشغلہ صرف یہ ہے کہ تکفیر کی تلوار چلاتے رہیں۔
اور جو سامنے آجائے بغیر کسی امتیاز اور تخصیص کے اس تلوار سے اس کی گردن کاٹ
لیں۔ یہ اپنی ساری طویل اور پرفتن زندگی میں ایک بھی مسلمان نہ بنا سکے۔ ہاں بہت سے
مسلمانوں کو انھوں نے کافر ضرور بنا دیا۔

کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی افسوسناک کام ہو سکتا ہے؟ یا اگر کچھ نہیں کر سکتے
تھے تو کم از کم میدان سے ہٹ جاتے۔ لیکن یہ بھی ان پر گراں ہے۔ یہ سلطان بھی رہنا
چاہتے ہیں اور ملتِ اسلامیہ کی سالمیت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ
یہ ہے کہ اہلِ توحید آپس میں ایک دوسرے کے حریف بن کر کھڑے ہوئے ہیں،
ان میں اختلاف اور انتشار پیدا ہو چکا ہے۔

مشکل ایں نیست کہ بزم از سرِ ہنگامہ گزشت
مشکل ایں است کہ بے نقل و ندیم اند ہمہ

اصل مشکل یہ نہیں ہے کہ بزم شورِ زندگی سے محروم ہو چکی ہے۔ وہ تو ہر وقت پیدا ہو سکتا
ہے اصل مشکل یہ ہے کہ ان عناصر نے جن کا ابھی ذکر ہوا ساری قوم کو مفلوج اور معطل بنا دیا
ہے۔ نہ اس کے سامنے کوئی لائحہ عمل ہے نہ اس کا کوئی مسلک ہے۔

اعجازِ شعر

ہو اگر ہاتھ میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زبان تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری کہیں بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلہ کی آواز سے

(۸۶)

آہ فغانِ بے اثر

جاوید نامہ میں، فلکِ زہرہ پر پہنچنے اور مرشدِ رومی سے نیاز حاصل کرنے سے پہلے اقبال اپنے واردات بیان کرتے ہیں اور اپنی نفسی کیفیتوں کا جائزہ لیتے ہیں، اور بڑی حسرت کے ساتھ اپنے اور اپنی قوم کے فرائض کو واضح کرتے ہیں۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے

لیکن بات ایسی اثر انگیز ہے کہ ایک ایک لفظ تیر کی طرح دل میں ترازو ہوتا جاتا ہے۔ جس کیفیت کو بیان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ میرا دل تو محشرستان بنا ہوا ہے۔ اس میں طوفان اٹھتے ہیں، شورشیں برپا ہوتی ہیں۔ امیدوں اور آرزوؤں کے ایوان تیار ہوتے ہیں۔ میری نگاہ بلندان پر جا کر بھی نہیں رکتی، وہ اونچی ہوتی رہتی ہے اور زیادہ اونچی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن میری قوم ــــ! وہ مستِ خواب ہے۔ اس میں نہ حرکت ہے۔ نہ زندگی، نہ شرارِ آرزو، نہ سوزِ حسرت نہ ذوقِ نظر نہ شوقِ جستجو۔

اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

از مقام خود نہ می دانم کجا است
این قدر دانم کہ از یاراں جدا است

میرا مقام کیا ہے؟ میں کہاں ہوں؟ یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ساتھیوں اور دوستوں سے رفیقوں اور ندیموں سے میرا راستہ مختلف ہے وہ اپنی جگہ پر منجمد ہیں لیکن حرکت اور جنبش مجھے ٹھہرنے نہیں دیتی۔ شوقِ جستجو ہے جو مجھے آوارہ رکھتا ہے، اور میں رواں دواں چلتا رہتا ہوں۔

اندر و دم جنگ بے خیل و سپہ
بینند آں کو، ہم چوں من دارد نگہ!

میرے مقصد، میری غایت۔ میری منزل ــــ اسلام ــــ کے خلاف جتنے طوفان اٹھتے ہیں، میں ان سب کا مقابلہ کرتا رہتا ہوں، میرے پاس نہ فوج ہے نہ سپاہ، لیکن میرے دم خم میں فرق نہیں آتا۔ پیکار میرا شعار ہے اور میں برابر جنگ میں مصروف رہوں گا، جب تک یہ جنگ جیت نہ لوں۔ یعنی غیر الٰہی قوتوں کو پامال کر کے مسلمان کو پھر مسلمان نہ بنا دوں۔

بے خبر مرداں از زم کفر و دیں
جانِ من تنہا چو زین العابدیں!

میری قوم کے لوگ، میرے ساتھی اور ندیم۔ اس جنگ سے ناواقف اور لاعلم ہیں، جو کفر و دین کے درمیان جاری ہے اور جو اپنے اثرات کے لحاظ سے

بڑی تعجب خیز اور دُور رس ہے۔ غفلت اور خود فراموشی کی اس سے بڑھ کر اور کیسا کیفیت ہوگی کہ قوم اس کشمکش سے نہ دلچسپی رکھتی ہے، نہ اس جنگ کو جیتنے کے لئے حرکت کرتی ہے اور میدانِ عمل میں اترنے کی نہ جرأت کرتی ہے۔

لیکن میں میدان میں ڈٹا ہوا ہوں۔ جیسے امام زین العابدین کربلا کے میدان میں اپنا سب کچھ لٹا چکنے کے بعد بھی موجود تھے۔ ان پر نہ ہراس طاری ہوا تھا، نہ دشمن کی دہشت۔

غرقِ دریا طفلک و برنا و پیر!

جاں بہ ساحل بردہ یک مردِ فقیر!

صورتِ حالات یہ ہے کہ چاہے جوان ہو۔ یا بوڑھا، یا بچہ، یہ سب دریائے غفلت میں غرق ہیں۔ ان میں سے کسی میں نہ حوصلہ ہے نہ امنگ، یہ ڈبکیاں کھا رہے ہیں مگر ساحلِ مراد کی طرف بڑھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ بس یہ ایک مردِ فقیر ـــــ اقبال ـــــ ہے جو ساحل کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

برکشیدم پردہ ہائے ایں وثاق

ترسم از وصل و بہ تابم از فراق

میں نے حجابات اٹھا دیئے ہیں اور راز کی بات بتا دی ہے اور وہ راز کی بات یہ ہے کہ خبردار وصل کی آرزو نہ کرنا فراق کی آگ میں سلگتے رہنا۔ قرب کی آرزو کی، اور شوق و جستجو کا سلسلہ بند ہوا، اور اس سلسلہ کے بند ہونے ہی مرگِ قوم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جو اقوام و ملل کے لئے بھی

(۸۷)

اب گھومتے گھماتے، اقبال فلکِ مریخ پر پہنچتے ہیں۔ مرشد رومی خضرِ راہ ہیں۔ یہاں وہ ایک پیر مرد سے اقبال کو ملاتے ہیں۔ اور اس پیر مرد سے مل کر وہ بہت متاثر ہوتے ہیں۔

دیر سال و قامتش بالا چو سرد
طلعتش تابندہ چوں ترکان مرد!

وہ بھی بہت جلد رومی کے تعارف پر اعتماد کرتے ہوئے اقبال سے گھل مل جاتا ہے۔ اور ان کا ہاتھ پکڑتا ہے، اور اپنے ایک شہر مرغدین کا چکر لگاتا ہے۔ وہاں کے بام و در، وہاں کی عمارتیں، باغ و چمن، بندۂ مزدور اور کسان، ہر طرح کے لوگوں سے ملاتا ہے۔ ہر طرح کے طبقات سے اور ان کے خصوصیات سے آشنا کرتا ہے۔ اقبال اس کے ساتھ شہر کا گشت کر رہے ہیں۔ ہر قدم پر ایک نیا جلوہ دیکھتے ہیں اور حیران و ششدر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ یہاں کی ہر چیز الوکھی اور نرالی نظر آتی ہے۔ اپنی دنیا

میں جو کشت و خون، کشمکش اور کشاکش، مفاد کا تصادم، اغراض کی جنگ، خود غرضی کے مظاہر ہر روز اور ہر آن دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کا یہاں کہیں دور و نزدیک پتہ بھی نہیں۔ عجیب خوش قسمت شہر ہے، جہاں سب یکسوئی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ فساد، نہ فتنہ، نہ شورش، نہ اسٹرائک، نہ ہڑتال، نہ یومِ مطالبات، نہ مزدور یونین۔ نہ مل اونرس ایسوسی ایشن ـــــ یہ تھی مرغدین کی دنیا۔

درحقیقت، پیر مرد مریخ کے روپ میں اقبال خود بول رہے ہیں اور شہر مرغدین کی صورت میں وہ اس مثالی اور اسلامی ریاست کا تصور پیش کر رہے ہیں جو ان کا مقصود و منتہا تھا۔ یعنی وہ اپنی قوم کو بتانا چاہتے ہیں کہ اس دنیا کا موجودہ نظام اپنی بے بضاعتی نمایاں کر چکا ہے۔ یہ ہمارے درد کی دوا نہیں، اس کی بنیاد شور و شر اور فتنہ فساد پر ہے۔ اس میں خود غرضی اور مفاد پرستی ہے۔ اس میں ایک کماتا ہے سو کھاتے ہیں۔ اس میں محنت کرنے والے کو محنت کا پھل نہیں ملتا۔ کام کرنے والے کو اس کا پورا صلہ نہیں ملتا۔ نہ کاوشِ دماغ سے کوئی نسبت رکھتا ہے۔ نہ دست و قلم کی محنت کا کوئی مقام ہے۔ جو کچھ ہے، بس استحصال زیر لعدا استحصالِ بالجبر ہی سے عبارت ہے۔

لہٰذا اقبال مرغدین پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک نئی دنیا دیکھتے ہیں۔ اور یہ نئی دنیا بالکل وہی ہے، جو اسلامی نظام کے ماتحت ہو سکتی ہے، بلکہ ہے ہی اسلامی۔ اس کی خوبیاں اور اچھائیاں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری دنیا میں بھی مرغدین کا نظام، جو درحقیقت نظامِ اسلامی ہے

رائج ہو جائے۔

آئیے اب اقبال کے ساتھ، تھوڑی دیر مرغدین کی زیارت ہم بھی کرلیں۔

مرغدین و آں عمارات بلند!
من چہ گویم زاں مقام ارجمند!

میں مرغدین جیسے مقام، بلندی کی توصیف کیا کروں؟ صرف وہاں کی عمارتوں کی بلندی، اور شان شکوہ دیکھو تو حیران و ششدر رہ جاؤ۔

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

یہاں کے رہنے والے بڑے نیک طینت اور پاک باطن لوگ ہیں۔ باتیں سنئے تو شیریں سخن اور ویسے بھی بڑے خوبصورت۔ نرم خو اور سادہ پوش، نہ زرق برق لباس، نہ غرور و تکبر، نہ نمائش اور تصنع۔

ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور
چوں نمک گیریم ما از آب شور!

یہاں جس کسی کو سونے چاندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ سورج کی شعاعوں سے سیم و زر بنا لیتا ہے۔ جس طرح ہم کھارے پانی سے نمک بنا لیتے ہیں۔

خدمت آمد مقصد علم و ہنر!
کار ہا را کس نمی سنجد بہ زر!

یہاں علم و ہنر کا مقصد خدمت ہے، مال و زر نہیں،

کس نہ دینار و درم آگاہ نیست
ایں بتاراں را درحرم باراہ نیست

یہاں، روپے اور اشرفی کا چلن نہیں ہے۔ ان کے حرم میں سوداگری، کاروبار، اور سونے چاندی کے بت نہیں ہیں۔ اس لئے کہ جہاں خدمت مقصود ہنر ہو، نہ کہ جلب منفعت وہاں ان چیزوں کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟

بر طبیعت دیو ماشیں چیرہ نیست
آسماں ہا از دخاں ہا تیرہ نیست

یہاں بے درد، بے رحم، بے مروت اور انسانیت کش مشین کی حکومت نہیں ہے۔ جس نے انسان کو بیکار اور اس کے ہنر کو پامال کردیا ہے۔ نہ یہاں کا آسمان، کارخانہ کے دھوئیں سے تیرہ و تار ہو رہا ہے، جہاں مزدوروں کا خون چوسا جاتا ہے۔

سخت کش دہقاں چراغش روشن است
از نہاب دہ خدایاں ایمن است

یہاں کا کسان بڑا مطمئن ہے۔ بہت خوش ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ زمیندار کے ڈنڈے اور ظلم و شقاوت سے بالکل آزاد ہے کیونکہ یہاں کا کسان خود ہی زمین کا مالک ہے، نہ وہ کسی کا ذلیل ہے نہ ماتحت، نہ غلام نہ اس سے کوئی بیگار لیتا ہے، نہ لگان کے نام پر اس کا خون چوستا ہے پورے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔

کشت دکاوش بے نزاع آب جو ست
حاصلش بے شرکتِ غیرے از دست

وہ بوتا ہے، فصل اگاتا ہے اور خود ہی اسے کاٹتا ہے۔ کھیتوں کو سینچنے کے لئے نہر کے پانی پر جھگڑا نہیں ہوتا۔ ہر شخص اتنا ہی پانی لیتا ہے، جتنی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ ہر شخص دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتا ہے۔ لہٰذا کسی طرح کی تلخی اور بدمزگی سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی۔ زمیندار کے دستِ تظلم سے محفوظ ہے۔ اپنا کھیت، اپنا اناج، اپنا مال

نے غم دزدا نے غم کالا!

اس سے بڑھ کر عافیت کی زندگی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اندریں عالم نہ لشکر نے قشوں
نے کسے روزی خورد از کشت و خوں

یہ شہر عجیب دنیا ہے، یہاں نہ فوج ہے نہ سپاہ، ضرورت ہی نہیں پیش آتی ان چیزوں کی۔ نہ لوگ آپس میں جھگڑتے ہیں کہ انہیں کشت و خون سے بچانے کے لئے ڈنڈے اور جیل خانے کی ضرورت ہو۔ نہ کوئی ریاست کسی ریاست کی دشمن ہے کہ باہمی نزاعات کا فیصلہ جنگ و پیکار سے کیا جائے۔ سب اچل کر رہتے ہیں ہر طرف امن و آسائش کی کارفرمائی ہے۔

نے قلم درمرغزیں گیرد فروغ!
از فنِ تحریر و تشہیر دروغ!

اور مرغزن کے شہر ارجمند میں ایک بات اور بھی ہے ۔ یہاں جھوٹ نہیں بولا جاتا پروپیگنڈا، ایک دوسرے کے خلاف نہیں کیا جاتا۔ نہ "قرطاس ابیض" شائع ہوتا ہے ۔ نہ "قرطاس اسود"!

نے بہ بازاراں ز بےکاراں فروغ
نے صدا ہائے گدایاں درد گوش

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں بازاروں میں بےکاروں اور بےروزگاروں کے جلوس نہیں نکلتے۔ روٹی اور روزی کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ اس لئے کہ جب کوئی بےکار ہی نہیں ہے۔ بےروزگار ہی نہیں ہے تو مطالبہ کیا کیا جائے؟ اور جلوس کیوں نکالا جائے۔

ایک بات اور بھی ہے ۔ سوسائٹی اتنی آسودہ، فارغ البال اور مطمئن ہے کہ یہاں کوئی فقیر بھی نہیں ہے جس کی صدائیں درد گوش ہوتی ہیں اس لئے کہ یہاں کا نظام امیر و غریب اور شاہ و گدا کی اپنے اندر گنجائش ہی نہیں رکھتا۔ یہاں سب برابر ہیں اور بڑے چین کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

---

(۸۸)

نوائے شوق

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں، بتکدۂ صفات میں!

•

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیّلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلّیات میں

•

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

•

گاہ مری نگاہ، تیز چیر گئی دلِ وجود!
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں

•

یہ بالِ جبریل کا حرفِ آغاز ہے ـــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان خوشنما، سبک، سادہ اور دل نشین الفاظ میں، اقبال نے اپنے موقلم سے، اپنے افکار و خیالات کی تصویر بڑی کامیابی اور دل آویزی سے نہیں کھینچ دی ہے!

(۸۹)

نوائے عاشقانہ

خدا سے :

میں ہوں صدف تو ترے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف، تو، تو مجھے گوہرِ شاہوار کر

•

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی!
مری دنیا فغانِ صبح گاہی!
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری پادشاہی!

•

اپنے بارے میں :
فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کا دولتِ پرویز ہے ساقی

•

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانہ میں!
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

سوزِ آرزو

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

میں خود:

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری!
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

•

شکایت ہم صفیر

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

جدید کی جستجو:

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو جو ہو ابھی نوخیز

•

دلِ غمیں

دلِ غمیں کے موافق نہیں ہے موسمِ گل
صدائے مرغِ چمن ہے بہت نشاط انگیز

•

درویشِ خدامست:

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں، نہ سمرقند

•

شانِ قلندری:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق!
نے ابلۂ مسجد ہوں، تہذیب کا فرزند!

•

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

•

بندۂ مومن!

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند!

•

پرسوز و نظرباز و نکوبیں و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خرسند

•

ذوقِ شکرخند:

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرّم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

•

ید بیضا:

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشہ کو بخشی سختیٔ خارا

•

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں ابتک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

•

چنگاری:

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

•

میں:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

•

نوادر میں:

تو کفِ خاک و بے بصر، میں کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں؟

•

خارا شگافی

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

•

میں کیا ہوں؟

کھلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری!
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

•

داستاں نویس

اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور
میں خود کہوں تو میری داستاں دراز نہیں

•

میرا مذہب:-

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

•

کچھ اپنے متعلق

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

•

کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی

•

جنوں!

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا میرا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

•

میرا حلقۂ سخن

مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی

•

خودی کی موت

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

•

نوائے پریشاں

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ!
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ!

•

افسانۂ دل

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیم سحر!
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

•

دردِ آشنا

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی دردآشنا باقی

•

دردِ مہجوری

کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری

•

نکتہ ہائے خودی

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ!
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

•

شعلۂ نوا

اندھیری شب ہے جدا، اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل!

●

آئینۂ ادراک

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

●

نالۂ بیباک

نہ ستارے میں ہے نے گردشِ افلاک میں ہے
میری تقدیر مرے نالۂ بیباک میں ہے

●

بادۂ ناب

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

●

رموزِ قلندری

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسۂ و خانقاہ ہو آزاد!

●

اقبالؔ کے خلاف فرشتوں کی غمّازی

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی!

•

صلۂ نوا

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر
مرغِ چمن ـــــ ہے یہی تیری نوا کا صلہ

•

عارف و عامی پر میرا اثر

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی!
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی

•

جامۂ احرام

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج!
کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی

•

دُرِّ ناب

میں نے پایا ہے اسے اشکِ سحر گاہی میں
جس دُرِّ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش

•

فکرِ بلند!

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند!
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی!

•

فقیہانِ شہر:

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے!
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

•

نے نوازی:

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی!
نفس ہندی، مقام نغمہ تازی!
نگہ آلودۂ انداز افرنگ!
طبیعت غزنوی، قسمت ایازی!

•

افکار:

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

•

عتابِ ملوک

اسی خطا پہ عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے!

•

انقلاب:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب!

•

احتسابِ عمل:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

•

نقشِ ناتمام:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

•

میری سرگذشت

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

•

نشو و نمائے آرزو:

بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو

•

میرا عشق، میری نظر:
(خدا سے خطاب)

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

•

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے

•

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

•

بے خوابیاں، بے تابیاں
(خدا سے التجا)

بتا مجھ کو اسرارِ مرگِ حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

•

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں!
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

•

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

•

امنگیں مری، آرزوئیں مری!
امیدیں مری، جستجوئیں مری!

•

مری فطرت آئینۂ روزگار!
غزالانِ افکار کا مرغزار

•

مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کا لشکر، یقیں کا ثبات

•

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر!
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

•

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

•

غریبی میں نام پیدا کر
(جاوید کے نام)

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے!
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

•

خانقاہ!

رمز و ایماں اس زمانہ کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

•

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

•

جوشِ جنوں

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا
یہ شعر نشاط آور و پرسوز و طرب ناک
میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

میری فطرت:

فطرت مری مانندِ نسیمِ سحری ہے
رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز

•

پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالۂ و گل کو
کرتا ہوں سرِ خار کو سوزن کی طرح تیز

•

میری آرزو:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

•

وارداتِ نو بہ نو

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات

•

تلخ نوائی:

(مسلمان سے خطاب)

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر!
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

•

مشعلِ راہ

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک
جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

•

دانشِ حاضر:

علاجِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

•

سیلِ معانی

خلوت کی گھڑی گزری جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

•

(۹۰)

شعلۂ بے باک

عطا ہوا خس و خاشاکِ ایشیا مجھ کو
کہ میرے شعلہ میں ہے سرکشی و بیباکی

•

عہدِ حاضر کے خلاف میں نے اعلانِ جنگ کیا ہے۔ یہ عہد خدا فراموشی کا ہے۔ نفس پرستی کا ہے۔ باطل نوازی کا ہے۔ اس نے اقدارِ حیات بدل دیئے ہیں، خوب کو زشت کر دیا ہے۔ زشت کو خوب بنا دیا ہے، گناہ اس کے نزدیک ثواب ہے اور ثواب اس کی نگاہ میں معصیت، حیا کو یہ بے حیائی سمجھتا ہے اور بے حیائی کا نام اس نے عشوہ داد رکھا ہے۔ عورتوں کو کلب کی زندگی بھا گئی ہے۔ وہ مادریت سے محرومی کو اپنی زندگی کا شعار بنا چکی ہیں۔ مردوں کو، شب گردی پسند آ گئی ہے۔ وہ گھر چھوڑ کر، شبستانِ عیش میں رات کی گھڑیاں گزارتے ہیں۔ جو مجاہد تھے، اب گوشہ نشین بن چکے ہیں جو غازی تھے انھوں نے تلوار میان میں رکھ لی ہے۔

قدرت نے مجھے قلم دیا ہے کہ میں اس کثافت کو لطافت سے بدل دوں اور یہ کثافت دور نہیں ہو سکتی جب تک اسے بھٹی میں تپایا نہ جائے۔ آگ میں جلایا نہ جائے۔ لہٰذا قدرت نے مجھے خس و خاشاکِ اشیا مرحمت فرمایا ہے جس میں ذرا سی چنگاری آگ قبول کرنے کی، شعلہ بننے کی، اور سب کچھ پھونک دینے کی صلاحیت ہے اور میرے پاس چنگاری نہیں، شعلہ ہے، اور وہ شعلہ بھی کیسا؟ سرکش اور بے باک، جس میں یہ طاقت ہے کہ

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

فروغِ جاوداں ممکن نہیں جب تک، میرا شعلۂ بے باک و سرکش، ہر طرح کی کثافت کو جلا کر خاک نہ کر دے۔

متاعِ دیدۂ تر

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
لے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے
قافلے میں غیرِ فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

(۹۱)

پیام

حقائقِ حیات:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

•

حقائقِ حیات سے فرار نہ اختیار کر، ان کا مقابلہ کر جب تک یہ صلاحیت تجھ میں پیدا نہیں ہوتی، تیرا جسمِ ناتواں، حقائق کی سنگینی کا حریف نہیں بن سکتا۔

•

میدانِ جنگ:

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

•

یہ وقت۔ کشمکش اور کشاکش کا ہے۔ جہد للحیات اور تنازع للبقا کا ہے، تو آسودگی اور عافیت ڈھونڈتا ہے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو میدان میں آ، اور دشمن سے مقابلہ کر۔ میدانِ جنگ میں بیٹھ کر جو تلوار کی جھنکار کے بجائے، لوائے جنگ سے جی بہلانے کی کوشش کرے گا، دنیا اس پر ہنسے گی اور اس کا انجام موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

•

قاضی الحاجات:

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں

•

تونگری سب سے بڑی گدائی ہے۔ فقر اصل بادشاہت ہے، جب تک تو یہ حقیقت نہ محسوس کرلے مسلمان نہیں بن سکتا۔

•

قلندر اور سکندر:

اگر جواں ہوں میری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

•

میری قوم کے نوجوان، اگر جسور و غیور ہوں، ان میں ہمت اور حوصلہ ہو۔ وہ اپنے ماضی سے واقف ہوں اور اپنے مستقبل سے ماضی کو مربوط

رکھنا چاہتے ہوں تو میری قلندری سے سبق لیں، جو نہ صرف یہ کہ سکندری سے کم نہیں بلکہ اس سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ سکندر نے شہر فتح کیے تھے۔ جسموں پر حکومت کی تھی۔ میں نے دل فتح کئے ہیں۔ روح پر حکومت کرتا ہوں۔

•

شبنم اور نسیم:

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی!
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم!

•

صرف مادہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ قدرت کی کار فرمائیاں ہی سب کچھ ہیں۔ مادہ اگر رُوح سے بے نیاز ہو تو وہ جامد ہے۔ تخلیق میں اگر لطف بھی شامل نہ ہو تو وہ پیکرِ ہستی اختیار ہی نہیں کر سکتی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ غنچہ جو چمن میں بالیدگیٔ نظر کا سامان بنا ہوا ہے، اپنی تشکیل و تخلیق میں، جس طرح نسیم بہاری کا ممنون ہے اسی طرح قطرۂ شبنم سے بھی اس کی آبرو ہے۔

•

علم:

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ کلیم!

علم کے لئے نظر اور خرد، لازم و ملزوم ہیں۔ مشاہداتِ کلیم کے ساتھ تجلیاتِ کلیم بھی ضروری ہیں۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

علم وہ ہے، جس میں تمہارے مشاہدات و تجارب، علمِ الٰہی سے ہم آہنگ ہوں۔

فقرِ غیور:

اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی رُوحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

•

اے مسلمان!

تیری پستی اور انحطاط کا دَور ختم ہوا، دنیا نے دانشِ افرنگ کی جگمگاہٹ دیکھ کر دینِ الٰہی ترک کر دیا تھا اور دینِ مادّی اختیار کر لیا تھا، لیکن چونکہ اس کی بنیاد، سونے چاندی کی ہوس پر تھی، جوع الارض اور جوع البقر پر تھی اس لئے یہ قائم نہ رہ سکی۔ اس کا چہرۂ زشت، چشمِ حقیقت بین نے دیکھ لیا۔ یہ دور اب رخصت ہو رہا ہے اور تیرا دور شروع ہونے کو ہے۔

مرضِ کہن کا چارہ:

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ترا بحر پر سکوں ہے، یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں، نہ خرابیٔ کنارہ

•

دل اگر مُردہ ہو جائے تو دل نہیں رہتا صرف مضغۂ گوشت رہ جاتا ہے۔ اسے زندہ کر اس پر موت کبھی طاری نہیں ہوتی ہاں غفلت طاری ہو سکتی ہے۔ اسے جھنجوڑ۔ یہ غفلت ابھی دور ہو جائے گی۔

امتوں اور ملتوں کے امراض کا بھی ایک دیرینہ اور کامیاب نسخہ ہے۔ اس پر عمل کر کے وہ حیاتِ نو سے آشنا ہو سکتی ہیں اور اسے نظر انداز کر کے صرف موت ہی کو دعوت دے سکتی ہیں۔ بقول شاعر:

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبادت ہے تیرے جینے سے

اور ہاں، تیری زندگی کے سمندر میں فلک فرسا موجیں کیوں نہیں اٹھتیں؟ اس میں سکوت و سکون کیوں ہے؟ سکون، موت ہے۔ حرکت زندگی ہے۔ یہ تجھ پر جو سکوت چھایا ہوا ہے۔ یہ موت کا پیغامبر ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ، نہ طوفان سے تو الجھتا ہے۔ نہ نہنگوں کو ٹوکتا ہے۔ نہ خرابیٔ کنارہ تیری ہمت میں استحکام پیدا کرتی ہے ـــــ یہ اندازِ زندگی بدل ڈال۔

•

کشمکشِ حیات
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی!!

اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

•

مرد کا کام کشمکش میں حصہ لینا ہے۔ آرام اور عافیت اختیار کر کے گوشہ نشین ہو جانا نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا خطرہ، بڑی سے بڑی مشکل، بڑی سے بڑی مصیبت کوئی چیز بھی اسے ہراساں نہیں کر سکتی۔ اس کے عزم و عمل پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس کی استقامت میں تزلزل نہیں پیدا کر سکتی۔ اس کے ثبات و تہور میں کمزوری کا شائبہ بھی نہیں دے سکتی۔ تو اگر مرد ہے تو کشمکشِ زندگی سے راہِ فرار نہ اختیار کر میدان میں آ۔ اور اس کشمکش میں مردانہ وار حصہ لے، جو لوگ اس کشمکش سے بھاگتے ہیں انہیں شکست قبول کرنا پڑتی ہے۔ اور کارگاہِ حیات میں جو مرد شکست قبول کر لے اس نے گویا اپنے محضرِ قتل پر دستخط کر دیئے۔ وہ لاکھ سانس لے لیکن اس کا شمار زندوں میں نہیں ہو سکتا۔

•

فقر و راہبی:

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی!

تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی!

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ تیرا اسلام، اہلِ اسلام سے کچھ مختلف ہے۔ اسلام کا فقر تسخیرِ کائنات کی دعوت دیتا ہے اور رہبانیت ترکِ دنیا کی تعلیم دیتی ہے اور تو نے اپنی عقلمندی سے اسلام کے فقر اور دوسروں کی رہبانیت کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ یہ تو بیماری ہے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
لیکن اس کی دارو بھی موجود ہے۔
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

•

سکون و طوفان!

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی!

راہب، پہاڑ کی کھوہ میں، جنگل بیابان میں۔ پہاڑ کی چوٹی پر، گم صم، اکیلا اور تنہا بیٹھ جاتا ہے اور اس کو اپنی معراج سمجھتا ہے لیکن اسلام کا فقر مسلمان کو سکھاتا ہے۔ متلاطم اور پرشور موجوں سے جنگ، طوفان سے ٹکر، وہ ہار نہیں مانتا۔ کارزارِ حیات میں ڈٹا رہتا ہے لہٰذا اس کا سفینہ ہمیشہ طوفانوں سے الجھتا رہتا ہے وہ کبھی راہب کی طرح آشنائے سکون نہیں ہوتا تو بھی مسلمان ہے، لہٰذا وہی فقر اختیار کر جو تجھ میں شوکت و سطوت پیدا کرے جو تجھ میں طوفانوں، اور یلغاروں کا مقابلہ کرنے کی ہمت دے، ترکِ دنیا تو ایک طرح سے شکست کا قبول کر لینا ہے۔ ناکامی کا اعتراف کر لینا ہے۔

•

بلا تبصرہ:

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ

وہی نگاہ ہے ناخوب و خوب سے محرم
وہی ہے دل کے حلال و حرام سے آگاہ

•

کارسازی:

ترے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا
کہ سکھا سکے خرد کو، رہ و رسم شاہبازی

•

درویش کی بات:

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن!
شیخ و ملا کو بری لگتی ہے درویش کی بات!
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات

•

ربط و نظام!

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

•

تعلیم جدید:

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

•

مدرسہ:

مدرسہ نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو!
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

•

ادب و دیں:

ہوتی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی!
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

•

ضمیرِ وجود

جبینِ بندۂ حق میں نمود ہے جس کی!
اسی جلال سے لبریز ہے ضمیرِ وجود!

•

ساحل کی سوغات:

دریا میں موتی، اے موجِ بے باک
ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک

•

تاثیرِ افلاک:

تیرا زمانہ — تاثیر تیری!
ناداں نہیں یہ تاثیرِ افلاک

•

مقاماتِ وجود:

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے، کیا ہیں مقاماتِ وجود

•

تعمیرِ خودی:

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

•

صاحبِ دل:

کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے

•

تختِ جم و کے:

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے!
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

•

نغمہ

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں

•

فیضِ مکاتب

جسور و زیرک و پُر دم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمۂ جاری

•

متعدد مواقع پر اقبال بتا چکے ہیں کہ عہدِ حاضر کے یہ مدرسے اور دانش گاہیں، ایک بیکار سے مقام ہیں جس سے فائدہ کچھ نہیں پہنچتا، نقصان غیر معمولی پہنچ جاتا ہے۔ ان مدرسوں میں نہ آزادیٔ افکار ہے نہ شوخیٔ افکار، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ، لیکن جو لوگ ان "مدرسوں" کی لعنت سے محفوظ ہیں ان کا کردار بے داغ ہے۔ ان کی سیرت بے لوث ہے۔ ان کی شخصیت پر سوز و طربناک ہے۔ حجاز میں ابھی تک تہذیبِ فرنگ نہیں پہنچی ہے، اور وہاں کے بارے میں،

نظر وران فرنگ کا ہے یہی فتوےٰ
وہ سرزمیں مدنیت سے ہے ابھی عاری

بے شک وہ سرزمینِ مدنیت سے عاری ہے لیکن وہاں کے بدو بچے کا مقابل ہے کوئی جو جسور و زیرک و پُر دم ہونے کا

دعویٰ کرسکے۔

•

مسجد اور مندر

یہ آیۂ نو جیل سے نازل ہوئی مجھ پرا
گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
کیا خوب ہوئی آشتی شیخ و برہمن
اس جنگ میں آخر نہ یہ ہارا نہ وہ جیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے "بدری"
مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے "مسیتا"

---

(۹۲)

ترکِ اقبالؔ

میرا گناہ:

ترا گناہ ہے اقبالؔ مجلس آرائی!
اگرچہ تو ہے مثالِ زمانہ کم پیوند!

•

میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے اپنا ایک حلقۂ سخن بنا لیا ہے اور اس میں بیٹھ کر عہدِ حاضر کی فریب کاریوں اور طلسم بندیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا رہتا ہوں۔ اور کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو میری بات سنتے ہیں۔ اس پر کان دھرتے ہیں اور صف بستہ ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

•

جذبۂ بلند:

جو کو کنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو!

تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند

•

جو امیوں کی پینک میں پڑے اونگھتے رہتے تھے، اور پورے طور پر حقائق حیات سے راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔ انہیں میں نے وہ ذوقِ بلند بخشا کہ وہ رفعت میں ثریا کے ہم دوش ہو گئے۔

•

نتیجہ لوا:

تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے
وہ پر شکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خورسند

•

یہ میری لوا کا نتیجہ ہے کہ، غلاموں میں جذبہ حریت پیدا ہو گیا۔ جو غلامی پر قناعت اختیار کر چکے تھے، جنھوں نے خواری اور ذلت کی زندگی اختیار کر لی تھی، جو اپنی شکستہ پری پر خورسند اور مسرور تھے۔ وہ فضائے نیل گوں میں اُڑنے کے لئے بے تاب ہو گئے۔ ان میں شوقِ پرواز پیدا ہو گیا۔

•

قلندری اور تونگری:

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکارا ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

•

اگر دنیا میں میرا جوہر آشکارا ہوا ہے، لوگ مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، میری قدر و منزلت کرتے ہیں۔ میری عظمت اور بڑائی کے قائل ہیں تو کیوں؟ کیا اس لئے کہ میں تونگر ہوں؟ یہ بات نہیں، میرے پاس کچھ نہیں، قلندرانہ زندگی بسر کرتا ہوں، لیکن ہاں ایک بات ضرور ہے، زر و دولت پر للچائی ہوئی نظر نہیں ڈالتا، ایمان اور ضمیر کا سودا نہیں کرتا۔ یہی قلندری ہے اور اسی نے مجھے سربلند کیا ہے۔ یہی میرا جوہر ہے اور اسی پر مجھے ناز ہے۔

•

ولولۂ تازہ

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند

•

ان مردہ دلوں کو میں نے زندگی اور زندگی کی حرارت سے معمور کر دیا ہے۔ یہ سو رہے تھے میں نے انھیں بیدار کر دیا، ان پر موت طاری ہو رہی تھی میں نے انہیں حیاتِ نو سے آشنا کیا۔ کسی ایک مقام پر نہیں، ہر جگہ، ہر اس جگہ جہاں مسلمان موجود تھے، خواہ وہ عرب ہو یا عجم!

میرے کلام کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ خزاں کے عالم میں بھی مرغانِ سحر

خواں، میری صحبت میں آکر، خوش و خرم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ میں انہیں بہار کی طراوت، شگفتگی اور تازگی و رعنائی عطا کرتا ہوں۔

•

غلامی:

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

•

لیکن میرے رب، تو نے مجھے وہ وطن دیا ہے، جہاں کے لوگ میرے پیام کی قدر نہیں کرتے۔ میں تیری طرف بلاتا ہوں۔ وہ اصنامِ خیالی سے رجوع کرتے ہیں۔ میں حق کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ باطل سے سمجھوتہ کرتے ہیں۔ میں آزادی کی نوید سناتا ہوں۔ وہ غلامی پہ فخر کرتے ہیں۔

•

موجِ نسیم:

عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پر حرام
کہ گرہ غنچہ کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم

•

جب تک میں، حقیقت سے ناواقف تھا، چپ تھا، خاموش تھا، لیکن جب سے رمز آشنا کے حق و حقیقت سے آگاہ ہوا ہوں ضبطِ سخن میرے

لئے ناممکن ہوگیا ہے۔ جس طرح غنچہ موجِ نسیم سے لذّت آشنا ہونے کے بعد غنچہ نہیں رہ سکتا کھلتا اور پھول بن جاتا ہے۔ اسی طرح عشق و مستی نے مجھے تکلّم، اور خروش عطا کیا ہے۔ اب میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ اگر اب بھی خاموش رہوں تو یہ فطرت کے خلاف ایک طرح کا اعلانِ جنگ ہوگا۔ نوامیں فطرت سے بغاوت ہوگی اور جو لوگ اس میں فطرت سے بغاوت کرتے ہیں وہ کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے ان کے واسطے ہلاکت ہے۔ تباہی ہے، بربادی، اور رسوائی ہے!

•

فروغِ صبح:

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری!
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

•

میرے اندازِ تکلّم کو اگر تو پریشان دیکھتا ہے تو اس پر حیرت کیوں؟۔ فروغِ صبح کو دیکھ، اگر یہ پریشان نہ ہو تو کیا رہ جائے۔

•

شوخیٔ نظّارہ:

ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاکِ بے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ
نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا

جسے آگئی میسّر، مری شوخیٔ نظارہ!

•

میرا احسان مان ــــ جو شرارہ میری زندگی کا حاصل تھا۔ اسے میں نے تیرے نیستان میں ڈال دیا ہے۔ اب یہ چنگاری بھڑکتی ہوئی آگ بن جائے گی۔ اور تو خاشاکِ غیر اللہ کو جلا کر خاکستر کر سکے گا۔

اگر تو چاہتا ہے کہ اس جہانِ رنگ و بو اور عالمِ دوش و فردا کے اسرار و رموز سے واقف ہو، تو اس کی ایک ہی صورت ہے، یہ کہ میری شوخیٔ نظارہ حاصل کر، وہ آنکھ پیدا کر جو تجھ میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی پیدا کر دے، جو تیری فکر و نظر میں وسعت پیدا کر دے، تب ہی تو واقفِ اسرار و رموز ہو سکتا ہے اور دنیا کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے اور یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں، تو مسلمان ہے اور مسلمان کے معنی، تاریخِ ماضی کے اوراق میں یہ لکھے ہیں کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، اس کا عزم، اس کا عمل جہاں کشا ہے، جہاں گیر ہے!

•

بلا تبصرہ!

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا!
آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے
خاموشیٔ افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدی و پہنائی افلاک نہیں ہے

میری پونجی:

تیری متاعِ حیات علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات ایک دلِ ناصبور
ایک زمانہ سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں میرے جنوں کا قصور

●

تکفیر:

نہ میں اعجمی نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
تو مری نظر میں کافر، میں تری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گزاری

●

علمِ خودی:

اقبالؔ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا!
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

●

ہم عناں:

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

●

اپنے شعر سے:

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا!
تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش
شعلے سے ٹوٹ کے مثلِ شرر آوارہ نہ رہے
کر کسی سینۂ پُر سوز میں خلوت کی تلاش

•

ذکر و فکر، جذب و سرود:

مقابلہ تو زمانہ کا خوب کرتا ہوں
اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں نے امیرِ جنود!
مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود

•

جوہر:

میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک

•

مردِ قلندر:

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ، وہی آش

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش!

•

زورِ حیدری:

مرے لئے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی!
کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

•

شعلۂ سرکش:

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ!
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

•

سرودِ حرام:

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرود
نہ میرا فکر ہے پیمانۂ ثواب و عذاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

•

مرحلۂ شوق

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی!
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

•

حسرت:

پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں
کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں

میں نے ساری دنیا چھان ڈالی، مغرب میں بھی گھوما، مشرق کی بھی سیر کی، روحانیت کے علمبرداروں کو بھی دیکھا۔ مادہ پرستاروں کی بھی زیارت کی، لیکن کہیں بھی عشق کی چنگاری سلگتی ہوئی نہیں دکھائی دی۔ صحنِ چمن میں گلِ لالہ موجود ہے اس میں داغ بھی ہے، لیکن یہ داغ صرف داغ ہے۔ شعلہ نہیں، چنگاری بھی نہیں، اور زندگی عبارت ہے۔ صرف شعلۂ سرکش سے۔

•

دار و رسن:

مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

میری خودی کو اگر "سزا" دینا چاہتے ہو، تو کم از کم یہ تو کرو کہ دار و رسن کا بندوبست کر دو۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

بتاؤ، یہ چیز بھی ہے تمہارے پاس؟

عناصرِ حیات

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی!
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں!
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں!

•

زندگی ایک ٹھوس اور سنگین حقیقت ہے۔ یہ کوئی نظریہ، یا تصوّر نہیں ہے، جسے ہم جب چاہیں ٹھکرا دیں اور بدل ڈالیں۔ اس کی بنیاد ایسے حقائق پر قائم ہے جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، جو اٹل ہیں۔ جنھیں خدا کے سوا کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہ افلاطون کا کوئی مقالہ نہیں جس کے الفاظ کی داد دے لو۔ جس کے مفہوم پر سر دھن لو۔ یہ حقیقت ہے۔ اس سے تم ٹکرا نہیں سکتے۔ بچ نہیں سکتے، لہٰذا اس کے صحیح عناصر سے اسے زینت دو، اور وہ ہیں:

(۱) روح القدس کا ذوقِ جمال ـــــ روحانیت
(۲) عجم کا حسنِ طبیعت ـــــ دیدہ دری اور نکتہ سنجی
(۳) عرب کا سوزِ دروں ـــــ اخلاصِ ایمان

•

حکمِ اذاں:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں!
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ اِلّا اللّٰہ!

•

میں جانتا ہوں میری قوم میں ایسے لوگ بہت کافی ہیں جو منافق ہیں، جو دوستی کا دعویٰ کر کے دشمنی کرتے ہیں، جو قوم میں شامل ہیں، لیکن عملاً اور حقیقتہً قوم کے دشمن ہیں۔ یہ قوم کے خلاف مصروفِ عمل رہتے ہیں اور چاہتے ہیں۔ میں بھی انہی جیسا بن جاؤں۔ لیکن میں ان کی حقیقت سے واقف ہوں میں اپنا کام کرتا رہوں گا، خدا کے سوا نہ کسی کے آگے سر جھکاؤں گا نہ کسی در پر حاضری دوں گا۔

سوزِ قطرۂ اشک

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں
نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں
سکوں ناآشنا رہنا اسے سامانِ ہستی سے
تڑپ کس دل کی یا رب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں
صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

(۹۳)

حقائق و معارف

اقبالؔ وہی حقائق و معارف زبان پر لاتے ہیں۔ جنھیں وہ پرکھ چکے ہیں، جو ان کے مشاہدات میں آچکے ہیں۔ وہ بندۂ تخمین و ظن نہیں ہیں۔ ان کی نگاہ گہری ہے۔ فراست ان کا جوہر ہے، بصیرت ان کا کمال ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ صرف انہی حقائق سے بحث کرتے ہیں جنھیں وہ اپنے دل کے آئینہ میں تابناک اور درخشاں دیکھ لیتے ہیں۔ سنئے:

نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

•

کوئی کام بھی ہو، خواہ وہ نغمہ طرازی ہو یا غزل سرائی، اس میں خلوص ہونا چاہیئے۔ اگر خلوص نہیں ہے۔ ضمیر پاک نہیں ہے تو نغمہ جیسی دل نشین چیز بھی زہر ہے۔

•

نغمۂ جبریل اور صورِ اسرافیل:

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل

میں نہیں جانتا، شعر کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ اس کی ترکیب کیا ہے؟ اس کا سحر کیا ہے، البتہ ایک بات جانتا ہوں، اور اس کی صداقت پر تاریخ گواہ ہے،

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

•

جس شعر میں، حیاتِ ابدی کا نغمہ ہو، وہ یا تو نغمۂ جبریل ہے، یا بانگِ سرافیل،

نغمۂ جبریل سے حیات آفریں، خلاقِ معانی، رہنمائے طریقت، بانگِ سرافیل سے مراد، وہ نفخِ صور جس سے مُردے بھی زندہ ہو جائیں گے ۔

•

سلطانئ جاوید:

غواص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی!
لیکن مجھے اعماقِ سیاست سے ہے پرہیز
فطرت کو گوارا نہیں سُلطانئ جاوید
ہر چند کہ یہ شعبدہ بازی ہے دل آویز

فرہاد کی خارا شگنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

•

فطرت نے مجھے نگاہ تیز دی ہے۔ میں دلِ وجود کو چیر کر دیکھ لیتا ہوں اس میں کیا ہے؟ لیکن یہ سیاست بازی مجھے پسند نہیں آتی اس لئے کہ جانتا ہوں اس میں رکھا ہی کیا ہے؟ کل ہٹلر کا ڈنکا بج رہا ہے لیکن آج اس کا نشانِ گور بھی نہیں ملتا۔ مسولینی کے نام سے دنیا کانپتی تھی۔ لیکن اس کو "یلی پوشوں" نے اسے ہلاک کیا۔ اسٹالن خدا کی طرح اپنی قوم میں پوجا جاتا تھا، لیکن آج اس کے جانشین، اس کے بنائے ہوئے اور چڑھائے ہوئے لوگ، اسے گالیاں دے رہے ہیں۔ اس کے معائب بیان کر رہے ہیں۔ اس کی تصویریں اُتاری جا رہی ہیں۔ اس کے مجسّمے توڑے جا رہے ہیں۔ اس کا نام کھرچا جا رہا ہے۔ اس کی یادگاریں مٹائی جا رہی ہیں۔ یہ کھیل ہے سیاست کا۔ میرا تو دل اس سے تنگ ہے۔ میں اس میں کسی طرح کی جاذبیت اور کشش محسوس نہیں کرتا۔

اور یہ صرف میرا خیال ہی نہیں ایک سنگین حقیقت ہے، جس کی صداقت پر قدرت کے فیصلے گواہ ہیں۔ قدرت سلطانی جاوید کو پسند نہیں کرتی۔ کتنی بڑی بڑی حکومتیں بنیں اور مٹ گئیں۔ جب ان کا آفتابِ اقبال نصف النہار پر تھا۔ دنیا ان کے سامنے سجدہ ریز تھی اور جب وہ آغوشِ مرگ میں پہنچیں تو ان پر ماتم کرنے کے لئے کسی کے ہاتھ سینہ تک نہ گئے حرفِ غلط کی طرح انہیں قدرت نے مٹا دیا۔ حرفِ غلط کی طرح دنیا نے انہیں فراموش کر دیا۔

لہٰذا میری یہ رائے فطرت کے منشا اور فیصلہ کے عین مطابق ہے۔ اگرچہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سلطانیٔ جاوید قائم کرلیں، اس لئے تلواریں چمکتی اور توپیں چلتی ہیں۔ لیکن آج تک کوئی اس میں کامیاب نہیں۔ ان کوششوں پر قدرت ہنستی ہے۔ اس لئے کہ یہ "تقدیر" بالکل اٹل ہے اس کی بنائی ہوئی ہے کہ سلطانیٔ جاوید ایک غلط اور ناقابلِ عمل تخیل ہے۔ ایسا آج تک نہیں ہوا، اور ایسا قیامت تک نہیں ہوگا۔

ہاں ایک بات ضرور ہے۔ قدرت سلطانیٔ جاوید کی تو قائل نہیں، لیکن نقشِ جاوید کی قائل ہے۔ وہ سلطنتیں، اور حکومتیں مٹاتی رہتی ہے۔ بادشاہوں اور سلطانوں کو گور میں سلاتی رہتی ہے۔ یا تو نوبت اور نقاروں کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، یا موت کا سناٹا چھا جاتا ہے۔

گلشن میں کہیں بوئے دم ساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی!

لیکن ذاتی اور شخصی طور پر، انسان اپنی جد و جہد، سعی و کوشش اور طلب و تحریک سے جو نقوش قائم کرتا ہے انہیں نہ صرف یہ کہ قدرت مٹاتی نہیں، بلکہ ان کی حفاظت کرتی ہے۔ انہیں محفوظ رکھتی ہے۔ فرعون مٹ گئے۔ لیکن اہرام جو اب تک موجود ہیں، جہانگیر کی حکومت اب کہاں ہے، لیکن عدلِ جہانگیری اب تک زندہ ہے، شاہجہاں کو موت قیدخانہ میں نصیب ہوئی، لیکن اس کی متاعِ ہنر، تاج محل، دنیا میں اب تک قائم اور باقی ہے۔ اسپین میں کئی سو سال تک مسلمانوں نے حکومت کی وہ ختم ہوگئی۔ وہ

مسلمان بھی ختم ہو گئے۔ ان کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔ آج وہاں ان کا کوئی نام لیوا نہیں ہے لیکن مسجد اپنی شان و جلال کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ قصر زہرہ کی تابناکی اب بھی قائم ہے۔ قطب الدین ایبک ایک غلام تھا۔ تختِ حکومت پر بیٹھا اور موت کی نیند سو بھی گیا لیکن مسجد قوت الاسلام کا وہ پہلا منارہ جو اس نے خلوص سے تعمیر کیا تھا۔ آج تک کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔

یہ تو تھا، مادّی یادگاروں کا اور مادّی نقوش کا تذکرہ۔ لیکن انہیں بہر حال فنا ہے گو سلطانی جاوید کے مقابلہ میں بہر حال یہ جاوید ہیں۔

لیکن غیر مادّی نقوش یعنی انسان کے کارنامے، تو وہ کبھی نہیں مرتے۔ وہ ہمیشہ قائم اور باقی رہتے ہیں بلکہ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ان کی تابندگی، اور درخشانی بڑھتی ہی جاتی ہے۔

کربلا کا معرکۂ قتال، مدت ہوئی ختم ہو گیا۔ لیکن حسین ابنِ علیؓ کی قربانی بھی کیا قیامت ختم ہو سکتی ہے؟

جنگِ صلیبی کو ختم ہوئے صدیاں بیت گئیں، لیکن اس لڑائی میں صلاح الدین نے جس بے جگری، جس بے نفسی، جس ادا داری، جس وسعتِ قلب کا ایک سچّے اور کھرے مسلمان کی حیثیت سے مظاہرہ کیا تھا کیا اسے بھی زوال آیا؟

برطانوی حکومت ۱۸۵۷ء کے ہولناک غدر کے بعد کس دھوم دھام، جاہ و جلال اور کرّوفر کے ساتھ قائم ہوئی تھی۔ سو سال تک وہ اسی آن بان

کے ساتھ قائم رہی، لیکن غدر کے زمانے میں جن بے نواؤں اور بوریہ نشینوں نے، جب نہتوں اور کم مایہ لوگوں نے استعمارِ فرنگ کا مقابلہ کیا تھا۔ کیا حکومت برطانیہ کی طرح وہ بھی افسانۂ پارینہ بن گئے؟ کیا ان کی یاد بھی دلوں سے مٹ گئی؟ آج ہندوستان میں دَورِ غدر کے فرنگی مجسّمے اتارے جا رہے ہیں اور ان بہادروں کے مجسّمے ان کی جگہ لے رہے ہیں جنھوں نے یہ لڑائی لڑی تھی۔ آج حکومت مجاہدوں کے نشانات چھپا رہی ہے لیکن جب قدرت کے قانون کے مطابق، اپنے وقت پر اصولِ فطرت کے مطابق یہ حکومت بنے گی تو ان فراموش شدہ لوگوں کو بھی یاد کیا جائے گا۔ ان کی بھی یادگاریں قائم کی جائیں گی، بھولنے والے انھیں بھی یاد کریں گے۔ اس لئے کہ خونِ جگر سے جس کارنامے کی تعمیر ہوتی ہے وہ کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ فطرت اس کی خود نگہبانی کرتی ہے۔ دیکھو پرویز کی سلطنت کو مٹے ہوئے کئی جگ بیت گئے، لیکن فرہاد کا نام آج بھی عظمت اور اعزاز کے ساتھ ہر زبان پر ہے۔ نہ اسے کھرچا جا سکتا ہے نہ مٹایا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے اس شعر کی اگر واقعات وحقائق اور تاریخی شواہد کی روشنی میں تفسیر کی جائے تو ایک دفترِ بے پایاں تیار ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر اقبال کے اس نظریہ کی تائید ملے گی کہ قدرت سلطانی جاوید کو تو کسی حالت میں قائم نہیں رہنے دیتی لیکن لوگوں کے پرخلوص نقوش کو بڑی دیر تک، مدت مدید تک محفوظ رکھتی ہے۔ اتنی دیر تک جو سلطانی جاوید کے مقابلہ میں قطعاً غیر فانی ہوتے ہیں اور ان کی یادگاروں کے سوا جو شخصی اور ذاتی

کارنامے ہوتے ہیں وہ تو ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ ان پر موت کبھی طاری ہی نہیں ہو سکتی۔ وہ آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

•

سوز و سازِ حیات:

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت

ایشیا اور یورپ دونوں پر موت طاری ہے۔ اگرچہ اسبابِ موت مختلف ہیں۔ ایشیا اس لئے موت سے دوچار ہے کہ وہ خودی سے محروم ہو چکا ہے اور یورپ اس لئے موت کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے کہ اس کا ضمیر مر چکا ہے۔

•

تخیلِ ملکوتی

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

•

مشرق و مغرب:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری

جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری!

مشرق اور مغرب دونوں قلب و نظر کی رنجوری میں گرفتار ہیں۔ اگرچہ ہر جگہ کے اسباب و عوامل ایک دوسرے سے جداگانہ اور مختلف ہیں۔ مشرق کے قلب و نظر کا روگ یہ ہے کہ بے چارہ غلام ہے۔ تقلید میں مبتلا ہے اور دونوں چیزیں آزادی، فکر و آزادی خیال کی دشمن ہیں۔ پھر اگر وہ رنجوری قلب میں مبتلا ہو تو حیرت کیوں کیجیے؟ اور مغرب کی بیماری کا سبب یہ ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے "جمہوریت" پر اعتقاد رکھتا ہے جس کے بارے میں ایک دوسرے موقع پر اقبال نے کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے، جہاں

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

•

گلۂ تلخیٔ دوراں:

جو فقر ہوا تلخیٔ دوراں کا گلہ مند!
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی!

•

مرد فقیر:[له]

من نہ مُلّانے فقیہہ نکتہ ور!
نے مرا از فقر و درویشی خبر

له مثنوی مسافر صفحہ ۱۳۱۔

در رهِ دیں حیز بیں و سست گام
پختہ سر من خام و کارم ناتمام
تا دلی پر اضطرابم دادہ اند
یک گرہ از صد گرہ بکشادہ اند

•

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

•

میں نہ ملا ہوں کہ کٹ حجتی کروں۔ قال اقول اور قیل و قال کے چکر میں پڑا رہوں نہ فقیہہ ہوں کہ بال کی کھال نکالوں اور ذرا ذرا سی بات پر فتویٰ دینا شروع کر دوں اور بے بات کی بات میں بات پیدا کروں اور اپنی نکتہ دانی، حاضر دماغی اور دقیقہ سنجی کی داد لوں، میں اپنی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ اپنی خامیوں پر میری نظر ہے۔ دین کے معاملات کو خوب سمجھتا ہوں، لیکن عمل میں کچا ہوں۔ میری پختگی ابھی خام ہے، اور میرا کام ناتمام، ہاں ایک بات ضرور ہے۔ خدا نے مجھے ایک نعمت عطا فرمائی ہے اور وہ ہے دلِ پُر اضطراب، کم از کم میرے لئے تو یہ دولت کونین سے بڑھ کر ہے۔ یہ نہ ہوتی۔ تو میرے فکر و نظر کی دُنیا ویران اور سنسان رہتی۔ میری آہ میں اثر نہ ہوتا۔ میرا نالہ نارسا رہتا۔ میں دین

کی حقیقت نہ جانتا۔ میں سوزِ آرزو کی کیفیت سے بے خبر رہتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عشق و جنون کی کارفرمائی کا سرمایہ بھی مجھے نہ حاصل ہوتا۔

لہٰذا اے مسلمان نوجوان، میری تب و تاب میں تیرا جو حصّہ ہے اسے لے لے اور یاد رکھ میرے بعد مجھ جیسا مردِ فقیر تجھے نہیں ملے گا۔

(۴۹)

اپنا تعارف

یوں تو اقبال نے اپنے ہر مجموعۂ کلام میں اپنے افکار، اپنے مقاصد اور اپنی شخصیت کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے لیکن مثنوی اسرارِ خودی میں جس جامعیت اور خوبی کے ساتھ اپنا تعارف کرایا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ یہ شاعرانہ تعلّی نہیں بیانِ واقعہ ہے — چند اشعار آپ بھی سُن لیجیے۔

•

راہِ شب چوں مہرِ عالم تاب زد!
گریۂ من بر رُخِ گل آب زد!
اشکِ من از چشمِ نرگس خواب شست!
سبزہ از ہنگامہ ام بیدار رُست
باغباں زورِ کلامم آزمود!
مصرعے کارید و شمشیرے درو!

در چمن جز دانۂ اشکم نہ کشت!
تارِ افغانم بہ پودِ باغ اشت!
ذرّہ ام مہرِ منیر آنِ من است
صد سحر اندر گریبانِ من است
خاکِ من روشن تر از جامِ جم است
محرم از نازادہ ہائے عالم است
فکرم آں آہو سرِ فتراک بست
تو ہنوز از نیستی بیروں نہ جست
سبزہ تا رویدہ، زیبِ گلشنم
گل بہ شاخ اندر نہاں در دامنم
محفلِ رامش گری برہم زدم!
زخم بر تارِ رگِ عالم زدم!

•

میرے آنسوؤں کی آبیاری سے پھول نے رعنائی پائی۔
میرے گریۂ بے اختیار نے چشمِ نرگس سے نیند چھین لی اور سبزۂ خوابیدہ میری ہنگامہ آرائی سے بیدار ہو گیا؟
باغبان (خدائے کون و مکان) نے میرا دورِ کلام دیکھ کر، اس میں تندی اور سرکشی پیدا کر دی۔
میں نے اپنی ملّت کے چمن میں اپنے دانۂ اشک کے سوا کچھ

نہیں ہوا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

چٹہ چٹہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

باغ کی کلیاں اور شگوفے، ملت کے جوان، اور بوڑھے، میرے اشکِ سحرگاہی اور فغانِ شب کے راز دار اور محرمِ اسرار بن گئے۔

بے شک میں ایک ذرۂ ناچیز ہوں، لیکن اس کے باوجود، یہ مہرِ منیر، یہ آفتابِ عالمتاب میرے حلقہ کا اسیر ہے۔ سیکڑوں صبحیں میرے جیب و دامن میں پرورش پا رہی ہیں۔ میں امید کا پیام لے کر آیا ہوں اور اس پیامِ امید نے قوم میں ایک نئی زندگی اور ایک نئی امنگ پیدا کر دی ہے۔

ہاں میں خاک ہوں، لیکن میری خاک وہ ہے، جو جامِ جم سے زیادہ روشن اور تابناک ہے اور اس کی بصیرت کا یہ عالم ہے، جو باتیں اس دنیا میں ابھی رونما نہیں ہوئیں وہ بھی میرے علم میں ہیں۔

میری فکرِ بلند نے اس آہو کو اسیر کر لیا ہے۔ جو ابھی عدم سے وجود میں نہیں آیا ہے۔

وہ سبزہ جو ابھی اگا نہیں، میرے گلشنِ تخیل میں لہلہا رہا ہے۔ وہ پھول جو ابھی شاخ کے نشیمن میں پڑا سو رہا ہے۔ میرے دامن میں موجود ہے۔

میں نے محفلِ رامش گری درہم برہم کر دی ہے یعنی میرا پیام یہ ہے کہ،

وہ بادۂ شبینہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے، بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

میں نے محفلِ عیش و طرب کی بساط الٹ دی ہے اور دنیا میں اپنی

نے نوازی سے ایک نیا دَور پیدا کر دیا ہے۔

•

ان تمام اشعار کا مطلب یہ ہے کہ میں فراستِ مومن سے کام لے کر وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ ان حوادث کو محسوس کر رہا ہوں، وہ واقعات میرے علم میں آرہے ہیں، جو ابھی رونما نہیں ہوئے۔ میں ان سے اپنی قوم کو متنبہ کر رہا ہوں اور اسے آمادۂ عمل کر رہا ہوں تا کہ وہ خوابِ غفلت سے جاگ جائے۔ کمربستہ ہو کر میدان میں اترے، اور رزم و پیکارِ حیات میں حصہ لے کر زندہ رہنے کا حق حاصل کر لے، کہ یہی اصل مقصود ہے۔

•

آگے چل کر اسی سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

در جہاں خورشید نو زائیدہ ام
رسم و آئینِ فلک نادیدہ ام

میں نے ایک نیا آفتاب پیدا کیا ہے۔ اس کی روشنی ان تاریکیوں کو دُور کر دے گی جو صدیوں کی غلامی، تقلیدِ جامد، اور غلط تربیت کے باعث مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہیں ـــــ میرے کلام کا آفتاب اس تاریکی کو دُور کر دے گا، اور حقیقت اس کی روشنی میں اچھی طرح سے نظر آجائے گی۔

•

من و تو:

انتظارِ صبح خیزاں می کشم!

اے خوشا زرتشتیانِ آتشم!

مجھے انتظار جو کچھ ہے، وہ اس صبح خیز گروہ کا ہے، جو میری آتشِ دل کا زرتشتی ہوگا، جو میرے دل کی آگ کو زرتشتیوں کی طرح پوجے گا اور وہ شعلہ اپنے اندر جذب کر لے گا۔

•

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم!
من نوائے شاعرِ فرداستم!

میں بجائے خود ایک نغمہ ہوں، ایسا نغمہ جو اضطراب کی چوٹ سے بے پروا ہے جو خود بخود فضا میں پیدا ہوتا اور سُننے والوں کے دل میں اتر جاتا ہے۔ میں آج کا شاعر نہیں کل کا شاعر ہوں۔ میں حال نہیں مستقبل ہوں۔ آج لوگ میرے کلام کو، مجھے، میرے پیام کو نہیں سمجھتے لیکن کل وہ وقت آئے گا کہ اُسے سمجھیں گے اور سر دھنیں گے۔

•

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست

میں اپنے زمانہ سے پہلے پیدا ہو گیا۔ میرا یہ عصر میرے اسرار و رموز کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ میرے خیالات صالح کا یوسف اس بازار میں نہیں بک سکتا۔ یہ دوسری چیزوں کے خریدار ہیں۔ یوسف کو کیا خریدیں گے خزف ریزوں پر مٹنے والے، جواہر کی قدر کیا کر سکتے ہیں!

•

ناامیداستم زیارانِ قدیم!
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم!

یارانِ قدیم یعنی اپنے ہم عصروں اور ساتھیوں سے میں ناامید ہوچکا ہوں۔ یہ لوگ نہ میرا مقصد سمجھ سکتے ہیں نہ مدعا میرے فکر و نظر کا طور اپنے کلیم کے انتظار میں ہے اور وہ کلیم بہرحال اسے لے گا۔ میرے کلام کی حقیقت کو سمجھے گا۔ اور دنیا کو ان حقائق سے باخبر اور واقف کردے گا۔ میں اسی کے انتظار میں ہوں۔

•

یارانِ قدیم سے ناامیدی اور مایوسی کی وجہ یہ ہے کہ ان کا سمندر شبنم کی طرح بےخروش ہے۔ ان میں تلاطم نہیں اضطراب نہیں۔ اور میرا یہ حال ہے کہ میری شبنم سمندر کی طرح طوفان بدوش ہے۔ اس میں تلاطم ہے ہلچل ہے اضطراب ہے۔ پھر بھلا یہ مجھے کیا سمجھ سکتے ہیں؟ ——یہی بات اقبال نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

قلزمِ یاراں چو شبنم بے خروش
شبنمِ من مثلِ یم طوفاں بدوش

•

نغمۂ من از جہانِ دیگر است
ایں جرس را کاروانِ دیگر است

میرا نغمہ کسی دوسری دنیا کا ہے، اس دنیا کا نہیں میری صدائے جرس یارانِ قدیم کے لئے نہیں اس کا کارواں کوئی اور ہی ہے۔

•

برق ہا خوابیدہ در جانِ من است
کوہ و صحرا باب جولانِ من است

میری جانِ ناتواں میں بجلیاں پوشیدہ ہیں۔

•

پنجہ کن با بحرم از صحراستی
برقِ من در گیر و گر سیناستی

اگر تو صحرا ہے تو آ، اور میرے سمندر میں شامل ہو جا۔ اگر تو کوہِ سینا ہے تو اٹھ اور میری بجلی کی تجلی قبول کر۔

•

چشمۂ حیوان براکردہ اند!
محرمِ رازِ حیاتم کردہ اند!

چشمۂ حیواں یعنی آبِ حیات میرا حصہ ہے۔ رازِ حیات کا میں محرم ہوں۔

ذرّہ از سوزِ نوایم زندہ گشت
پر کشود و کرمکِ تابندہ گشت

میرے سوزِ نوا سے ذرّہ میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے پرِ پرواز پیدا کئے اور کرمکِ شب تاب بن گیا۔

•

ہیچ کس رازے کہ من گویم نہ گفت
ہم چو فکرِ من درِ معنی نہ سفت

جو راز میں آشکارا کر رہا ہوں یہ اب تک کسی کی زبان پر نہیں آیا جو موتی میں صدف کا سینہ چیر کر تیری بزم میں لایا ہوں۔ وہ آج تک کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔

•

سرِّ عیشِ جاوداں خواہی بیا
ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

اگر عیشِ جاوداں کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے تو میرے پاس آ، زمین اور آسمان پر حکومت کرنا چاہتا ہے، تو میرا پیام سمجھ۔

•

پیرِ گردوں با من ایں اسرار گفت
از ندیماں رازہا نتواں نہفت

یہ اسرار جو میں تجھ پر آشکار کر رہا ہوں میرا لائیدہ فکر نہیں ہے اسے میں نے پیرِ گردوں سے معلوم کیا ہے لیکن تجھے بتلائے دیتا ہوں۔

•

---

(۹۵)

انتظارِ غم گسار

اقبالؔ اپنے محرم خود تھے۔ محرم اسرار اور غم گسار کے انتظار میں انہوں نے عمر گزار دی، مگر کوئی نہ ملا۔ خود ہی ایک موقع پر فرماتے ہیں:

اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں!
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا!

ساری زندگی، انتظارِ غم گسار کرتے رہے، مگر کامیاب نہ ہوئے۔ اپنی ہر کتاب میں انہوں نے اس محرمی پر آنسو بہائے ہیں اور ہر مرتبہ اندازِ بیان وہ اختیار کیا ہے جو سوز و گداز اور درد و اثر کی تصویر ہے اور واقعی اس سے بڑھ کر محرومی کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے دل میں خیالات کا طوفان رکھتا ہو، لیکن کوئی ایسا شخص نہ ملے جس تک یہ راز منتقل کیا جا سکے۔ دل کی بات کہہ لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، لیکن کوئی ایسا نہ ملے جس سے دل کی بات کہی جا سکے، تو آدمی گھٹ گھٹ کر زندگی بسر کرتا ہے، اقبالؔ اس مصیبت میں گرفتار تھے، وہ چپ و راست دیکھتے تھے۔ مگر انہیں کوئی اپنا نہیں ملتا تھا جس سے وہ دردِ دل کہہ سکیں۔

یوں تو اقبالؔ کے ندیم دم نشیں، قدر شناس اور عقیدت مند، دوست اور ہوا خواہ بہت تھے، لیکن بات کو سمجھنے والا، اور مزاج کو جاننے والا اور درد کو محسوس کرنے والا، خدا کی اس وسیع دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اس حسرت و ماتم میں ان کی حیاتِ مستعار ختم ہو گئی مگر غم گسار و رازدار نہ ملنا تھا، نہ ملا کبھی کسی میں کچھ رازداری اور اسرار شناسی کی جھلک نظر آجاتی ہے تو خوش ہو جاتے ہیں۔ اور کہہ اٹھتے ہیں۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

لیکن یہ کیفیت احتراز و تشا طعارضی ہوتی ہے غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم!

پھر آہ بھر کر کے رہ جاتے ہیں، پھر اپنے آپ کو ہجوم میں تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

مثنوی اسرارِ خودی، جہاں ختم ہوتی ہے، خدا سے دعا کرتے ہیں اور بڑی دیر تک مناجات کرتے رہتے ہیں۔ اس دعا اور مناجات میں، سارا دردِ دل کہہ جاتے ہیں جو کچھ دل میں اتنا ہے عرض کرتے جاتے ہیں، خدا سے بڑھ کر رازدار اور غم گسار کون ہو سکتا ہے لہٰذا انتہائی سکونِ قلب اور جمعیتِ خاطر سے اپنا ماجرا اس سے بیان کرتے رہتے ہیں۔

اس دعا کے دو بند ہیں پہلے بند میں وہ اپنی ملت اور قوم کے لئے دستِ سوال دراز کرتے ہیں، اور جو کچھ مانگنا ہے، مانگ لیتے ہیں۔ وہ دولتِ دنیا نہ اپنے لئے مانگتے ہیں، نہ اپنی قوم کے لئے۔ وہ تو عشق و مستی کے طالب ہیں۔ یہی دولت سب سے بڑی دولت ہے۔ اس کی دریوزہ گری، وہ اپنے لئے بھی کرتے ہیں اور اپنی قوم کے لئے، جو محرمِ جذب و شوق ہو چکی ہے، قوم کے لئے، جو دعائیں انھوں نے دل کی گہرائیوں سے مانگی ہیں۔ ایک نمونہ ان کا بھی

ملاحظہ کریجیے:

از مقدر شکوہ ہا داریم ما!
نرخ تو بالا و نہ داریم ما!

ہم مسلمانوں کو اپنے مقدر سے گلہ ہے، تیرا نرخ بالا اور ہم نادار و مفلوک!

از تہی دستاں رُخِ زیبا مپوش
عشقِ سلمانؓ و بلالؓ ارزاں مپوش

ہم جیسے تہی دستوں اور ناداروں سے اپنا رُخِ زیبا نہ چھپا، ہمیں اپنی عنایت اور رحمت سے عشقِ سلمانؓ و بلالؓ مرحمت فرما۔

چشمِ بے خواب و دلِ بے تاب دہ
باز مارا فطرتِ سیماب دہ!

اے خدا!

اپنی بارگاہ سے ہمیں دولتِ دنیا نہ مرحمت فرما۔ ہاں چشمِ بے خواب اور دلِ بیتاب کی نعمت عطا فرما۔ وہ فطرتِ سیماب جو کبھی ہماری سرشت تھی پھر سے ہمیں دے دے۔

پھر اور بہت سی دعائیں مانگنے اور تمناؤں کا اظہار کرنے کی آخری بات کہتے ہیں

رہروان را منزلِ تسلیم بخش
قوّتِ ایمانِ ابراہیم بخش
عشق را از شغلِ لا آگاہ کن!
آشنائے رمزِ ۲ الا ۲ للہ کن!

یعنی بارِ الٰہا، ہمیں منزلِ تسلیم کا راہرو بنا دے، ہمیں وہ ایمان مرحمت فرما جو

ابراہیمؑ کے ایمان سے مشابہ ہو۔

عشق کو ایک مرتبہ پھر شغلِ لا مرحمت فرما تاکہ وہ تیرے سوا ہر ایک سے بیگانہ ہو جائے۔ تیرے سوا ہر قوت کی نفی کر دے۔ تیرے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے۔ وہ آشنائے رمزِ الا اللہ بن جائے۔ ہر چیز میں تیرا جلوہ دیکھے، ہر رنگ میں اسے تو ہی نظر آئے۔

ملت کے لئے یہ سب کچھ مانگ چکنے کے بعد اب وہ اپنا حال بارگاہِ خداوندی میں تڑپ اور خلش اور تپش کے ساتھ عرض کرتے ہیں:

من کہ بہرِ دیگراں سوزم چو شمع!
بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع!

کتنی مدت ہو گئی کہ میں اپنی ملت کے غم میں شمع کی طرح پگھل رہا ہوں، روتا بھی ہوں، رلاتا بھی ہوں، کیونکہ اپنی محفل کے لئے میں نے سامانِ گریہ فراہم کر دیا ہے۔

یارب آں اشکے کہ باشد دل فروز
بے قرار و مضطر و آرام سوز!

یا اللہ!

مجھے وہ آنسو مرحمت فرما جو دل فروز ہو، جس سے دل کی گرہیں کھلیں، جو بے قرار ہو، مضطر ہو، آرام سوز ہو۔

دل بہ دوش و دیدہ بر فرداستم
در میانِ انجمن تنہاستم

حال یہ ہے کہ تنہا نہیں ہوں مگر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں، ہجوم میں گھرا ہوا ہوں، مگر پھر بھی تنہا ہوں۔ کوئی آشنا نہیں، کوئی محرمِ سوز نہیں۔

در جہاں یارب ندیمِ من کجاست؟
نخلِ سینایم کلیمِ من کجاست؟

اے خدا،

اس دنیا میں، میرا کوئی ندیم نہیں ہے! میں، نخلِ سینا ہوں، تجلی کا منتظر ہوں، لیکن کلیم سے محروم ہوں، اے خدا تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے ندیم اور کلیم عطا فرما، تاکہ میں تنہا نہ رہوں۔

ظالم بر خود ستم ہا کردہ ام
شعلۂ را در بغل پروردہ ام

میں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم سے کام لیا ہے۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ عشق کی چنگاری اپنے دامن میں سلگاتا اور پھر فریاد و فغاں کرتا لیکن اب تو یہ آگ بھڑک چکی۔ اب تو یہ عشق شرر سے شعلہ بن چکا ہے۔ اس کا مداوا تو ہی کر سکتا ہے۔ مرے رب اب وہ مداوا عطا کر۔

●

بارِ الٰہا میں، اتنا کچھ عرض کر چکنے کے بعد بھی ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔

ہم چو شبنم دیدۂ گریاں شدم
تا امینِ آتشِ پنہاں شدم

شبنم کے مانند میں دیدۂ گریاں بنا ہوا ہوں۔ آتشِ پنہاں، یعنی سوزِ دروں کی امانت میرے ہی حصّہ میں آئی ہے۔

شمع را سوزِ عیاں آموختم
خود نہاں از چشمِ عالم سوختم

شمع کو تو میں نے سوزِ عیاں دے دیا ہے۔ وہ پگھل رہی ہے اور دنیا اس کا پگھلنا دیکھ رہی ہے۔ خود بھی جل رہا ہوں، لیکن چشمِ عالم سے پنہاں ہو کر۔

شعلہ ہا آخر ز ہر مویم دمید
از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

میرے ہر بُنِ مو سے شعلہ کی لپٹ نکل رہی ہے۔ میری رگِ تخیّل سے شعلے اور انگارے برس رہے ہیں۔

•

پھر ارشاد ہوتا ہے:

سینۂ عصرِ من از دل خالی است
می تپد مجنوں کہ محمل خالی است

میرا زمانہ دل کی نعمت سے محروم ہے۔ مجنوں کے اضطراب کا سبب یہ ہے کہ محمل خالی ہے۔ اب وہ لیلیٰ کی جستجو تلاش کہاں کرے؟ اسے کہاں سے پائے اور دلِ ناصبور کو تسکین و تسلّی دے؟

•

پھر خدا سے عرض کرتے ہیں:

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ یک پروانۂ من اہل نیست

شمع کو پگھلنے اور جلنے میں تکلیف نہیں ہوتی، دکھ اس کا ہوتا ہے کہ وہ تنہا جلتی ہے۔ میں بھی اس شمع کی طرح جل رہا ہوں، جس کے پاس کوئی پروانہ نہیں۔

انتظارِ غم گسارے تا کجا؟
جستجوئے رازدارے تا کجا؟

اے خدا — غم گسار کا انتظار کب تک کرتا رہوں۔ رازدار کی جستجو میں کب تک جان ہلکان کرتا رہوں؟

اے ز رویت ماہ و انجم مستنیر
آتشِ خود را از جانم باز گیر

اے میرے رب — یہ چاند اور تارے تیرے ہی نور سے تو روشن نظر آتے ہیں۔ لیکن میں اس نور سے محروم ہوں — کیوں؟

یا مرا یک ہمدمِ دیرینہ دہ
عشقِ عالم سوز را آئینہ دہ

تو مجھے ایک ہمدم و مونس ارزانی کر جو عشقِ عالم سوز کے لئے آئینہ کا کام دے۔

موج در بحر است ہم پہلوئے موج
ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج

یہ سمندر کی موجیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ تڑپتی ہیں۔ موج کا مزاج بھی تنہا تڑپنا نہیں ہے۔ وہ بھی ایک ساتھی، ایک ندیم، ایک رازدار اور غم گسار کی متلاشی ہے۔

•

اتنی مثالیں دے چکنے کے بعد خدا سے عرض کرتے ہیں:

گرچہ تو در ذاتِ خود یکتا ستی!
عالمے از بہرِ خویش آراستی

اگرچہ تیری ذات یکتا اور بے ہمتا ہے، لیکن تجھے بھی تنہائی پسند نہ آئی اور اپنی تنہائی کو دوئی سے بدلنے کے لئے، تو نے یہ دنیا آراستہ کر دی، لیکن

من مثالِ لالۂ صحرا استم !
درمیانِ محفلِ تنہا استم !

میں لالۂ صحرا کی طرح ہوں جس کی کوئی محفل نہیں ہوتی جس کا کوئی چمن نہیں ہوتا، جو صحرا میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہے۔

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے
از رموزِ فطرتِ من محرمے

تیرے لطف و کرم سے ایک دوست اور ہمدم کا متمنی ہوں، ایسا ہمدم اور محرم، جو میرے اسرارِ فطرت سے واقف ہو۔ اور خیالِ ایں و آں سے یکسر بیگانہ ہو۔ میری ہی طرح وہ بھی عاشق ہو، اور مجنوں ہو۔

تا بہ جانِ او سپارم ہوئے خویش
باز بینم در دلِ او روئے خویش

تاکہ میں اپنا جنون اسے بخش دوں، اور پھر اس کے آئینۂ دل میں اپنا چہرہ دیکھوں۔

سازم از مشتِ گِل خود پیکرش
ہم صنم اورا شوم ہم آذرش

میں اس کی تعمیر، اپنی مشتِ گِل سے کروں گا، میں اس کا صنم بن جاؤں گا۔ وہ میرا آذر، میں اس کے وجود میں اپنے افکار و خیالات کا

پرتو دیکھوں گا، وہ میری مٹی میں، اپنا وجود دیکھے گا۔ پھر ہم دونوں کے
اتحاد و تعاون سے عشق و مستی کی دنیا میں، ایک نیا دور شروع ہو گا۔
پھر میں تنہا نہ رہوں گا۔ میرا جنون میری قوم میں عام ہو جائے گا۔ آج
میری قوم مجھ سے بیگانہ ہے۔ میرے پیام سے غیر ملتفت ہے۔ میری آہ
اور اشک سے ناواقف ہے، پھر یہ صورت باقی نہ رہے گی۔ پھر وہ
میرے غم کی شریک بن جائے گی۔ وہ بھی پھر اس آگ میں جلنے لگے گی۔
جس نے میرا خرمنِ ہستی پھونک کر رکھ دیا ہے۔

●

(۹۶)

بہ حضورِ ملّتِ اسلامیہ

مثنوی رموزِ بیخودی، اقبالؔ کے فلسفہ اور پیام کی رُوح ہے جس نے اسے سمجھ لیا اس نے اقبالؔ کو سمجھ لیا۔ یہ کتاب انھوں نے بڑے ولولہ اور ہمہمہ کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کی خدمت میں پیش کی ہے، اور اپنی ملّت کو مخاطب کر کے انھوں نے آغازِ کلام سے پہلے دو دو باتیں کی ہیں۔ ان باتوں میں اپنا ذکر بھی ہے اور قوم کا بھی، رموزِ بیخودی پر تبصرہ فی الحال ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارے پیشِ نظر تو اقبالؔ ہیں۔ ہم انہی کا تعارف کرا رہے ہیں۔ ان کے کلام سے انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں، لہٰذا ہماری گفتگو اسی حد تک محدود رہے گی، وہ اپنی ملّت سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے ترا حق خاتمِ اقوام کرد!
بر تو ہر آغاز را انجام کرد!

خدائے بزرگ و برتر نے تجھے یہ عزت بخشی ہے کہ تو خاتمِ اقوام ہے تو ہی ہر آغاز کا انجام ہے، تو نبی آخرالزماںؐ کی اُمّت ہے جس طرح محمدؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اسی طرح اُمّتِ اسلامیہ کے بعد کوئی قوم نہیں نمودار ہوگی، یہ آخری قوم ہے، جو تعلیماتِ الٰہی اور ہدایاتِ نبوتؐ کی روشنی میں دنیا کی اصلاح و ہدایت کے لئے بھیجی گئی ہے۔

اے مثالِ انبیا پاکانِ تو!
ہمگر دلہا، جگر چاکانِ تو!

تیرے جگر چاک اپنی ایک نئی شان رکھتے ہیں۔ تیرے پاک اور صالح لوگ دوسری قوموں کے انبیا کے مانند ہیں۔ ان کا کردار ان کی سیرت، ان کا جمال، ان کا جلالِ عمل۔ اسی حقیقتِ ثانیہ کا آئینہ دار اور ترجمان ہے۔

اے نظر بر حسن ترسا زادۂ
اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ

پھر کیا بات ہے کہ تو نے غیر اسلامی اصولوں کو اپنا لیا ہے اور کعبہ کی راہ سے جو تیری اصل منزلِ مقصود ہے، دور جا پڑی ہے؟

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش
تازہ کن با مصطفٰےؐ پیمانِ خویش

تو عشقِ وجدان کی حامل تھی اور جب تک یہ دولت تیرے پاس رہی، تو اقوامِ عالم کی رہنمائی کرتی رہی لیکن اب یہ دولت تجھ سے چھن چکی ہے اسے حاصل کر۔

لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

پھر اپنے اندر عشق کا ولولہ پیدا کر، اور تو نے اپنے پیغمبرؐ سے جو پیمان باندھا تھا اسے پورا کر۔

•

اس ذکر و فکر اور نصیحت و تلقین کے بعد وہ اپنا اور قوم کا تعلق بیان کرتے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ ان میں اور قوم میں کیا ربط و تعلق ہے؟ فرماتے ہیں،

من شہیدِ تیغِ ابروئے توام!

خاکم و آسودۂ کوئے توام!

دوسرے لوگ بادشاہوں اور سلطانوں کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں اپنے محبوب کے خال و رخ کی داستان بیان کرتے ہیں۔ لیکن نہ مجھے بادشاہوں اور سلطانوں سے مطلب ہے نہ میں کسی کو محبوب و مطلوب بناکر پوجتا ہوں، میں تو تیرا گرفتار ہوں۔ تیری تیغِ ابرو کا شہید ہوں۔ تو نے نمودار ہو کر دنیا میں وہ کارنامے دکھلائے ہیں اور فقیر و مفلس دنیا کو وہ نعمتیں دی ہیں جس کی ہر قوم ممنون ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

•

قوم سے اپنا ربط و تعلق بیان کرنے کے بعد اپنی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور قوم کو بتاتے ہیں کہ میں کیا ہوں؟ خاک رہ گزر یا کوہِ گراں؟

سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں
آب خود می گیرم از سنگِ گراں

میں خنجر کی طرح سخت کوش ہوں اپنی روزی سنگِ گراں سے حاصل کر لیتا ہوں کسی کا محتاج نہیں۔

گرچہ بحرم موجِ من بیتاب نیست
بر کفِ من کاسۂ گرداب نیست

اگرچہ میں سمندر ہوں، لیکن میری موج امواج بیتاب نہیں میری لہریں گرداب کی صورت میں کاسۂ گدائی لے کر نمودار نہیں ہوتیں،

در شرر آبادِ ہستی اخگرم
خلعتے بخشد مرا خاکسترم!

شررآباد ہستی میں، میری مثال انگارہ کی سی ہے بیرا خلعت میری خاکستر ہے پھر قوم سے مخاطب ہوتے ہیں،

بردرت جانت نیاز آوردہ است
ہدیۂ سوز و گداز آوردہ است!

اے میری ملت۔ تیرے حضور میں سوز و گداز کا ہدیہ اور تیرے در پر جانِ نیاز مند کا نذرانہ لایا ہوں۔ اسے قبول کرلے۔ اور میرے دل کی تمنا پوری کردے۔

اپنے جذبِ دروں اور سوزِ نہاں کی تصویر کھینچتے ہیں ارشاد ہوتا ہے،

در سکوتِ نیم شب نالاں بدم!
عالم اندر خواب و من گریاں بدم!

آدھی رات کے سناٹے میں، میں اشک کے موتی پروتا ہوں، ساری دنیا محوِ خواب ہوتی ہے اور میں گریاں ہوتا ہوں کیوں؟

از پئے قومے ز خود نا محرمے
خواستم از حق حیاتِ محکمے

اپنی قوم کے لئے، جو اپنی حقیقت اور اپنے رازِ وجود سے نامحرم ہے، میں اس کے لئے بارگاہِ خداوندی میں حیاتِ محکم کا طلب گار ہوں۔

جانم از صبر و سکوں محروم بود
وردِ من یا حیُّ یا قیوم بود

میری زندگی، صبر و سکون سے قوم کے غم میں محروم ہوچکی ہے، میرا ورد اور وظیفہ صرف یہ رہ گیا ہے کہ خدا کے "حیّ و قیوم" سے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا کروں کہ بارِ الٰہا میری قوم کو زندگی و تابندگی

عطا کر، میری قوم کو استقلال و استحکام عطا فرما۔

سوختن چوں لالہ پیہم تا کجا ؟

از سحر دریوزِ شبنم تا کجا ؟

کب تک میں لالہ کی طرح جگر کی طرح جلتا، کڑھتا اور روقعتِ سوز محروم رہوں گا ؟

صبح صادق سے شبنم کی دریوزہ گری کب تک کرتا رہوں گا ؟

اشک خود بر خویش می ریزم چو شمع

با شبِ یلدا درآویزم چو شمع

جس طرح شمع کے آنسو اس پر گرتے ہیں۔ اسی طرح میرے آنسو میرے دامان و گریباں میں نم پیدا کر رہے ہیں جس طرح شمع جل کر پگھل کر رات کی تاریکی کو نور سے بدل دیتی ہے۔ اسی طرح میں بھی اپنی آگ میں جل رہا ہوں اور فکر و نظر کی تاریکیوں کو افکارِ صالح کی روشنی سے دُور کر رہا ہوں۔

عشق را داغے مثالِ لالہ بس

در گریبانش گلِ یک نالہ بس

من ہمیں یک گل بہ دستارت زنم

محشرے بر خوابِ سرشارت زنم

نالہ خاکت لالہ زار آید پدید

از دمت بادِ بہار آید پدید

عشق کے لئے وہ داغ بس ہے جو لالہ کے جگر میں ہوتا ہے۔ یہ پھول اس کے دامن میں خوب سجتا ہے!

میرے پاس بھی یہی داغ، یہی پھول ہے، اور میں اسے تیری دستار میں لگائے دیتا ہوں۔
تیرا خوابِ خرگوش بیداری سے بدل جائے اس لئے آہ و بکا اور فریاد و شیون کرتا رہتا ہوں۔
میری اس جگر کاوی کا مقصد صرف یہ ہے کہ تیری خاک سے لالہ زار پیدا ہو، تیرے
دم سے بادِ بہار آجائے۔

•

متاعِ کارواں

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں!
فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے؟
خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے
رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے
آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا رہی لیلا کے دیوانے رہے
وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

•

(۹۷)

تربیت

اقبالؔ حریتِ نسواں کے بارے میں ذرا محتاط سے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں دیکھنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مادریت اور تہذیبِ جدید نے اس چیز سے بیگانہ بنا دیا ہے۔ اقبالؔ کا خیال ہے انسان کی بہترین تربیت گاہ، آغوشِ مادر ہے۔ وہ مدرسہ و مکتب سے اتنا کچھ حاصل نہیں کر سکتا، جتنا ماں کی گود میں سیکھ لیتا ہے۔ یہ ایسا نقش ہوتا ہے جو زندگی کے کسی دور میں اس سے جُدا نہیں ہوتا بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ یہ اور زیادہ محکم، مستحکم اور مرتسم ہوتا رہتا ہے۔ ارمغانِ حجاز میں فرماتے ہیں:

مرادِ ایں خرد پرور جنونے
نگاہِ مادرِ پاک اندرونے!
ز مکتب چشم و دل نتواں گرفتن
کہ مکتب نیست جز سحر فسونے

٥

یعنی۔ یہ خرد پرور جنوں، جو تم میری ہستی میں دیکھتے ہو، یہ کالج اور یونیورسٹی کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ یہ تو میں نے آغوشِ مادر سے حاصل کیا ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سحر و فسوں کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے؟

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

•

زندگی کی قوتِ پنہاں

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ!
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کردے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

•

(۹۸)

عصرِ جدید

اقبالؔ، تہذیبِ حاضر اور عصرِ جدید کے سخت مخالف ہیں۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی خودی پر انہی دونوں چیزوں نے چھاپہ مارا ہے۔ وہ بار بار اپنی قوم کو، ان دونوں خطروں سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں کہتے ہیں:

جوانان را بد آموز است ایں عصر
شبِ ابلیس را روز است ایں عصر
بہ دامانش مثالِ شعلہ پیچم!
کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

•

یعنی، یہ عصرِ جدید مسلمانوں کے دین و ایمان کے لئے غارت گر ہے۔ یہ انہیں شیری نہیں روباہی سکھاتا ہے۔ انہیں گوسفندی کی تعلیم دیتا ہے۔ ماضی اور حال کے رشتہ کو منقطع کر دیتا ہے۔ سچ پوچھو تو یہ زمانہ مسلمان کے لئے

سازگار نہیں ہے۔ ہاں، ابلیس کی شبِ تاریک کے لئے بے شک یہ نور روز ہے۔

•

اسی عصرِ جدید کے بارے میں ایک اور رباعی:

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد
ضمیرش باقی و فانی بہم کرد!
ولیکن الاماں از عصرِ حاضر
کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد!

یعنی مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں فقر اور سلطانی کو ایک کر دیا تھا۔ ان کا سلطان اسلام کا مردِ فقیر ہوتا تھا۔ وہی مردِ فقیر

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

لیکن ــــ!

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اور دنیا نے دیکھ لیا کہ فقر و سلطانی کی آمیزش نے اس کی تمام بیماریاں دُور کر دیں اور اسے راہِ راست پر گامزن کر دیا۔ لیکن عصرِ حاضر کا کمال یہ ہے کہ اس نے فقر و سلطانی کا مبارک رشتہ تو قطع کر دیا اور اس کے بجائے ایک نئی چیز پیدا کر دی، یعنی سلطانی اور شیطانی میں اتحاد کرا دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانیت چیخ اٹھی، اس کی ہر چیز لوٹ لی گئی۔ اس کے اقدار بدل دیئے گئے۔ دماغ اس سے چھین لیا گیا۔ دل اس کا لوٹ لیا گیا۔

زبان اس کی بند کر دی گئی۔ قلم اس کے ہاتھ میں نہ رہا۔ فکر و خیال تک پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔

•

اسی عصرِ جدید کا ایک اور نقشہ،

چہ عصر است ایں کہ دیں فریادی او ست
ہزاراں بند در آزادی او ست
ز روئے آدمیت رنگ و نم برد
غلط نقشے کہ از بہزادی او ست

•

یعنی یہ کیسا عجیب زمانہ آیا ہے جس میں دین تک محفوظ و مامون نہیں ہے، اس کی چیرہ دستیوں اور عیاریوں سے دین بھی پناہ مانگتا ہے۔ یہ آزادی و جمہوری کا علمبردار ہے۔ ساری دُنیا کو نویدِ آزادی سُناتا ہے لیکن درحقیقت یہ پابندیوں اور ناروا چمن آرائیوں کا دوسرا نام ہے۔

عصرِ جدید کی صورت گری اور نقش بندی اور بہزادیت کا سب سے بڑا شاہکار یہ ہے کہ اس نے جو تصویر بنائی ہے وہ اتنی ہیچ پوچ، مکروہ، اور بدنما ہے کہ آدمیت کے رُخِ انور سے اس کا نور چھین لیا ہے۔ اسے زشت رو اور بھدّا بنا دیا ہے۔ اگر یہی اس کی نفس آرائی ہے تو پھر اس سے خدا کی پناہ ـــــ ! اگر اسے صورت بنانا کہتے ہیں تو پھر بگاڑ؟

کیسے کہیں گے۔ یہ عصرِ جدید ایسا غلط کار ہے کہ اس کی غلط کاریاں افراد ہی کو نہیں جماعتوں کو، قوموں کو، ملتوں کو، اور ملکوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

خونِ جگر

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

●

(۹۹)

پرویزانِ عصر سے خطاب

پرویز و فرہاد:

بگو از من بہ پرویزانِ ایں عصر
نہ فرہادم کہ گیرم تیشہ در دست
زخارے تو خلد در سینۂ من
دلِ صد بے ستوں را می تواں خست

•

یعنی
میری طرف سے، اس دور کے پرویزوں، جابر بادشاہوں، سفاک آمروں اور مخوں آشام مدبّروں) سے کہہ دو کہ میں فرہاد نہیں ہوں کہ ایک غلط مقصد کی خاطر، محض ہوا و ہوس کے لئے تیشہ ہاتھ میں لوں گا اور کوہِ بے ستوں کا جگر کاٹنے کے لئے چل پڑوں گا، میرے سینہ میں جو کانٹا کھٹک رہا ہے ایسی تیز نوک رکھتا ہے کہ اس سے سینکڑوں بے ستون

کٹ سکتے ہیں اور ان کے جگر کے ٹکڑے اڑائے جا سکتے ہیں۔ مردِ مسلمان کبھی بھی مشکلات و موانع سے ہراساں نہیں ہوتا۔ وہ عزم و ہمت کے ساتھ ہر مشکل کا مقابلہ کرتا ہے اور بالآخر اس پر غالب آجاتا ہے کیونکہ وہ ہار ماننا جانتا ہی نہیں۔ وہ صرف لڑتا۔ کشاکش میں حصہ لیتا اور اپنے مقصد بلند پر مرمٹنا جانتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

•

درِ دل:

درِ دل را بہ روئے کس بستم!
نہ از خویشاں نہ از یاراں گسستم!
نشیمن ساختم در سینۂ خویش!
تہ ایں چرخ گرداں خوش نشستم

•

میں اپنے دل کا ماجرا کسی سے نہیں کہتا۔ نہ اپنے دل کا دروازہ ہر کسی کے لئے کھولتا ہوں۔ ویسے دوستوں کا دوست اور خویشوں کا خویش ہوں۔
میں نے اپنے سینہ میں نشیمن بنالیا ہے اور تہہ چرخ گرداں اس نشیمن میں بیٹھ کر بہت خوش ہوں۔

•

گلشن و گلچیں،

دریں گلشن نہ دارم آب و جاہے

نصیبم نے تباۓ نے کلا ہے
مرا گلچیں بد آموزِ چمن خواند
کہ دارم چشمِ نرگس را نگاہے

•

یعنی اس دنیا کے گلشن میں میں، جاہ و جلال نہیں رکھتا۔ نہ میرے نصیب میں کلاہِ شہریاری اور قبائے خسروی آئی ہے، چمن کا مالک مجھے بد آموزِ چمن کہتا ہے۔ لیکن میری خطا کیا ہے؟ یہ کہ میں نے نرگس کو نگاہ عطا کی ہے؟ اسے چشمِ بیدار عطا کر دی ہے۔ اگر یہ میرا گناہ ہے، تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔ غلاموں کو آزادی کا چسکا لگانا۔ محکوموں میں حریت کا جذبہ پیدا کرنا۔ مجبوروں کو قوت و طاقت سے آشنا کرنا، اور اندھوں کو بینا بنانا اور بصیرتِ دینا یقیناً بہت بڑا جرم ہے لیکن اسے کیا کروں کہ اس جرم پر مجھے فخر ہے ندامت نہیں۔

•

مرغِ صبح خواں

نہ پنداری کہ مرغِ صبح خوانم
بجز آہ و فغاں چیزے ندارم
مدہ از دستِ دامانم کہ یابی
کلیدِ باغ را در آشیانم

•

یعنی میرے بارے میں اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میں صرف ایک صبح خوان — شاعر — ہوں، تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میرا سرمایہ صرف آہ و فغاں ہے۔
میرا دامن، اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑ میرے آشیانہ کی کنجی اگر چاہتا ہے تو اسے ہاتھ سے نہ جانے دے کیونکہ میں ہی ایک ایسا آدمی ہوں جو تجھے حقائق و معارف سے آگاہ کر سکتا ہوں اور تیرے فکر و نظر میں انقلاب پیدا کر سکتا ہوں۔

•

بیگانہ تو:

بہ چشم من جہاں جز رہگذر نیست
ہزاراں رہرو و یک ہمسفر نیست
گزشتم از ہجوم خویش و پیوند
کہ از خویشاں کسے بیگانہ نیست

•

یعنی میری نظر میں اس جہانِ رنگ و بو کی حیثیت صرف ایک رہ گزر کی ہے۔ اس راستے میں ہزاروں راہ رو ملتے ہیں لیکن کوئی ہم سفر نہیں ملتا۔ کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس کی منزل بھی وہی ہو جو میری ہے۔ میں ہجوم سے گزرتا ہوں لیکن تنہا رہتا ہوں۔ کیا تجھ سے بڑھ کر بھی اس دنیا میں کوئی اپنوں سے بیگانہ تر ہو گا۔

•

افسوس

چو رختِ خویش بر بستم ازیں سوخت!
ہمہ گفتند با ما آشنا بود!!
ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود!

یعنی میں نے اس دنیا سے جب رختِ سفر باندھا تو، تو سب پکار اٹھے۔ یہ شاعر تو ہمارا آشنا تھا۔ ہم اس کے دوست تھے، لیکن یہ کسی نے نہ سوچا کہ یہ مسافر — شاعر کیا کہتا رہا ہے۔ کس کو اپنا مخاطب بناتا رہا ہے؟ اور آیا کہاں سے تھا؟ باتیں کس عالم کی کرتا تھا؟ افسانہ کون سا سُناتا تھا؟ راستہ کون سا دکھاتا تھا؟ اس کے سینہ میں جو آگ سلگ رہی تھی وہ کیا تھی؟ کیسی تھی۔ یہ چنگاری اس نے کہاں سے لی تھی، اور کس لئے؟

•

پالانِ حریر

اگر دانا دل و صافی ضمیر است!
فقیرے با تہی دستی امیر است!
بہ دوشِ منعمِ بے دین و دانش
قبائے نیست پالانِ حریر است

•

فقیر کا دل اگر دانا ہے، ضمیر صاف ہے۔ نیک نیت ہے بمقاصد

صالح ہیں، تو فقر کے باوجود امیر ہے اسے غریب نہیں کہا جا سکتا۔
منعم اور دولت مند کے کاندھوں پر جو قبائے لالہ گوں اور زر کار و زرنگار نظر آ رہی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے پر ریشم کا چار جامہ کس دیا جائے۔

خود افزائی

تخم گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لئے مجبور ہے

—: ختم شد :—